ورثہ

اور دوسری کہانیاں

رضیہ فصیح احمد

Marfat.com

گہے گریاں، گہے خنداں، گہے حیراں، گہے نالاں
بجز ایں شغلِ یک لحظہ نبودے روزگارِ من

Marfat.com

ورثہ

اور دوسری کہانیاں

رضیہ فصیح احمد

Books Lover's
Library
Book No:

اکادمی بازیافت

Marfat.com

گہے گریاں، گہے خنداں، گہے حیراں، گہے نالاں
بجز ایں شغلِ یک لحظہ نبودے روزگارِ من

ورثہ

اور دوسری کہانیاں

رضیہ فصیح احمد

Books Lover's Library
Book No:

اکادمی بازیافت

Marfat.com

ورثہ

اور دوسری کہانیاں

Wirsa and other Stories

(Short Stories)

By : **Razia Fasih Ahmed**

پہلی اشاعت : مئی ۲۰۰۳ء

ناشر : اکادمی بازیافت

اردو سینٹر، کمرہ نمبر۴ (پہلی منزل) اردو بازار، کراچی۔ فون : ۲۶۳۴۳۳۰

کمپوزنگ : لیزر پلس، اردو بازار، کراچی

قیمت : ۳۰۰/ روپے (پاکستان میں)

۲۰/ امریکی ڈالر (بیرونِ ملک)

جملہ حقوق محفوظ

Marfat.com

دنیا بھر کے اُن ''استادوں'' کے نام جن سے
میں کبھی نہیں ملی مگر جنھوں نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔

ترتیب

میرے افسانے	۹
خاموش چیخیں	۱۱
نیا جنم	۲۲
ہنسی کی بات	۴۷
ورثہ	۶۲
تمغا	۷۵
ایجاد	۸۲
حلقۂ دامِ خیال	۸۹
بیگم جی	۹۵
چپ	۱۰۳
واللہ اعلم بالصواب	۱۱۳
گمان و یقیں	۱۲۰
بونا	۱۲۲

Marfat.com

اُلاّ کا حلال گوشت	۱۳۴
گلی گنوتنا	۱۴۵
ماریے بوم	۱۴۹
نیاگرا فالز	۱۵۷
تقاضا کوئی دن اور	۱۶۴
نوراں جی کا گاؤں	۱۷۳
سچ ہے... سچ ہے	۱۸۴
سوکھتی جھیلیں اور قحط	۱۹۲
میں کون	۱۹۶
افسانچے	۲۰۱
کھوج	۲۳۳

Marfat.com

میرے افسانے

یوں سمجھیے کہ ایک پینٹنگ ہے۔ اس کا ایک بیک گراؤنڈ ہے، اس کے بعد تصویر کا اصل موضوع جو فوکس ہے۔ مصور جتنی محنت اصل موضوع پر کرتا ہے، اتنی محنت پس منظر پر بھی کرتا ہے۔ دونوں میں مطابقت ہونی ضروری ہے۔ اب پوری پینٹنگ دیکھنے والے سے جو کہتی ہے، اصل بات وہ ہوتی ہے۔ چناں چہ میرے افسانوں کا پس منظر، پیش منظر، کہانی اور کردار جو بات آپ تک پہنچاتے ہیں، وہ افسانے کا اصل موضوع و منشا ہوتا ہے۔ میں ''ہم قلم'' میں لکھتی تھی، اس زمانے میں ابنِ انشا نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ آپ کے افسانوں میں ایک ''بات'' ہوتی ہے۔ اور ایک مرتبہ یہ کہ آپ بُرا لکھ نہیں سکتیں، کچھ لوگ اچھا نہیں لکھ سکتے، کچھ برا نہیں لکھ سکتے۔ خیر یہ تو اُن کا حسنِ ظن تھا مگر اس ''بات'' والی بات پر جب میں نے غور کیا تو مجھے خیال آیا کہ شاید وہ فکر کی اس زیریں لہر کا ذکر کر رہے ہوں جو میرے اکثر افسانوں میں ہوتی ہے۔

میرے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''دو پاٹن کے بیچ''، ''بارش کا آخری قطرہ''، ''نقاب پوش'' اور ''کالی برف''... پانچ طویل افسانوں کا مجموعہ ''بے سمت مسافر'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور عنقریب ایک انتخاب بھی آنے والا ہے۔ یہ

Marfat.com

افسانے ''نیا دور''، ''فنون''، ''نقوش''، ''اوراق''، ''لیل و نہار''، ''ہم قلم''، ''اقدار''، ''سیپ''، ''نقش'' اور ''افکار'' وغیرہ میں شائع ہوئے تھے۔

زیرِ نظر کتاب کے افسانے پہلی بار کتابی شکل میں آ رہے ہیں، یہ افسانے بھی اسی طرز کے ہیں، تجربے اور فکر میں کچھ اضافہ ضرور ہوا ہوگا مگر ہر افسانے کی ''بات'' ہر اک تک پہنچے تب ہی تو بات ہے، مثلاً ''ورثہ'' افسانہ جو ہے، اس میں اشارہ ہے کہ جنگ اجتماعی تباہی کے ساتھ انفرادی طور پر لوگوں کے ساتھ کیا کرتی ہے۔ ''نیا جنم'' میں ایک نئی سوچ کہ ممکن ہے آپ کی dimensions سے الگ dimensions رکھنے والی چیزیں بھی شعور رکھتی ہوں۔ ''بونا'' میں مرد اور عورت کی قوتِ برداشت کا تضاد ہے۔ ''میں کون'' میں ایک ایسے شخص کے ہراساں ہونے کا ذکر ہے جو اپنی شناخت غرقِ مئے ناب کر چکا ہے اور افسانچوں میں روزمرہ زندگی کے تجربوں میں چھپے ہوئے اسباق کا اشارہ ہے۔ ''تاج محل'' میں خالص نسائی سوچ ہے۔

امریکا کی زندگی اور وہاں کے کلچر کا اپنے کلچر سے فکری موازنہ آپ کو ''خاموش چیخیں''، ''ہنسی کی بات''، ''چپ''، ''سچ ہے سچ ہے''، ''گلی گنوتا'' اور ''پھلواری'' وغیرہ میں ملے گا۔

آپ ان افسانوں کو پڑھیے اور اس ''بات'' کے بارے میں سوچیے جو ان افسانوں میں کہیں چھپی ہوئی ہے۔

رضیہ فصیح احمد

Marfat.com

خاموش چیخیں

میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا، بھاگو بھاگو۔ یہ تمھارے بس کا روگ نہیں ہے۔ تم تنہا اسے نہیں جھیل سکتیں... تم کم زور ہو اور یہ بڑا جھمیلا ہے۔ میرا دل للکار رہا تھا... بڑا ہو یا چھوٹا اب صرف تم یہاں ہو اور تمھیں ہی جھیلنا ہے اسے۔ سیمیں بی بی، کم زور ہونے کے بہت مواقع آئیں گے۔ گھر میں چوہیا نکل آئے تو ہائے وائے کر لینا، یہ بہادر بننے کا وقت ہے، ایک زندگی کا سوال ہے۔ تم نے اس بچے کی آواز اپنی کانوں سے سنی ہے، اگر وہ بند ہوگئی تو کیا تم زندگی بھر خود کو معاف کر سکو گی۔ دل سے دُو بہ دُو تو ہوتی رہتی تھی مگر ایسا نازک وقت اس سے پہلے نہیں آیا تھا۔

اچھا صرف ایک منٹ، اسے آکسیجن مل جائے اس کے بعد میری ذمہ داری نہیں۔

کبھی کبھی کون کھینچ کر مجھے ایسی جگہ لے جاتا ہے جہاں جانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ دل سے دُو بہ دُو اس بات پر بھی ہوئی تھی کہ میں نے کہا کہ کل سے باقاعدہ چہل قدمی شروع ہوگی کہ آج تو اندھیرا ہو چلا ہے۔ دل نے کہا، بزرگوں نے کہا ہے کہ کل کبھی نہیں آتا۔ میں نے کہا کہ ارادہ مضبوط ہو اور دل میں کھوٹ نہ ہو تو کل ہمیشہ آتا ہے۔ دل نے کہا کہ ارادہ مضبوط ہو اور دل میں کھوٹ نہ ہو تو آدمی کام آج سے شروع

Marfat.com

کرتا ہے نہ کہ کل سے اور چھوٹے موٹے بہانے تلاش نہیں کرتا۔ میں نے کہا چلو آج سے سہی، ابھی اتنی روشنی ہے کہ اپارٹمنٹ کمپلیکس کا ایک چکر لگایا جاسکے۔

بسم اللہ... دل نے خوش ہو کر کہا۔

چلو احتیاطاً پڑوسن سے بھی پوچھ لیں کہ اکثر ساتھ ٹہلنے جانے کا ذکر کرتی ہے

پڑوسن کے اپارٹمنٹ کی گھنٹی بجائی اور ساتھ چلنے کو کہا تو جواب ملا، آج نہیں، آج میرے پاس کمپنی ہے، مطلب یہ کہ کوئی بیٹھا ہے، میں نیچے اتری۔

بادلوں کے ٹکرے شفق کے رنگ میں گھل کر افق پر پھیلتے جا رہے تھے اور اندھیرا انھیں نگلنے کی کوشش میں تھا۔ پارکنگ لاٹ میں گاڑیوں کی تعداد اور بڑھ گئی تھی۔ صبح کے گئے قریب قریب سارے ہی پنچھی گھونسلوں میں آگئے تھے۔ اس وقت کچھ زیادہ ہی سناٹا ہوجاتا تھا۔ بچے کھیل کھال کر گھروں میں چلے جاتے تھے۔ دفتروں سے لوٹ کر آنے والے اور آنے والیاں ٹی وی کے پروگرام اور کھانے کے انتظام میں مشغول ہوجاتے تھے۔

اس کمپلیکس میں کئی عمارتیں تھیں۔ سب کا طرزِ تعمیر ایک تھا۔ آگے سب کے لان تھے، پیچھے کار پارک اور ہر دو عمارتوں کے درمیان ایک بڑا سا ڈمسٹر یا کوڑا گھر جس میں دو عمارتوں کا سارا کوڑا ایک ہفتے تک سمایا رہے۔ ہمارا کمپلیکس آخری تھا، اس لیے حدبندی کے لیے خار دار تار تھے اور اس کے آگے جنگل۔

ہلکی سی آواز، بہت ہلکی، کوڑے گھر کے پاس۔ شاید بلی کی۔ گاؤں ہی تو تھا۔ کھلی ہوئی بلیاں جو شہروں میں نظر نہیں آتیں، یہاں دکھائی دے جاتی تھیں۔ اپنے ملک میں کوڑے کے آس پاس بلی عجوبہ نہیں مگر امریکا میں جہاں ان کو بلور کے برتنوں میں کٹا ہوا قیمہ، وٹامن ملے گوشت اور کھیلنے کے لیے پلاسٹک کے چوہے اور ہڈیاں فراہم کی جاتی ہیں وہ کوڑا گھر میں کیوں جھانکیں۔ یہ سوچتی آگے بڑھی کہ واقعی کوئی آفت کا مارا بلی کا بچہ پھنس گیا ہے تو اس کی مدد کردوں۔ دوسری آواز... می می، بالکل میاؤں بھی نہیں تھی۔ یہ یقین ضرور ہوا کہ آواز ڈمسٹر کے اندر سے آرہی ہے۔ کوٹھڑی برابر ڈمسٹر سے باہر نکالنا

Marfat.com

میرے بس میں بھی ہوگا یا نہیں، یہ بعد کی بات ہے، دیکھ تو لوں۔

ڈمسٹر کے پاس پہنچی تو آواز بند ہوچکی تھی۔ اونچے ڈمسٹر میں اچک کر جھانک کر دیکھا، بلی نہیں تھی۔ دفعتاً نحیف سی آواز پھر آئی۔ یہ وہاں پڑے بڑے بڑے کالے تھیلوں میں سے کسی ایک تھیلے سے آئی تھی۔ تو کیا بلی تھیلے میں بند ہے؟

تب ہی دل میں کہا، بچی کیوں بن رہی ہو، یہ کسی نوزائیدہ بچے کی آواز ہے۔

دوبارہ کان لگا کر سنا، دل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کسی نوزائیدہ بچے کی آواز تھیلے کے اندر سے آ رہی تھی۔ گھٹی، گھٹی، اگر اسے فوراً نہ نکالا گیا تو آکسیجن کی کمی سے مرجائے گا غریب۔ میرے اندر کوئی کہہ رہا تھا، بھاگو بھاگو کس مصیبت میں پڑ رہی ہو۔ اور دل کہہ رہا تھا، ایک زندگی کا سوال ہے۔ بچہ مرگیا تو ساری زندگی خود کو کیا منہ دکھاؤ گی۔

خیالات کی یلغار... بچے کو نکالوں، پولیس کو اطلاع دوں۔ کسی کو مدد کے لیے بلاؤں؟

اندھا دھند نزدیک ترین کمپلیکس اپارٹمنٹ کی طرف بھاگی۔ اندر داخل ہوئی تو اپارٹمنٹ کا اندر جانے والا دروازہ مقفل تھا۔ ڈاک کے ڈبوں پر رہنے والوں کے نام لکھے تھے اور ہر اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولنے کے لیے الگ گھنٹی کا بٹن تھا۔ میں ان اپارٹمنٹس میں کسی کو نہیں جانتی تھی۔ یوں ہی بٹن دبایا اور کسی کے آنے کی امید نہیں ہے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ پھر بھی موہوم سی امید میں جلدی جلدی سارے بٹن دبائے مگر دروازہ نہیں کھلا۔ کچھ دن پہلے لوگ کھول بھی دیتے تھے مگر جب سے ایک شرابی نے یہ وتیرہ اپنایا تھا کہ اپنے اپارٹمنٹ میں جانے کے لیے کسی بھی گھر کا بٹن دبا کر اندر داخل ہوجاتا تھا اور پھر نشے میں جس گھر کو اپنا گھر سمجھتا تھا، وہاں گھنٹیاں بجا کر لوگوں کا ناطقہ بند کردیتا تھا۔ اگر وہ صحیح عمارت میں پہنچ کر صحیح جگہ کی گھنٹی بھی بجاتا تو دروازہ نہ کھلتا کہ اس کی دھرم پتنی نے طلاق کے مقدمے کے ساتھ شوہر سے تحفظ کا پروانہ بھی لے رکھا تھا۔ وہ نیک بخت پولیس کو بلا لیتی اور رات کو پولیس اسٹیشن اس کا ٹھکانا ہوتا۔ چناں چہ اب کوئی دروازہ نہیں کھولتا، یہ بات یاد آتے ہی میں پھر باہر بھاگی۔ دفتر میں تو اس وقت کوئی ہوگا نہیں، گھر سے فون

کروں تو تین منزل چڑھ کر فون کرنے تک اس گھٹی گھٹی آواز پر کیا گزرے گی۔

آخری فیصلہ! بچے کو خود نکالنا، کوئی قانونی اڑچن تو نہ ہوگی، بلا سے ہو۔ کوڑے کے ڈھیر سے پھول سے بچے کو نکال سکو گی، کبھی پہلے یہ کام کیا ہے؟ جس نے ڈالا ہے، اس نے دیکھ لیا تو ٹینٹوا دبا دے گا اور پولیس کہیں یہ نہ کہے کہ تم نے اغوا کیا اور مارا؟

چپ چپ! یہ بولنے کا وقت نہیں، کام کا وقت ہے۔ دیکھو میرے ہاتھ پہلے ہی کانپ رہے ہیں، ہونٹ موٹے ہوگئے ہیں، زبان بھاری ہوگئی ہے، بس اب نہ بولنا۔ اپنے اندر اٹھنے والی آوازوں کو چپ کرنا بھی بڑا کام تھا۔ میں نے تھیلے ٹٹولے۔ آواز پھر بند ہوگئی تھی۔

بھاگو بھاگو، بچہ مر چکا ہے۔

چپ، چپ آواز آ رہی ہے، ہلکی ہوگئی ہے۔

جب تک نکالو گی، مر ہی جائے گا۔

می... می... می... آواز آخری تھیلے سے آ رہی تھی۔ جیسے تیسے کھینچ کر نکالا۔ خاصی بھاری تھا، کمر نے احتجاج کیا۔ مختلف اعضا مختلف اوقات میں احتجاج کرتے رہے۔ کم بخت یہ بھی نہیں دیکھتے کہ ایمرجنسی ہے، باغیانہ ذہنیت لے کر پیدا ہوئے ہیں۔

چاند کی روشنی اتنی ہلکی تھی جیسے کسی ٹارچ کے سیل ختم ہوگئے ہوں اور پیلی روشنی آخری ہچکیاں لے رہی ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے تھیلے میں لگی گرہ کھولنے کی کوشش کی، نہیں کھلتی کم بخت۔ تھیلے کو پھاڑنے کی کوشش کی۔

می... می... جیسے کوئی ہمت بندھا رہا ہو۔ مگر گٹھیا زدہ کلائی اور انگلیاں احتجاج کرنے لگیں۔ مریں کم بخت، میں تو کھول کر دم لوں گی۔ میں پھر گرہ کھولنے لگی۔ اتنی دیر میں نظر آیا کہ تھیلا کئی جگہ سے تھوڑا تھوڑا کٹا ہوا ہے۔ وہاں سے پھاڑنے میں یقیناً آسانی ہوگی۔

اندھیرا اب نیچے اتر آیا تھا۔ شفق کے رنگ اندھیرے میں ڈوب گئے تھے۔ خاردار تار۔ کھمبے اور عمارتوں کے ٹیڑھے میڑھے سائے ماحول کو پُراسرار بنا رہے تھے کہ

Marfat.com

اتنے میں ایک سایہ میری طرف بڑھا۔ میں ڈر کر چیخ مارنے والی تھی کہ آواز آئی۔ ''امی!'' بیٹا میری تلاش میں نکلا تھا۔

''فرمان، جلدی آؤ، ڈمسٹر کے پاس، جلدی۔''

''فرمان بھاگتا ہوا آیا۔ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ؟'' وہی احتجاج، اب بیٹے کی طرف سے۔

''دیکھو، اس تھیلے میں کوئی بچہ ہے، میں اسے نکال رہی ہوں۔''

''خدا کے لیے آپ نہ نکالیے''، جیسے وہ رونے والا ہو۔

''کیوں، کیوں نہ نکالوں؟''

''پولیس کو فون کیجیے۔''

''تم کرو۔ مجھے کوشش کرنے دو، ورنہ وہ مرجائے گا یا تم نکالو تو میں گھر جا کر فون کرتی ہوں۔''

آخری بات سنتے ہی وہ گھر کی طرف بھاگا۔ میں نے چلا کر کہا، ''ایک ٹارچ اور تولیہ لے کر فوراً واپس آؤ۔''

میرے ہاتھ برابر تھیلا پھاڑنے میں مصروف تھے۔ آخر خاصا بڑا سوراخ ہوگیا۔ میں نے جھانک کر دیکھا۔ مڑے تڑے کاغذ، ڈبل روٹی کے ٹکڑے، پھلوں کے چھلکے اور بیج، شیشے کے ٹکڑے اور ایک منا سا بچہ۔ ایک دم سردی سی لگی اور میں سر سے پیر تک کانپنے لگی۔

بیٹا ٹھیک کہتا تھا، نہیں دل ٹھیک کہتا تھا، اب کیا کروں۔ بچے کو اپنے دوپٹے میں لیے میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے نکالتے ہوئے ہاتھوں میں جو چپچپاہٹ محسوس ہوئی وہ بڑی لرزہ خیز تھی۔ بہت دور درخت کی ایک شاخ کے بیچ چاند بندا سا لٹکا ہوا تھا۔ اس چاند کی ہلکی روشنی میں یہ پتا چلنا محال تھا کہ یہ چپچپاہٹ پیدائش کے خون کی تھی یا شیشے کے ٹکڑوں نے بچے کے بدن پر زخم ڈال دیے تھے۔

میرے جسم کی گرمی اسے بھلی لگی یا کیا کہ وہ خاموش ہوگیا اور ساکن بھی۔

Marfat.com

اوپر کھڑکی سے روشنی کی رمق آئی۔ کسی کو باتوں کی آواز سے کچھ شبہ ہوا یا شاید کوئی میری طرح کھڑکی سے جھانکنے کا شوقین تھا...

کراچی میں اپنی کھڑکی سے جو منظر میں نے کئی سال پہلے دیکھا تھا جیسے وہ سامنے آ کھڑا ہوا۔ صبح کا وقت تھا یوں ہی موسم کا اندازہ کرنے کھڑکی سے جھانک رہی تھی تو میں نے دیکھا کہ تھوڑے فاصلے پر کوڑے کے ڈھیر کے پاس کچھ بچے کھڑے ہنگامہ کر رہے ہیں۔ یکایک دو چار بچے چلائے۔ ملا جی، ملا جی! یہاں آن کر دیکھیے ایک بچہ پڑا ہے۔

ملا جی فجر کی نماز سے لوٹتے ہوئے کوئی وظیفہ پڑھ رہے تھے، دم بھر کو رکے اور کہا، مار ڈالو حرام زادے کو۔

بچوں نے ملا جی کی بات کو حکم سمجھا اور اس بچے پر پتھر برسانا شروع کر دیے۔ میں اوپر سے چلا کر منع کرنے لگی مگر اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ تب میں گرتی پڑتی زینہ اتر کر نیچے بھاگی مگر جب تک وہ ننھا پھول سا بچہ ختم ہو چکا تھا۔ رفتہ رفتہ مردوں اور لڑکوں کی بھیڑ لگ گئی، کچھ عورتیں گھروں کے دروازوں سے جھانک کر صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک بڑے میاں نے پہلے مجھے غور سے دیکھا پھر نہایت خفگی سے بولے۔ بی بی! آپ کا یہاں کیا کام ہے، آپ گھر جائیے۔

میں اوپر سے آن کر دیکھتی رہی، بچہ وہیں پڑا تھا، بھیڑ بڑھ رہی تھی، لوگ ایک دوسرے کو احکامات دے رہے تھے۔

پولیس اب تک نہیں آئی، تم جاؤ میاں، جا کر دوبارہ کہو۔

قبلہ آپ ذرا اپنے گھر سے فون کر دیں۔

ارے سامنے والی دکان پر چلے جاؤ، وہاں پے فون ہے۔ کوئی سن رہا تھا، کوئی نہیں سن رہا تھا اور میں کھڑکی میں کھڑی کانپ رہی تھی۔ یااللہ، ایک انسانی جان کی یہ قدر! اور اسے مارنے کے بعد یہ فضیحتہ۔

فرمان اب تک نہیں لوٹا تھا۔ ماؤں کی رکھی ہوئی چیزیں ویسے بھی بچوں کو آسانی

Marfat.com

سے نہیں ملتیں۔ میرے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی، لگتا تھا درخت صورتِ حال معلوم کرنے کئی قدم نزدیک کھسک آئے ہیں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے میں اپنے جسم سے الگ کھڑی، اس ہیولے کو دیکھ رہی ہوں جو نیم تاریکی میں چھوٹی سی گٹھڑی کلیجے سے لگائے ہولے ہولے کانپ رہا ہے۔

جیسے ہی فرمان ٹارچ اور تولیہ لے کر آیا سڑک پر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتی ایمبولینس کی آواز سنی اور پھر ایمبولینس، فائر انجن اور پولیس کی گاڑیاں اندر آ کھڑی ہوئیں۔ میری جان میں جان آئی۔ بچے کو ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر ایمبولینس میں ڈال کر لے گئے، آگ بجھانے والا انجن بھی چلا گیا۔ پولیس والوں نے میرا بیان لکھا، جائے وقوع کی تصویریں لیں۔ وہ کوڑے گھر کی حد بندی کر رہے تھے، جب ہم ماں بیٹے ان سے اجازت لے کر گھر واپس آئے۔

گھر کی تین سیڑھیاں چڑھ کر سرخ پتھر پر فرمان دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے چہرے سے ایک ہاتھ اٹھا کر اپنے ہاتھ میں لیا تو یوں لگا جیسے پگھلتا برف کا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا ہو۔ اس کے چہرے کی پیلاہٹ پورے چاند نما ہنڈے کی روشنی میں اور نمایاں ہوگئی تھی۔ خاردار تار پار جنگل میں کسی بھٹکے ہوئے جگنو کی روشنی جلتی اور بجھ جاتی امیدوں کی طرح ٹمٹما کر بجھ بجھ جاتی تھی۔

میرے بہت کہنے پر بھی بیٹا نہیں اٹھا بلکہ ایسی رُکھائی سے جس سے وہ آج تک مجھ سے نہیں بولا تھا، کہا، خدا کے لیے آپ اندر جائیے اور مجھے اکیلا چھوڑ دیجیے۔

تب ہی ایک خیال میرے ذہن میں کوندا۔ اس پڑوسن نے جو میرے ساتھ ٹہلنے نہیں گئی تھی، مجھے بتایا تھا کہ جب تمھارا بیٹا یہاں اکیلا رہتا تھا تو ایک امریکن لڑکی اکثر اس کے ساتھ نظر آتی تھی۔ اس کمپلیکس کی عمارت کا ہر پہلا گھر ایک بیڈ روم کا تھا جس میں اس کمپلیکس کے ملازمین یا کالج یونی ورسٹی کے لڑکے لڑکیاں رہتے تھے۔ وہ بھی ایسے ہی کسی اپارٹمنٹ میں تھی مگر اب بہت دنوں سے نظر نہیں آئی۔ ایک مرتبہ کسی اسٹور میں ملی تو وہ ماں بننے والی تھی۔ میں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی کہ ممکن ہے

Marfat.com

اس کی کوئی کلاس فیلو ہو۔ ماں بننا یہاں کوئی عجوبہ تو ہے نہیں۔ میں تو جب اس گھر میں آئی تھی، میں نے کسی لڑکی کو اس کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چھپاتا۔ اس نے خود مجھے اس گھر میں بلایا تھا کہ وہ ہاسٹل میں رہنا چاہتا تھا، اتنی دور سے آنے جانے میں اس کا وقت خراب ہوتا تھا۔ ہر ہفتے وہ مجھ سے ملنے آتا تھا، میں ہفتے بھر کا کھانا پکا کر ساتھ کر دیتی تھی، وہ بھی خوش، میں بھی خوش۔

اپنے گھر میں جانے سے پہلے میں نے پڑوسن کی گھنٹی بجائی۔ پڑوسن نے دروازہ کھولا۔ ایک گنجا موٹا سا مرد سامنے بیٹھا نظر آ رہا تھا۔ پڑوسن بھی بجی سجائی تھی۔ بال جو عام حالات میں خاصے پراگند رہتے تھے، سنورے ہوئے تھے۔ شاید وہ کیں باہر کھانا کھانے اور پھر کھل کھیلنے کا پروگرام بنائے ہوئے تھے۔ میں نے دخل درمعقولات کی معافی مانگی اور پوچھا، اس لڑکی کا نام کیا ہے جس کے ساتھ میرے بیٹے کی دوستی تھی۔

مجھے نہیں معلوم۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ ان کی دوستی تھی یا صرف جان پہچان تھی۔ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کرلیا۔ میں ضرور مخل ہوئی تھی، اس کا روکھاپن صاف بتا رہا تھا۔

وہ رات عجب قیامت کی رات تھی۔ کسی طرح نیند نہیں آ رہی تھی، رہ رہ کر خیال آتا تھا، جاؤں بیٹے سے کچھ پوچھوں۔ کیا پوچھوں؟ اب تو دل بھی دم سادھے پڑا تھا، کچھ نہ بولتا تھا... رات بھر سوتی جاگتی رہی۔ طرح طرح کے بُرے خواب دیکھتی رہی۔ رات بھر گھر کے سامنے لگا برچ کا درخت ٹیرس کے جنگلے پر ہاتھ مارتا رہا اور میں چونک چونک کر اٹھتی رہی، ایک مرتبہ آنکھ کھلی تو بے چین ہوکر اٹھی، بیٹے کے دروازے تک گئی۔ یوں لگا جیسے اندر کوئی سسکیاں لے رہا ہو۔

نہیں شاید پنکھا چل رہا ہے۔

پھر میں نے کچھ نہیں سوچا نہ دل کو بولنے کی مہلت دی۔ برائے نام دروازہ کھٹکھٹا کر جھٹ اندر داخل ہوگئی، بجلی کا بٹن دبایا کہ میں اسے اور وہ مجھے دیکھ لے۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاگ رہا ہے، مگر وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور آنکھیں ملیں۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ

Marfat.com

سو رہا تھا مگر اب واپسی کی کشتیاں جل چکی تھیں۔

''کیا بات ہے امی؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک بات میرے ذہن پر سوار ہے، تم سے پوچھنا چاہ رہی تھی۔''

''رات کے دو بجے؟'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اور جب تک یہ بات صاف نہیں ہوگی، مجھے نیند نہیں آئے گی، تم میری عادت جانتے ہو۔ اس لیے یہ بات ابھی پوچھنا چاہتی ہوں۔''

وہ چپ رہا۔ میں انتظار کرتی رہی کہ کہے، ''پوچھیے''، مگر وہ کچھ نہ بولا۔

بغیر کسی تیاری کے میرے منہ سے نکلا، ''کیا وہ تمھارا بچہ تھا؟''

فرمان کا منہ کھلا اور کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہونا شروع ہوا، دیکھتے دیکھتے گلنار ہوگیا اور کان جیسے جلتے انگارے۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ڈر رہی تھی کہ مجھے تو سچ جواب سننا تھا... میں نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا... بہ یک وقت غصہ، رحم، بے اعتباری اور دکھ... رنج کی وہ پرچھائیاں جنھیں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پھر وہ رونے لگا۔ میری گود میں سر ڈال کر کہنے لگا، ''آپ مجھے اتنا بُرا سمجھ سکتی ہیں، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

نہیں معلوم کیوں میں سر سے پیر تک کانپی۔

میں نے کہا، ''بیٹا معاف کرنا، کل اس بچے کو دیکھ کر تمھاری جو کیفیت تھی، تو جانے کیوں خیال آیا کہ...''

''مجھے یہی خیال آتا رہا، کہیں وہ مر نہ گیا ہو... کیا وہ زندہ تھا امی؟''

''میں یقین سے نہیں کہہ سکتی، دعا تو یہی کر رہی ہوں مگر یہ میرے سوال کا جواب تو نہیں۔''

''میں یہ بھی سوچتا رہا کہ... کہ وہ میرا بھی ہوسکتا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''ڈیڑھ سال ہوا، آپ کے آنے سے پہلے میں نے ایک امریکن لڑکی سے

شادی کرلی تھی۔ میں اسے بتاتا رہتا تھا کہ ابا کے انتقال کے بعد آپ نے کتنی مشکلوں سے میری پرورش کی ہے، میری خواہش پر مجھے پڑھنے امریکا تک بھیجا ہے۔ میں کسی طرح آپ کو ناخوش نہیں کرسکتا۔ میں نے اسے یہ بھی بتایا، آپ ایمان کی حد تک یقین رکھتی ہیں کہ اگر میں نے کسی امریکن لڑکی سے شادی کی تو مجھے کھو دیں گی۔ اس لیے ابھی میں اُنھیں نہیں بتا سکتا اور نہ تعلیم کے دوران بچے کا بار اٹھا سکتا ہوں۔ جب میں نے کئی بار اس سے ابارشن کرالینے کی بات کی تو وہ ناراض ہوگئی، اب چھ مہینے کے بچے کو وہ اکیلی پال رہی ہے۔ مجھ سے بات تک نہیں کرتی۔ مگر میں اپنے بیٹے کو دیکھ آتا ہوں، امی وہ اتنا پیارا ہے کہ کیا بتاؤں...کل اس بچے کو دیکھ کر خیال آیا کہ وہ میری بات مان لیتی تو میرا بیٹا بھی اسپتال کے کوڑا گھر کی نذر ہوجاتا۔'' وہ سسکیاں لینے لگا۔ میں بھی رونے لگی۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اس کا سر تکیے پر رکھ کر کہا، ''تم سو جاؤ، میں بھی اب تھوڑی دیر لیٹوں گی۔''

وہ میری طرف دیکھتا رہا۔ جب بچہ تھا تو ایسی ہی امید بھری نظروں سے دیکھتا تھا کہ میں اسے دوسری ٹافی دوں گی یا نہیں۔ میں اٹھ کر جانے لگی تو بولا، ''امی کیا کل ہم جمی اور اس کی ماں کو یہاں لے آئیں۔ اس کی آنکھوں میں امید کے چراغ روشن تھے۔

''نہیں''، میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں کے چراغ بُری طرح ٹمٹمانے لگے۔

میں دروازہ اور روشنی بند کرکے ٹیرس پر چلی آئی۔ ٹیرس کی لکڑی کا فرش اور جنگلا تر تھا، جیسے رات روتی رہی ہو۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ کوڑا گھر کے چہار طرف لگا زرد ٹیپ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ میرے ذہن میں می می کی آواز ابھری، پھر دو معصوم بچوں کی خاموش چیخیں جیسے میرے سینے میں سلاخوں کی طرح گڑ گئیں۔ مجھے اس بہادر لڑکی کا خیال آیا جو میرے بیٹے کے بیٹے کو اس محبت سے اکیلی پال رہی تھی۔ اگر وہ مجھے چھوڑ بھی دے، میں اسے نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

میں فوراً یہ بات فرمان کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے میں اسے

Marfat.com

تھوڑی سی سزا دینا چاہتی تھی۔

لیکن یہ تو سوچو اتنی بڑی قربانی اس نے صرف تمھاری خاطر کی، صرف تمھاری خوشی کی خاطر کی، صرف تمھاری خوشی کی خاطر۔ دل پھر بدلنے لگا۔

مجھ سے بھی صبر نہیں ہوا۔ میں دوبارہ اس کے کمرے میں گئی، دروازہ کھولا اور کہا، ''سنو فرمان! جب تک میں اپنے پوتے کے لیے نرسری نہ بنالوں اور بہو کو دُلہن بنا کر لانے کا انتظام نہ کرلوں، اسے کیسے لاسکتی ہوں!''

Marfat.com

نیا جنم

''آپ کی انگوٹھی بہت خوب صورت ہے...'' بات اس طرح شروع ہوئی... بات عموماً اسی طرح شروع ہوتی ہے۔ کسی نہ کسی چیز کی تعریف سے، اگر بڑھانی ہو...شیرن نے اپنے موم جیسے ہاتھ کی گاؤ دُم انگلیوں کو برابر کر کے خود بھی ایک بار انگوٹھی کو دیکھا۔ درمیان میں فیروزہ، چاروں طرف سفید موتی، سونے کی زردی میں نو دولتیوں کی سی دمک نہیں، خاندانی زنگیاہٹ تھی۔

''میرے میاں کا دیا ہوا تحفہ ہے۔ اُن کے خاندان میں صدیوں سے چلی آ رہی تھی...'' اس نے آہستہ سے کہا اور ٹوسٹ کو نفاست سے پکڑ کر سامنے کے دانتوں سے خوب صورتی سے کاٹا۔

''نظر آ رہی ہے...'' مائک نے کہا اور کافی کی پیالی منہ سے لگائی۔

''جم نے مجھے شادی سے پہلے ہی دے دی تھی...'' شیرن ہنسی۔

''ظاہر ہے...'' مائک کہنے والا تھا، مگر ٹھٹک گیا۔

شیرن نے اپنی بات جاری رکھی... جب اسے معلوم ہوا کہ جب لڑکی دلہن بنتی ہے تو وہ کوئی چیز نئی ضرور پہنتی ہے اور کوئی چیز پرانی۔ کوئی چیز سنہری اور کوئی چیز نیلی۔

Something old and something new
Something borrown and something blue

تو اس نے کہا کہ پرانی چیزوں میں تم یہ انگوٹھی پہن لو۔ آپ نے جان لی مگر بہت کم لوگ اس کی قدر و قیمت پہنچانتے ہیں۔''

''اس لیے...'' مائک نے اپنی انگلی کی انگوٹھی دکھائی، ''کہ میری بیوی نے خود صدیوں پرانی، بقول اُس کے نادرِ روزگار انگوٹھی مجھے دی ہے اور وہ بھی شادی کی...''

''اچھا!...'' شیرن نے اچھا کو خوب سا کھینچا... ''آپ کی بیوی عام عورتوں سے ذرا مختلف معلوم ہوتی ہیں...''

''بہت۔'' مائک نے بہت کی 'ہ' کو جہاں تک ہوسکتا تھا، طویل کیا، پھر دُہرایا... ''بہت مختلف...''

اولڈ فیتھ فُل سرائے کے طعام خانے کی ساری میزیں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ آٹھ آٹھ، دس دس افراد پر مشتمل میکسی کن خاندان، ہندوستانی، پاکستانی پھر اسرائیل سے آنے والے بزرگ افراد کا گروپ اور جانے کہاں کہاں کے لوگ ناشتے پر بہ یک وقت ٹوٹ پڑے تھے۔ شیرن ایک چھوٹی سی امریکن فیملی سے اجازت لے کر ان کی میز پر بیٹھ گئی۔ مائک نیچے آیا اور میزوں پر نگاہ ڈالی تو کہیں ایک کرسی بھی خالی نہ تھی۔ خوش قسمتی سے شیرن کے پاس بیٹھی فیملی اسی وقت ناشتا ختم کر کے اٹھی۔

''میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟'' مائک نے شیرن سے اخلاقاً پوچھا۔

''شیور...'' شیرن نے خوش دلی سے کہا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

پوری میز پر ایک شخص کا بیٹھے رہنا یوں بھی ممکن نہ تھا، کوئی نہ کوئی آن ہی دھمکتا... تو پھر یہ جوان، ہینڈسم ہم وطن، ہم نسل شخص ہی کیوں نہ سہی... شیرن نے خود کو تسلی دی۔

ناشتے کی آمد تک دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے۔ مائک اپنے ساتھ لایا ہوا اخبار پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ شیرن بلیو اسٹون پارک کے بروشر میں اولڈ فیتھ فُل گرم پانی

Marfat.com

کے چشمے کی تفصیلات اچنبھے سے پڑھتی رہی۔ آج صبح ناشتے سے پہلے ہی وہ اس چشمے کو عین وقت پر نکلتے اور بند ہوتے دیکھ آئی تھی۔ مائک کچھ بے چین تھا۔ اخبار میں اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ دو جوان خوش شکل اور خوش گو لوگوں کا ایک میز پر یوں خاموش بیٹھے رہنا کچھ مناسب نہیں تھا... یہ سوچ کر مائک نے بات شروع کی۔ تیر نشانے پر لگا... بات چل نکلی۔ اولڈ فیتھ فُل چشمے سے لے کر اولڈ فیتھ فُل کی عمارت اور پھر موسم اور پھر آس پاس کی قابلِ دید جگہوں سے ہوتی اچانک مائک کی بیوی تک آئی یعنی شیرن نے خلافِ امید ایک خاصا ذاتی سا سوال کر ڈالا:

''آپ کی بیگم دوسروں سے مختلف ہیں تو کیا آپ کی شادی میں بھی کوئی جدت ہوئی؟''

مائک نے کھانے سے ہاتھ روک کر شیرن کو غور سے دیکھا، پھر ہنس پڑا... نہیں خیر اب اتنا ذاتی بھی نہیں ہے، سوال... اس نے سوچا... ''جی ہاں...'' مائک نے لہجے کو ہلکا پھلکا رکھا... ''شادی کے قول و قرار ہم نے خود بنائے، ظاہر ہے کہ کوئی فرق میاں بیوی کی قسما قسمی میں نہیں تھا۔ بیوی نے انگوٹھی پہناتے ہوئے کہا، ''قدیم زمانے میں ابد کو بطور علامت اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ سانپ اپنی دم منھ میں پکڑے ہوئے ہے۔ انگوٹھی کا یہ دائرہ بھی ہمارے ابدی عشق کی علامت ہے۔''

''سبحان اللہ... واہ وا...'' شیرن دھیمی سریلی ہنسی ہنس دی۔ ''یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کی بیوی شاعرہ ہیں یا فلاسفر؟''

''دونوں...'' مائک نے خوش دلی سے بتیسی نکالی۔ ''اصل میں وہ لیکھک ہیں، لکھنے والے شاعر بھی ہو سکتے ہیں، فلاسفر بھی اور جانے کیا کیا کچھ...''

''اچھی گرہستن...؟'' شیرن نے اپنی گہری نیلی آنکھیں اٹھا کر سیدھا مائک کی آنکھوں میں دیکھا۔

وہ گھبرا گیا... واقعی بلا کی کریدن خاتون ہیں یہ بھی... ''ہاں... نہیں، نہیں، گرہستن ورستن خاک بھی نہیں... اب ایک آدمی کیا کیا ہو...'' وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔

Marfat.com

''واقعی ایک آدمی کیا کیا ہو!...'' شیرن نے دُہرایا۔ ''آپ کو بیوی کی طرف سے عذر داری کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں سمجھتی ہوں۔''

''میں تو عذر داری نہیں کر رہا...'' مائک نے اور بھی خفیف ہو کر کہا۔

''چلیے چھوڑیے کوئی اور بات کرتے ہیں...'' شیرن نے کافی کی پیالی میز پر رکھی۔

''مثلاً؟...'' مائک نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مثلاً یہ کہ ہم اور آپ دونوں شادی شدہ ہیں اور بلیو اسٹون پارک میں دونوں تنہا ہیں۔ یہ بات عجیب نہیں ہے؟''

''ہاں عجیب ہوسکتی ہے...'' مائک نے کہا، ''مگر ناقابلِ یقین نہیں... میری بیوی تو کل یہاں میرے ساتھ ہوگی... آج اس کی کمپنی میں اچانک کوئی کام نکل آیا...''

''اوہ... ہمارے میاں صاحب نزدیک شہر میں تین دن کی کانفرنس میں آرہے تھے۔ میں نے بھی چھٹی لے لی کہ واپسی میں دونوں پارک کی سیر کرتے ہوئے آئیں گے۔ جہاز کی بکنگ بھی ہوگئی۔ تب اچانک میاں صاحب کی میٹنگ کی جگہ کسی مجبوری کے تحت بدل گئی۔ وہ نئی جگہ سدھارے۔ مجھ سے اصرار کیا کہ تم ضرور ہو آؤ، میں تو پہلے بھی دیکھ چکا ہوں، تو میں آگئی... مگر آج ہی واپس جا رہی ہوں۔''

''صرف ایک رات ٹھہریں؟'' مائک نے پوچھا۔

''نہیں، کل سارا دن بھی یہیں تھی...''

''آپ نے سب کچھ دیکھ لیا؟...''

''یہ کتاب کہتی ہے...'' شیرن نے میز پر رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ ''کہ بلیو اسٹون پارک تقریباً ساڑھے تین ہزار مربع میل پر پھیلا ہوا ہے جس میں دس ہزار سے زیادہ تھرمل فیچر ہیں۔ اولڈ فیتھ فُل تقریباً ایک گھنٹے بعد نکلتا ہے تو ایسے بھی ہیں جو پچّیس تیس منٹ بعد نکلتے ہیں اور ایسے بھی ہیں جو سال میں صرف چند بار نکلتے ہیں۔ اب ایک آدمی کیا کیا دیکھے... یا تو ہفتوں آن کر یہاں پڑا رہے...''

''میرا بھی یہی خیال ہے، آن کر ہفتے دو ہفتے رہا جائے تب بات بنے...آپ نے اوپر نیچے کے آبشار اور میمتھ تو دیکھ ہی لیا ہوگا؟''

''نہیں...مگر یہ میمتھ ہے کیا بلا؟'' شیرن نے ہنس کر کہا۔

''ایسی جگہ ہے کہ آپ دیکھے بنا چلی گئیں تو گویا یہاں آنا بے کار گیا۔ آپ کے شوہر بھی حیران ہوں گے کہ آپ میمتھ دیکھے بغیر آ کیسے گئیں۔ اس وقت آپ مایوس ہوں گی، پچھتائیں گی۔ اس لیے چلی چلیے...''

''واہ، اچھی زبردستی ہے...'' شیرن نے بھنویں اٹھا کر کہا۔

''نہیں، ایک تنہا دل کی پکار...'' مائک نے زبردست اداس چہرہ بنایا پھر ہنس دیا...''آپ نے دیکھا کیا یہاں؟''

''اولڈ فیتھ فل...'' شیرن نے کہا۔

''صرف بوڑھا وفادار گیزر...'' مائک چلایا جیسے ابھی سر پیٹ لے گا۔''ارے آپ نے ڈیولز ٹاور نہیں دیکھا۔ شیطانی مینار دیکھنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ لوئر فالز نہیں دیکھے جو نیاگرا سے دوگنی اونچائی سے گرتے ہیں۔ یہاں کی کینین نہیں دیکھی جو ساڑھے پندرہ فٹ گہری ہے اور مشجر درخت نہیں دیکھا تو پھر کیا دیکھا...میری بیوی نے کہا تھا کہ یہ سب چیزیں دیکھنی ہیں۔ اب اگرچہ وہ موجود نہیں پھر بھی میں ایک اچھے شوہر کی طرح سب چیزیں دیکھوں گا۔''

''آپ کی بیوی تو کل آجائیں گی...'' شیرن نے کہا۔

''مگر آج تو غارت ہوگی...کاش کوئی اچھا ساتھی مل جاتا تو کم از کم میمتھ...'' مائک نے لمحہ بھر کو اس کی گہری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی اور کافی کا آخری گھونٹ پینے کو پیالی منہ سے لگائی۔

''دعا مانگتے رہیے اور یہیں بیٹھے رہیے۔ شاید کوئی اچھا ساتھی مل جائے۔'' شیرن شرارت سے ہنسی...''میں چلوں پیکنگ کرلوں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''اوہ...اتنے سے دن کے لیے کتنا سامان لے کر آئی ہیں آپ؟'' مائک بھی

Marfat.com

کھڑا ہو گیا۔

"سامان وامان کیا!" شیرن نے شرما کر کہا، "میری عادت ہے، چیزیں بکھیر دیتی ہوں۔"

"اچھا... چلیے میں سنگوا دیتا ہوں..." مائک نے کہا۔

"نہیں... نہیں، پلیز آپ بیٹھیں..." شیرن ایک دم گھبرا گئی۔

"ایک شرط پر..."

"وہ کیا؟"

"کہ آپ دس منٹ میں واپس آئیں اور میرے ساتھ چلیں، میری گاڑی موجود ہے۔"

"نہیں، کچھ مناسب نہیں..." شیرن نے کہا۔

"ایسی بھی کیا نامناسب بات ہے۔ دن کی روشنی میں دو بالغ شخص سیر کے لیے ساتھ جا سکتے ہیں... کوئی اور بات ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔"

"کوئی اور بات کیا؟" شیرن نے کریدا۔

"خطرناک کشش یا ایسی ہی کوئی چیز..." وہ مسکراتے ہوئے زمین کو تکتا رہا۔

"اخاہ..." شیرن ہنسی۔ "بڑی خوش فہمی ہے آپ کو!"

"ہے تو سہی..." مائک نے انگلی میں انگوٹھی گھماتے ہوئے کہا۔

"آپ کی شادی کو کتنے دن ہوئے؟" شیرن نے پوچھا۔

"یہی کوئی دس ماہ..." مائک نے کہا... "اور آپ کی؟"

"لگ بھگ اتنے ہی..." شیرن نے کہا۔

"اوہ!" مائک کے منھ سے بے اختیار نکلا اور دونوں ہنس پڑے۔

"تو ہم تقریباً نئے شادی شدہ ہیں..." مائک نے کہا۔

"معلوم نہیں، آدمی کب تک نیا شادی شدہ ہوتا ہے؟" شیرن مسکرائی۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں، کسی تجربہ کار آدمی سے پوچھنے کی بات ہے۔" مائک

نے کہا... ''شاید یہی معاملہ ہمیں ایک دوسرے کی طرف کھینچ رہا ہے... یا ہماری انگوٹھیاں۔''

''کیا مطلب؟'' شیرن نے سنجیدگی پکڑی۔

''میرا مطلب ہے... میری بیوی کچھ اس قسم کی بات کرتی ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے کچھ لوگوں میں ایسی ہی کشش ہوتی ہے جیسی مقناطیس اور لوہے میں... اور بعض بے جان چیزیں بھی، یعنی جنھیں ہم بے جان کہتے ہیں، وہ بھی ایک دوسرے کو پسند کرتی ہیں۔''

''آپ دونوں کا جوڑا یقیناً مزے دار ہوگا۔'' شیرن نے کہا، ''اب میں چلی۔''

''میں پندرہ منٹ تک انتظار کروں گا۔'' مائک نے کہا۔

بارہ منٹ بعد شیرن آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے، کندھے پر اپنا پرس اور گلے میں کیمرہ لٹکائے Inn کی سیڑھیاں اتر رہی تھی... مائک نیچے کھڑا منتظر تھا۔ جیسے ہی وہ نزدیک پہنچی، دونوں نے بغیر ایک لفظ کہے دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''ان گڑھ لکڑیوں سے بنی یہ سرائے واقعی بہت خوب صورت ہے۔'' باہر نکل کر شیرن نے کہا۔

''ہاں... اندر سے بھی، باہر سے بھی، جنگل اور چشموں کی اس سیٹنگ میں نہایت مناسب...'' سامنے پہاڑوں پر ایستادہ اونچے درخت سورج کے لیے آڑ بنے ہوئے تھے۔

''تمھیں معلوم ہے کہ میں تمھارے ساتھ جانے پر کیسے راضی ہوگئی؟'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد شیرن نے پوچھا۔

''نہیں، کوئی اندازہ نہیں...'' مائک نے بے بسی سے ہاتھ پھیلا دیے۔

''ایک تو تمھاری خطرناک کشش والی بات دل کو چبھی۔ اسے غلط ثابت کرنا ضروری تھا، دوسرے 'میمتھ' لفظ مجھے ہمیشہ سے پسند ہے...''

''میری خوش نصیبی...'' مائک نے خوش دلی سے کہا اور کار اسٹارٹ کردی۔

☆

رات کو ابدی محبت کی علامتیں تپائی پر ساتھ ساتھ رکھی تھیں۔

Marfat.com

''آخر ہم ایک بار مل گئے...'' سانپ کی شکل کے چھلّے نے کہا۔

''ہاں... وہ جو کہتے ہیں نا کہ طلب صادق ہونی چاہیے۔ مگر یہ غریب سمجھ رہے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی طرف بے اختیار کھنچے...'' فیروزے والی انگوٹھی نے کہا۔

''ان بے چاروں کو کیا معلوم! ان کی چھوٹی سی زندگی میں اتنے بہت سے چکر ہوتے ہیں۔ اس چھوٹی سی عمر میں ان کا علم اور بھی محدود ہوتا ہے۔ یہ عشق و کشش، ہجر و وصال کی باتیں کرتے ہیں۔ ان باتوں کو وہ لوگ کیا جان سکتے ہیں جن کی کل عمر ستر پچھتّر سال ہو۔ ان مسئلوں کو ہم جانتے ہیں جن کے لیے صدیاں لمحوں کی طرح گزرتی ہیں، جو ملکوں ملکوں کی خاک چھانتے ہیں، جو بدن کے ٹکڑے ہوتے دیکھتے ہیں مگر جو اپنی روح کو... اس روح کو جو کائنات کے تار میں دوسری ہر طرح کی روحوں کے ساتھ پروئی گئی ہے... ابد تک کے لیے بچا لیتے ہیں۔ پھر بدن بھی تو کسی نہ کسی شکل میں موجود ہی رہتا ہے۔ مختلف صورتوں میں ایک ہی عشق جون بدل بدل کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ کوتاہ عمر انسان جن کو اپنے شعور پر بڑا ناز ہے، یہ بات نہیں جان سکتے۔ ان کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ شعور تو کائنات کی ہر چیز میں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جس طرح ان کے شعور کی سطح ہمارے لیے اَن جانی ہے وہ ہمارے شعور کی سطح تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ کائنات کو جاننے، سمجھنے، پرکھنے کے لیے جتنی عمر چاہیے، اس کا ایک ریزہ ان بدبختوں کو نصیب ہوتا ہے۔ اس میں بھی یہ خود کو ہزار جنجالوں میں پھنسائے رکھتے ہیں۔ اپنے آپ کو اتنی فرصت نہیں دیتے کہ اپنے وجود کو، دوسروں کو یا کائنات کو سمجھ سکیں۔ ان کے سارے علوم میں سوال ہی سوال ہیں، جواب کسی میں بھی نہیں ہے اور اتنی سیدھی سادی بات کا بھی انھیں علم نہیں ہے...''

''تم نے ٹھیک کہا... اچھا چلو ہم سیر کو چلیں...'' وہ دونوں اپنے اپنے شعور کے بل پر اڑے اور فضا میں تیرتے باہر چلے گئے۔ رات بھر وہ کائنات کی پہنائیوں میں اڑتے پھرے... ایک دوسرے کی کشش بھری کیفیت میں سرشار... چاند ستاروں کی دنیا میں، برف بھری چوٹیوں پر، ہری بھری گھاٹیوں میں، ریگستان کی چاندنی میں... صبح دم وہ واپس آئے۔

Marfat.com

رات بھر اُن کے جسم میز پر اسی طرح ایک دوسرے کی آغوش میں پڑے رہے۔

دوسرے دن مائک کی بیوی میری کا فون آیا۔ وہ نہیں آسکتی، کوئی اڑچن پڑ گئی ہے، ہزار ہزار معافیاں مانگیں... ''ڈیئر میں اس کی تلافی کردوں گی... اگلی مرتبہ یہ ساری سیر میری طرف سے ہوگی۔''

مائک بظاہر مایوس اور کڑوا بن گیا... اُس کا دل ٹوٹ رہا تھا۔ اتنی خوب صورت جگہ وہ اکیلا پڑا تھا۔ ناامیدی اور مایوسی کے گہرے گڑھے سے اس نے کہا، ''تم اتنی مصروف ہو تو میں آکر کیا کروں گا... چھٹیاں غارت ہونی ہیں اور تنہا ہونی ہیں تو بلیو اسٹون پارک میں سہی...''

''یہ بھی ٹھیک ہے...'' بیوی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا، ''جتنے دن چاہو رہو۔ جب چاہو آجاؤ۔ کوئی ساتھی پکڑ لو... اب میں اپنی چھٹیاں بچالوں گی... اگلی مرتبہ اکٹھے چلیں گے... تمھیں چھٹیاں ملنے میں دقت ہوگی۔''

''نہیں مل جائے گی...'' مائک نے جلدی سے امید افزا لہجے میں کہا۔

میری نے اس کی مایوسی کو لحہ بھر میں بدلتے دیکھا تو خوش ہوئی۔ دو ایک معذرت آمیز کلمات کے بعد خدا حافظ کہا اور وہ ازلی اور ابدی جملہ جو فون پر خدا حافظ کے ساتھ کہنا لازمی ہوگیا ہے... ''آئی لو یو...''

''آئی لو یو ٹو...'' دوسری طرف سے آواز آئی... بے چارے ٹیلی فون یہ جملہ سنتے سنتے تھک گئے ہوں گے۔ چھلّے نے تمسخر سے کہا۔

''یہ کہو کہ بے چاروں کے کان پک گئے ہوں گے...'' انگوٹھی بولی۔

''ہاں... ان انسانوں کو مشین بننے کا شوق ہوگیا ہے۔ سب ایک سا سوچتے ہیں، ایک سا رہتے ہیں، ایک سا بولتے ہیں۔ شاید مشینوں میں ان سے زیادہ انفرادیت ہو...''

''اب ان دونوں کو دیکھو... کتنا خوش ہیں کہ انھیں ساتھ رہنے کے چند دن اور مل گئے... یہ کبھی نہیں جانیں گے کہ یہ ہم دونوں کے ساتھ رہنے کی شدید خواہش ہے جو انھیں ساتھ رہنے پر مجبور کر رہی ہے۔''

Marfat.com

''مگر کب تک...؟'' انگوٹھی نے دکھ سے کہا، ''آخر یہ اپنے ٹھکانے پر لوٹیں گے اور ہم ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائیں گے۔''

''ہمیشہ کے لیے!'' چھلّے نے بُرا مان کر کہا، ''کیسی انسانوں کی سی باتیں کر رہی ہو... ابد الآباد کی ان پہنائیوں میں ہم بچھڑے کب! ہاں کبھی کبھی کی مختصر سی جدائی کی تو کوئی بات نہیں... اور وہ بھی جسمانی...''

''تمھیں یاد ہے ہم پہلے پہل کب ملے تھے؟'' انگوٹھی نے پوچھا۔

''نینوا میں...''

''صرف تین سو سال ساتھ رہ کر ہم بچھڑ گئے تھے۔''

''ہاں، مگر مجھے یقین تھا کہ ہم پھر ملیں گے... اور ہم مصر میں ملے۔''

''رامسیس دوئم کے عہد میں۔'' انگوٹھی نے ماضی کے سرور میں کہا، ''کیا شان دار زمانہ تھا... تمھیں معلوم ہے میں نے حضرت موسیٰؑ کی انگوٹھی بھی دیکھی تھی۔''

''اور میں رامسیس کی انگلی میں تھا جب وہ ڈوبا... کتنے سال وہ خزانہ پانی میں دفن رہا... ہم معدنیات ہیں، یہ ہمارا مقدر ہے کہ ہم زمین سے نکالے جائیں اور پھر دفن ہو جائیں...''

''ہاں اور میں ہندوستان پہنچی، وہاں سے انگلستان ایلزبتھ اوّل کے زمانے میں چیپ سائڈ ڈسٹرکٹ میں جو دکان تھی، وہاں تھی۔ ایک دن چوروں کے ہتھے چڑھی۔ اس چور نے نوادرات جمع کرنے والے کے ہاتھ اونے پونے بیچ دیا۔''

''ارے جو لوگ دوسرے ملکوں میں جا کر دبے ہوئے خزانے نکالتے تھے وہ کیا کم چور تھے... غریب بدحال ملکوں کی حکومتوں کو بیوقوف بنا کر سارے خزانے اپنے ملک بھیج دیتے تھے۔ Schliemann مشہور آکیولوجسٹ نے ہمیں نکالا... اس کی بیوی صوفیہ نے سولہ سترہ لڑیوں کا ہار، بڑا سا جھومر جس کے سونے کی دو چوٹیاں گردن کے نیچے کندھوں تک لٹکی ہوئی تھیں، پہنا۔ بُندے اور انگوٹھیاں پہنیں اور تصویر کھنچوائی... جب زیور اتار کر دینے لگی تو غلطی سے یا جان بوجھ کر مجھے اپنی انگلی میں بھول گئی... میں اس خاندان

Marfat.com

میں بہت عرصے تک رہا... پھر ایسے غبی لوگ بھی آئے جنھیں اپنے آبا و اجداد کے خزانوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ پرانی حویلی کی دوسری چیزوں کے ساتھ اُنھوں نے ہمیں بھی سستے داموں فروخت کردیا... سنار کو پہچان تھی، اس نے نوادرات سے رابطہ قائم کیا اور یوں ہم تم ملے...''

''مگر مختلف لوگوں نے خریدا تو ہم پھر بچھڑ گئے...''

''تب کیا ہوا... دیکھ لو کہ ہمارے عشق نے ہمیں پھر ملا دیا۔''

☆

ایک ہفتے تک وہ ایک ہی دراز میں ایک دوسرے کی آغوش میں پڑے رہے... پھر اُنھوں نے سنا شیرن اور مائک سنجیدگی سے اپنے اپنے جیون ساتھیوں سے طلاق لینے کی بات کر رہے ہیں... مائک کہہ رہا تھا، ''تم نہیں جانتیں شیرن، اس عورت نے اس ایک سال سے بھی کم عرصے میں مجھے ناچیز ریت کا ذرّہ بنا دیا ہے۔ وہ سب کچھ ہے، میں کچھ نہیں ہوں۔ اس کا کام اہم ہے، اس کے دوست بہتر ہیں۔ اگلی دفعہ وہ مجھے سیر کرائے گی، سارے پیسے خرچ کرے گی۔ شروع میں یہ بات محسوس ہوتی تھی۔ اب احساس بھی ختم ہوتا جارہا تھا۔ تم سے ملا ہوں تو یہ دوبارہ سوچ رہا ہوں۔ میں کون ہوں۔ میں مائک ہوں یا اپنی بیوی کا رکھیلا ہوں۔ تمھیں دیکھ کر سوچتا ہوں ایسی بھی لڑکیاں ہوتی ہیں جو دوسروں کی انا کو جھنڈے پر چڑھائیں اور خود نیچے کھڑے ہوکر تالیاں بجائیں اور خوش ہوں۔ کیا تم بھی اپنے شوہر کے ساتھ یہی کرتی ہو؟''

شیرن نے کہا، ''کیا کروں، کرنا پڑتا ہے۔ تمھاری انا کو تمھاری بیوی دیمک کی طرح چاٹ رہی ہے اور میرا میاں بچپن سے ہزاروں کمپلیکسز کا شکار ہے۔ مجھے اس سے ہم دردی ہوئی، جسے میں غلط فہمی میں محبت سمجھ بیٹھی۔ اب اندازہ ہوتا ہے، وہ محبت نہیں تھی، ہو ہی نہیں سکتی۔ بہت جلد مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں... تمھیں سچ بتاؤں۔ میں اس سے لڑ کر آئی تھی، یہاں سے میں نے اسے فون کیا تھا کہ وہ اپنے اطوار نہیں بدلے گا تو میں اس کے پاس واپس نہیں آؤں گی۔ اس نے رونا دھونا شروع کردیا، خوشامد کرنے لگا تو میں نیم رضامندی سی ہوگئی۔ تمھارے روکنے پر میں اس لیے ٹھہر گئی تھی کہ

اسے اور تھوڑا سا مزہ چکھا دوں مگر اب تو بات ہی دوسری ہوگئی ہے...''

''ہاں...تم اس سے صاف کہہ دو کہ تم طلاق چاہتی ہو۔ وہ وکیل کا بندوبست کرے...میں بھی آج میری سے بات کرتا ہوں۔''

''واقعی؟... یہ کیسے ہوسکتا ہے!...اتنی جلدی...''

''تم کہتی ہو جلدی...'' مائک نے تعجب سے کہا۔ اس کا سفید نرم ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگایا۔''میں کہتا ہوں کتنی دیر لگی ہمیں ایک دوسرے کو پانے میں...عمرِ عزیز کا کتنا قیمتی وقت برباد ہوا...اور ابھی نہ جانے کتنی کدھیڑ اٹھانی پڑے گی اس طلاق کے چکر میں۔''

''تمھیں یقین ہے کہ ہم غلطی نہیں کر رہے؟'' شیرن نے تذبذب سے کہا۔

''نہیں... تمھیں دیکھ کر، تم سے چند باتیں کر کے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ تم میرے لیے صحیح شخصیت ہو.....اُس عورت سے شادی کر کے میں نے فاش غلطی کی ہے۔''

''کیا تمھیں یوں محسوس نہیں ہوتا...'' شیرن دھیرے دھیرے بولی، ''جیسے ہم جلدی میں قدم اٹھا رہے ہیں...'' شیرن تھوڑا سا کسمسائی۔ چھت کی طرف دیکھا اور کہا، ''کہیں ایسا نہ ہو بعد میں پچھتائیں۔''

''دل سے پوچھو۔'' مائک جوش سے بولا، ''اپنے دل سے پوچھ لو...نہ دنیا کے کہنے کی فکر کرو، نہ کسی اور کی۔'' مائک نے شیرن کے دل پر ہاتھ رکھا...''یہ کیا کہتا ہے؟''

''کہتا ہے... مائک، مائک، مائک...''

''ٹھیک!...اب میرے دل کی آواز سنو...'' مائک نے شیرن کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھا، ''سنو، صاف آواز آرہی ہے...شیرن، شیرن، شیرن...''

''ہاں... آ تو رہی ہے۔'' شیرن زور سے ہنس پڑی۔ مائک نے اسے گود میں بھر لیا۔

''اُفوہ...ان انسانوں کی خرمستیاں برداشت سے باہر ہیں۔'' انگوٹھی نے کہا۔

''آؤ... باہر چلیں...'' چھلّے نے صاد کیا۔

☆

''چلو... ایک بار اولڈ فیتھ فُل تک ہوکر آتے ہیں۔ اس بوڑھے وفادار کے سامنے قسم کھاتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔'' مائک نے کہا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' شیرن نے کہا، ''اتنی جلدی نہیں... چند دن اور ٹھہر جاتے ہیں۔''

''کل تو بہرحال ہمیں واپس جانا ہے۔ اس سے زیادہ ٹھہرنا ممکن نہیں۔ تمھیں معلوم ہے، آس پاس کے جنگلوں میں آگ لگی ہوئی ہے اور بجھانے کی ہزار کوششوں کے باوجود بڑھتی جارہی ہے۔''

''اچھا کل تک...'' شیرن نے کہا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ابھرتے چاند کی روشنی میں اولڈ فیتھ فُل کے منبعے کے پاس پہنچے... اِکا دُکا جوڑے بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے، اک دوسرے میں گم، دوسرے سیاحوں سے غافل۔ آپس میں سرشار... وہ ان سب سے الگ ایک اور بینچ پر بیٹھ گئے... مائک نے گھڑی دیکھی، ''کسی لمحے نکلنے والا ہے... وقت ہوگیا ہے۔''

''اسے وقت کا کیسے پتا چلتا ہے؟'' شیرن نے بھول پن سے کہا۔

''خدا معلوم...'' مائک ہنسا۔ ''بس چوبیس گھنٹے میں باقاعدگی سے تئیس مرتبہ نکلتا ہے، یوں تقریباً ایک گھنٹے بعد... اسی لیے اسے بوڑھا وفادار کہا جاتا ہے... سب سے زیادہ اسی کی زیارت کو آتے ہیں لوگ... کل جانے سے پہلے ہم اس کے آگے اس طرح کھڑے ہوں گے جیسے چیپل میں پادری کے سامنے کھڑے ہیں اور اپنی وفاداری کی قسم کھائیں گے۔''

''تم بھی دوسرے لوگوں سے مختلف ہو...'' شیرن نے کہا... ''اپنی بیوی کی طرح۔''

''خدا کے لیے اس وقت اس کا نام نہ لو۔ کبھی سوچتا ہوں شادی سے پہلے زندگی کبھی کبھی کتنی سہانی لگتی تھی، جیسے بالکل بے داغ اور مکمل ہو... مگر اب روز بہ روز بوجھل اور بے رس ہوتی جارہی ہے۔ سوکر اٹھتا ہوں تو صبح جینے کی امنگ سے خالی ہوتی ہے۔ جب صبح ہی بوجھل ہو تو دوپہریں تو ویران ہوں گی ہی، اور شامیں خالی اور سنسان۔ زندگی کا رس ختم ہوجائے تو باقی کیا رہے گا؟ تم سے مل کر احساس ہوا زندگی کا رس ختم نہیں ہوا ہے۔

ہماری ازدواجی زندگی گنے کی گنڈیری تھی جسے ہم جتنا چوس سکتے تھے چوس چکے۔ پھوک کو کتنی دیر منہ میں رکھا جاسکتا ہے... اسے تھوک دینا ہی بہتر ہے... ہے ناں...''

''... معلوم نہیں۔'' شیرن نے کہا، ''مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے میں بہت تھک گئی ہوں... جب کبھی باہر سبزے پر لیٹتی ہوں... چیری کے درختوں پر گچھوں کے گچھے پھولوں کے نکلے ہوں یا درخت سبز پتوں اور سرخ سیبوں سے پٹے پڑے ہوں۔ عشقِ پیچاں پر چڑیا چہچہا رہی ہوں اور سرو کے درخت میں چھپی فاختہ کوہو کی ہوک بھری آواز نکال رہی ہو تو پتا ہے میرا دل کیا چاہتا ہے؟''

''کیا؟'' مائک نے پوچھا۔

''کہ... گردن ڈال کر... آنکھیں بند کر کے بس چپ چاپ سو جاؤں ہمیشہ کے لیے... کوئی مجھے نہ اٹھائے۔''

''بس وہی بات ہے، بے رس زندگی... جب ہم تم ساتھ رہیں گے تو ہماری زندگیوں کے پیالوں میں یہ رس دوبارہ لبالب بھرا ہوگا۔''

''سچ مچ!'' شیرن نے شبہے سے پوچھا۔

''یقیناً۔'' مائک نے یقین سے کہا۔

عین اسی وقت اولڈ فیتھ فُل کا پانی آہستہ آہستہ نکلنا شروع ہوا۔ بھاپ کا پردہ اوڑھے وہ کچھ دیر کسی چھوٹے سے فوارے کی طرح ابلتا رہا۔ پھر یکایک شرشر کر کے زور سے اچھلتا چلا گیا... اونچا اور اونچا! اب وہ بھاپ کے حجاب سے بلند تر تھا اور لمحہ بہ لمحہ اور بلند ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے معمول کے ایک سو تیس فٹ پورے کرنے کے بعد بھی وہ کچھ اور اونچا گیا۔ مائک اور شیرن دم سادھے اسے دیکھتے رہے۔ ہر گھنٹے، لمحوں کا یہ کھیل پوری توجہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنی آخری بلندی کو چھو کر اُس کا جوش کم ہونے لگا... بلندی کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ بھاپ کے حجاب میں خود کو گم کر کے وہ بالکل گم سم ہو گیا۔

''آؤ، اولڈ فیتھ فُل کا پورا چکر کاٹ کر دوسری طرف سے واپس چلتے ہیں۔'' مائک نے کہا۔

ہاتھ میں ہاتھ ڈالے لوٹ رہے تھے، جب شیرن کے انگوٹھے نے انگلی کو چھوا اور اسے اپنی انگلی میں انگوٹھی کی کمی کا احساس ہوا۔

''میری انگوٹھی!'' شیرن نے کہا، ''تمھارے بیڈ سائڈ کی دراز میں تھی۔''

''اس وقت میری جیب میں ہے، تمھاری بھی اور میری بھی...'' مائک نے جیب تھپتھپائی۔

''لاؤ، مجھے دے دو۔'' شیرن بولی۔

''کیا کرو گی؟...''

''اس گدھے آدمی کو لوٹا دوں گی۔'' اس کے لیے اس کی کچھ قیمت ہوگی، میری نظر میں تو گھٹیا سی انگوٹھی ہے، پہنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔'' پھر شیرن نے مائک کے بازو پر اپنے ہاتھ کی گرفت ذرا تنگ کی اور کہا، ''تعجب ہے کہ پہلی ملاقات میں بات تم نے میری انگوٹھی کی تعریف سے شروع کی تھی۔''

''اور کیا کرتا...'' مائک ہنسا اور چاندنی میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔'' دراصل میں کہنا چاہتا تھا تمھاری انگلیاں بہت سڈول، گاؤدم اور خوب صورت ہیں مگر ڈر گیا۔''

''اچھا...'' شیرن مسکرائی۔ ''کیا تم اپنی بیوی کو انگوٹھی واپس نہیں دو گے؟''

''نہیں... مجھے اس طلسمی انگوٹھی سے ہمیشہ خوف آتا ہے۔ میں اسے ایسی جگہ پھینکوں گا کہ کوئی نکال نہ سکے۔''

''مثلاً کہاں؟...'' شیرن نے پوچھا۔

''دیکھتی جاؤ...'' مائک بولا۔

اس وقت تک وہ دونوں تقریباً اس گڑھے کے پاس پہنچ چکے تھے جس کا نیلا شفاف پانی چوبیس گھنٹے، ہر لمحہ، ہر لحظہ کھولتا رہتا۔ مائک نے جھک کر چاروں طرف غور سے دیکھا۔ ایک زنگ آلود تار کا ٹکڑا اٹھایا۔ جیب سے انگوٹھیاں نکالیں۔ ان کو تار میں پرو کر دونوں کنارے آپس میں ملا کر مروڑے اور شیرن کے روکتے روکتے وہ تار کھولتے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔

Marfat.com

''اب تم دونوں یہاں پر رہنا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...'' مائک نے کہا اور شیرن کو اپنے ساتھ چمٹا کر تیزی سے ''اولڈ فیتھ فُل اِن'' کی طرف بڑھ گیا۔

''دیکھو دور آسمانوں پر نارنجی اور گلابی غبار سا ہے... شاید یہی وہ جگہ ہے جہاں آگ لگی ہوئی ہے۔'' شیرن نے کہا۔

''عجیب بات ہے۔'' مائک نے کہا، ''جنگل میں بھی آگ لگی ہوئی ہے اور ہمارے دلوں میں بھی محبت کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ان دُہری آگوں سے ہم کیسے بچیں گے۔''

''معلوم نہیں بچیں گے یا جل کر بھسم ہو جائیں گے...'' شیرن نے کہا۔

''بچیں گے اور وہ ہمارا نیا جنم ہوگا... اب یہ بتاؤ کہ 'میمتھ' اور دوسری جگہیں تمھیں کیسی لگیں؟''

''سچ بتاؤں؟''

''ہاں بالکل سچ...''

''تمھارے ساتھ جو کچھ بھی دیکھ رہی ہوں، اس پر ایسا ہی نارنجی اور گلابی غبار سا چھایا ہوا ہے۔ لگ ہی نہیں رہا کہ کوئی چیز اصلی ہے۔ کیلشیم کے وہ رنگ برنگے چھجے ہوں یا آبشار یا جھیل، شیطانی مینار کی کہانی کی طرح پریوں کی کہانی ہے یا خواب جیسے ابھی آنکھ کھلے گی تو میں جم کے ساتھ اس کے بستر پر پڑی ہوں گی اور آنکھیں مل کر سوچوں گی کہ کتنا خوب صورت خواب تھا اور مائک نامی لڑکا کیا کمال کا ہینڈسم، خوش اخلاق اور پیارا تھا۔ اگر ایسے آدمی کے ساتھ زندگی بسر ہوتی تو کیا سکھ ہوتا...''

''اوہو... ہو...'' مائک نے خوش ہو کر اسے اور نزدیک کر لیا... ''اتنی تعریفیں تو زندگی بھر کسی نے نہیں کیں... مژدہ ہو کہ یہ سب خواب نہیں۔ ہم اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اسی خواب کی دنیا میں رہیں گے۔''

''تم نے اپنا چھلا اور میری انگوٹھی پھینک دی۔ ہم کیا جواب دیں گے۔'' شیرن یکایک سر سے پیر تک کانپی جیسے اسے سردی لگ رہی ہو۔

''ہم ان سے کہیں گے، انگوٹھیاں ہم نے جہنم کے کھولتے پانی میں ڈال دیں۔ اگر ان کو ضرورت ہے تو نکال لائیں... کم از کم ہمیں ضرورت نہیں ہے اور دیکھو اب ان منحوس انگوٹھیوں کے بارے میں نہ سوچنا، نہ کچھ کہنا۔''

'اِن' آ گئی تھی، دونوں ساتھ ساتھ چلتے آئے۔ مائک نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور شیرن کے ساتھ اندر داخل ہو کر مقفل کر لیا۔

☆

''اس گڑھے کا پانی تو بے حد شفاف ہے۔'' انگوٹھی نے کہا، ''آج نہیں تو کل کسی کی آنکھ دیکھ لے گی کہ یہاں کوئی قیمتی چیز پڑی ہے اور ہم پھر بچھڑ جائیں گے۔''

''فی الحال جنگل کی آگ تیزی سے اس طرف بڑھ رہی ہے۔ مستقبل قریب میں کسی کا یہاں آنا مشکل ہے...'' چھلّے نے اسے تسلی دی۔

رات کو اولڈ فیتھ فل اِن میں یکایک آگ کا سائرن بجنے لگا۔ لوگ سوتے سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے... مائک اور شیرن الگ ہوئے اور جلدی جلدی کپڑے پہننے لگے۔

مائک کا ارادہ تھا کہ فون پر ہوٹل کے دفتر سے بات کرے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دفتر سے بندھی ٹکی آواز اور نپے تلے لہجے میں کوئی کہہ رہا تھا، ''سر، جنگل کی آگ بہت تیزی سے ہماری طرف بڑھ رہی ہے، ہمیں ہوٹل کو فوری طور پر خالی کرنے کا حکم ملا ہے۔ آپ جلد سے جلد اپنا سامان لے کر نیچے آئیں۔ آپ کے پاس کار ہے تو لابی میں قطار بندی کریں۔ وہاں آپ کی مدد کرنے والے لوگ موجود ہیں۔ آپ کے پاس کار نہیں ہے تو دفتر میں آئیں۔ آپ کے لیے ٹرانسپورٹ کا انتظام ہے... اب مجھے دوسرے لوگوں سے بات کرنی ہے میں آپ کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔ جلد سے جلد کمرے خالی کر دیں۔ خدا حافظ!...''

مائک نے جلدی جلدی ساری بات شیرن کو سنائی۔ شیرن نے کچھ سنی کچھ نہ سنی۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔

''تم سے نیچے ملاقات ہوگی...'' مائک نے چلا کر کہا۔

Marfat.com

مائک نے اپنا مختصر سا سامان اٹھایا اور باہر آیا۔ لوگ اپنا اپنا سامان اٹھائے تیزی سے نیچے اتر رہے تھے۔ اکثر کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ بے انتہا گھبرائے ہوئے تھے، کچھ پُرسکون تھے۔ بچے اِدھر اُدھر کی کھڑکیوں سے جھانک کر آگ کی زیارت کی کوشش کر رہے تھے اور بڑوں سے ڈانٹ کھا رہے تھے۔ مائک ایلی ویٹر کی طرف گیا۔ بہت لوگوں کو منتظر دیکھ کر وہ زینے سے نیچے اترنے لگا۔ کیا یہ اتنی خوب صورت اِن... ان کی مختصر محبت کی خوب صورت یادگار جل کر ختم ہو جائے گی۔ نیچے لابی میں پہنچ کر اس نے بڑی سی گھڑی کو دیکھا جو رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی مگر چل رہی تھی... زمانے کی طرح جو چلتا ہوا نظر نہیں آتا لیکن چلتا رہتا ہے... اور دور نکل جاتا ہے۔

فائر بریگیڈ کے ایک آدمی کو گزرتا دیکھ کر لوگوں نے اس سے صورتِ حال پوچھی۔ ''ابھی تک حالات قابو میں ہیں۔'' اس نے کہا، ''مگر جس رفتار سے ہوا آگ کو اس طرف دھکیل رہی ہے، اس سے یقین ہے کہ یہ ہوٹل آخرکار اس کی لپیٹ میں آجائے گا۔ تین سو سیاح اسی وقت ہوٹل خالی کر رہے ہیں، مگر ہوٹل میں کام کرنے والے ہمارے ساتھ مورچہ بنا کر آگ سے لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''ابھی تک آگ قابو میں کیوں نہیں آئی؟'' کسی نے سوال کیا۔

''ہم تو برابر لڑ رہے ہیں۔ قدم قدم اور انچ انچ پر لڑ رہے ہیں مگر ہوا کی شدت آگ کی کمک بن گئی ہے۔ فتح اس اتحاد کی ہو رہی ہے اور ہم بے چارے پیچھے ہٹنے پر مجبور ہیں...'' یہ کہتا ہوا وہ تیزی سے نکل گیا۔

☆

شیرن نیچے آئی تو سیکڑوں لوگوں کے مجمعے میں مائک کہیں دکھائی نہیں دیا۔ لابی کی لمبی قطار اب بہت چھوٹی رہ گئی تھی۔ وہ سامان گھسیٹتی دروازے تک لائی اور تاریکی میں کار پارک کی طرف دیکھنے لگی، کاریں تیزی سے جا رہی تھیں۔ کوئی کار ایسی دکھائی نہ دی جو کسی کے انتظار میں اپنی بتیاں روشن کیے بیٹھی ہو... وہ اور آگے بڑھی... پورچ میں کھڑی بس کا ڈرائیور پکارا... ''میڈم ایئرپورٹ جانا ہے تو اندر بیٹھیے... وقت کم ہے...''

Marfat.com

شیرن واپس آئی اور اپنا سامان اٹھا کر بس کی قطار میں کھڑی ہوگئی اس کی نگاہیں باہر اندھیرے میں مائک کو تلاش کر رہی تھیں۔

☆

جس وقت وہ جہاز سے اتری تو یکایک کسی نے سب کے سامنے اسے گود میں بھر کر پیار کیا اور کان میں محبت بھری سرگوشیاں کرنے لگا... وہ جم تھا اور واقعی بے حد فکرمند لگ رہا تھا... اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں بے خوابی سے سرخ تھیں۔

''میں نے ہزاروں دفعہ کمرے میں تمھیں فون کیا مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ میں اتنا پریشان تھا... شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو... اگر تمھیں کچھ ہوجاتا تو میں بے موقت مر جاتا... میں خودکشی کرلیتا... میں تمھارے بغیر زندہ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

دور کی بات تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ شاید اس کی بیوی کو جلتی سرائے کے دم گھونٹتے دھویں سے بمشکل نکالا گیا ہوگا... شیرن نے فی الحال اس کی غلط فہمی دور نہیں کی۔ صرف حیرت اور خوشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہ شخص جو بظاہر روکھا سا نظر آتا ہے، اس سے اتنی شدید محبت کرتا ہے۔ شیرن نے بے دھیانی میں انگوٹھی سے خالی اپنی انگلی پر نظر ڈالی۔ جم نے بھی دیکھ لیا۔

''رات کو اتار کر رکھ دی تھی۔ ہلچل میں وہیں رہ گئی...'' شیرن نے نظریں جھکائے جھکائے کہا۔

''گولی مارو انگوٹھی کو...'' جم نے جوش میں کہا۔ ''تم خیریت سے آگئیں یہ کم ہے؟... ایسی سیکڑوں انگوٹھیاں تم پر سے نچھاور کردوں۔''

''واقعی!'' شیرن نے ڈرتے ڈرتے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''اور کیا۔ تمھارے بغیر یہ دن جیسے جہنم تھے... اور تمھارے؟'' جم نے پوچھا۔

''میرا تو یہ دوسرا جنم ہے... میں تو آگ کے جہنم سے نکل کر ہی آرہی ہوں۔''

Marfat.com

''ہاں... سچ مچ... واقعی... بے چاری تم!...'' جم نے ترس بھرے لہجے میں کہا... ''آؤ جلدی سے گھر چلیں، تمھیں سکون اور آرام کی ضرورت ہے۔''

☆

مائک گھر پہنچا تو اس کی بیوی ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئی اور اس سے لپٹ گئی۔

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تم خیریت سے ہو...'' اس نے کہا، ''میں ابھی اپنی گاڑی لے کر نکلنے ہی والی تھی... اتنی بُری بُری خبریں سننے میں آ رہی تھیں... ٹی وی اور ریڈیو یہی کہہ رہے تھے کہ بہت جلد آگ سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ میں سوچ رہی تھی تم باہر کیسے نکلو گے؟''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں تھی...'' مائک نے اسے تسلی دی۔ ''آگ تیزی سے بڑھ ضرور رہی تھی مگر ہمیں صحیح راستہ بتانے والے موجود تھے۔ افسوس یہی ہے کہ اتنا خوب صورت اور تاریخی ہوٹل جل کر ختم ہو جائے گا۔''

''اولڈ فیتھ فل اِن؟'' میری نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''بھاڑ میں جائے... ہوٹل تو پھر بھی بن جائے گا۔ جان ہے تو جہان ہے۔''

''ارے، تم تو تاریخ اور ثقافت کی جی جان سے عاشق ہو۔''

''عاشق ہونا اور بات ہے اور اپنی جان کھونا اور بات ہے۔ میں تو اس وقت سے فقط ایک ہی بات سوچ رہی ہوں۔''

''کیا؟''

''یہی کہ میرا مائک زندہ سلامت واپس آ جائے۔'' وہ مائک کے دل سے لگ گئی۔

مائک نے اسے پیار سے تھپکا تو چھلّے سے خالی اپنی انگلی پر نگاہ پڑی۔ اسی وقت میری نے بھی دیکھا۔

Marfat.com

''نائٹ اسٹینڈ پر رکھ دیا تھا... رات کو جلدی میں وہیں رہ گیا۔'' مائک نے افسوس سے کہا۔

''جانے دو... جان کے آگے چھلّے انگوٹھی کی کیا قیمت ہے۔''

''مگر تم تو کہتی تھیں کہ وہ اَن مول ہے...اور پھر sentimental value الگ...''

''تمھاری جان سے زیادہ تو اَن مول نہیں... میں تمھیں ایسی ہی ایک اَن مول انگوٹھی اور دے دوں گی بلکہ دو دے دوں گی... مگر جب تک تم رات کو اتارنے کا سلسلہ جاری رکھو گے، وہ بھی گم ہوجائے گی۔''

''اچھا اب دو گی تو کبھی نہیں اتاروں گا۔''

''کبھی نہیں؟...''

''کبھی نہیں... ابدالآباد تک۔''

ازل اور ابد کے درمیان گزرتے ایک لمحے نے حقارت سے سوچا... یہ انسان کیسی چھچھوری باتیں کرتے ہیں۔ ذرّیاتی شعور کے چھوٹے انسان! یہ ازل اور ابد کو کیا جانیں گے، ایک لمحے کی حقیقت تو انھیں معلوم نہیں... کوئی کیڑا جو ابھی پیدا ہو اور ابھی مرجائے، وقت کی اصلیت کو کتنا سمجھ سکتا ہے۔ شعلے کی روشنی کتنی بھی تیز ہو، شمع کتنی دیر بھی بھڑکے، سورج سے ان کا کیا مقابلہ۔

☆

برف ابلتے پانی میں بھرتی گئی۔ انگوٹھی اور چھلاّ نرم مٹی کے اندر اتر گئے۔

''انسانوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ آخر قدرت نے ہی آگ بجھائی۔'' چھلّے نے کہا۔

''اسی نے بھڑکائی بھی تو تھی...'' انگوٹھی بولی۔ ''بجلی گرنے سے آگ لگی تھی۔ جب ذرا کم ہوئی اور لوگ واپس آنے لگے تو ہوا نے زور باندھا۔ اس گھوڑے پر چڑھ کر شعلوں نے آسمان کی خبر لی۔ آنے والے اپنا سامان ڈھو کر دوبارہ بے گھر ہوئے۔ پھر برف کے ننھے منے گالے ننھے فرشتوں کی طرح آئے اور گونجتی گرجتی، بھرتی آگ ٹھنڈی

پڑ گئی۔"

"اور ہمیں بھی انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔" چھلّے نے کہا، "میں نہ کہتا تھا کہ قدرت پر بھروسا رکھو... جب برف پگھلے گی، دوبارہ سیاحوں کا کاروبار شروع ہوگا، تب تک تو ہم اور بھی نیچے اتر چکے ہوں گے..."

"ہاں، مگر اب اِس جلے خرابے کو دیکھنے کون آئے گا؟" انگوٹھی نے دکھ سے کہا۔ سو سال کا درخت جلے گا تو دوسرا درخت اتنا بڑا ہونے میں سو سال ہی لے گا..."

"ارے پگلی..." چھلّے نے بڑے پن سے کہا، "قدرت کے اپنے ڈھنگ، اپنے اصول ہیں۔ انسان کوئی چیز جلا دیتا ہے تو کیا اسے دوبارہ بنا سکتا ہے؟ مگر ہر سال جب درخت بالکل مردہ ہو جاتے ہیں تو کیا یوں نہیں لگتا کہ اب یہ کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہوں گے مگر ایک دن سارے ہڑبڑا کر یوں اٹھ بیٹھتے ہیں جیسے کسی نے کان میں "کُن" پھونک دیا ہو... قدرت بجلی سے جلائے کوئلہ کیے درختوں کو کیسے سرسبز کر لیتی ہے!... ان جنگلوں میں جو آگ لگتی ہے، یہ بھی قدرت کا انتظام ہے کہ قریب المرگ درختوں کو ختم کر دے۔ بہت زیادہ درخت مرنے کے قریب ہوں تو آگ بے قابو لگنے لگتی ہے... مگر ان درختوں کی راکھ میں اتنی قوتِ نمو ہوتی ہے کہ ہزاروں کی تعداد میں نئے پودے نکل آتے ہیں اور تیزی سے بڑھتے ہیں۔"

"کتنے تیزی سے بڑھیں گے!" انگوٹھی نے دکھ سے کہا، "ابھی تو برف نے جنگل کے گھاؤ چھپا لیے ہیں۔ جب برف پگھلے گی تب پتا چلے گا۔"

"تب نیچے سے تازہ ہری گھاس اور نئے نئے پودے پھوٹیں گے۔ کیا ضروری ہے کہ جنگل سو سال کے درختوں سے ہرا ہو۔ نوخیز پودوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ چونچال بچوں اور بیمار بوڑھوں کا کیا مقابلہ!"

"لکڑی کی سرائے بچ گئی، یہ اچھا ہوا۔" انگوٹھی نے کا۔

"ہاں... جب سرائے میں کام کرنے والے آگ بجھانے والوں کے ساتھ مل کر جی جان سے جٹ گئے تو آگ وہاں تک نہ پہنچ سکی۔ انسانوں اور عمارتوں کو جلانا اس کا منشا

بھی نہ تھا۔ قدرت نے اپنا کام کیا، انسانوں نے اپنا۔ انسان شور مچاتے رہتے ہیں۔ یہ جل گیا، وہ جل گیا۔ ان نادانوں کو خبر نہیں کہ آگ جلاتی ہے تو جِلاتی بھی ہے۔ یہ درخت جو نکلیں گے ان کیڑوں کی طرح ہوں گے جو آگ میں پیدا ہوتے ہیں۔''

''شاید آگ نے شیرن اور مائک کو بھی اپنے ازواج سے ملا دیا ہو...'' انگوٹھی نے کہا۔

''شاید...'' چھلّے نے دُہرایا۔

اب یہاں ہم سب کی نظروں سے اوجھل ہمیشہ ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔'' انگوٹھی نے چھلّے کی گود میں سر رکھے رکھے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

''ابدالآباد تک... اگر قدرت نے چاہا۔'' چھلّے نے کہا۔

☆

مائک علی الصبح باہر نکلا۔ میری ابھی سو رہی تھی۔ جون کا آخری ہفتہ تھا۔ میری نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مائک کو اپنے خرچ پر بلیو اسٹون پارک کی سیر کرائے گی۔ اسے خود بھی آگ لگنے کے بعد اس جگہ کو دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا۔ وہ دونوں اس بار بھی ''اولڈ فیتھ فُل اِن'' میں ٹھہرے تھے۔

ہوٹل میں نئی زندگی کی نیو پڑ گئی تھی۔ گو زمین اندر سے ایک میٹر تک جل گئی تھی لیکن یہی راکھ، بارش اور چشموں کے پانی کے ساتھ مل کر بہت زرخیز ہو گئی تھی۔ گھاس کے میدانوں میں دو فٹ اونچی گھاس تھی اور جنگل میں رنگ برنگے خود رو پھول کھلے ہوئے تھے۔ مائک نے دیکھا، جنگل کی زرد للی پر اوس پڑی ہوئی ہے۔ اس کی اوٹ میں دبکا ہوا خرگوش آہٹ سن کر بھاگا... چڑیوں اور کیڑوں کی موسیقی سے لطف اندوز وہ آگے بڑھتا گیا۔

میری اٹھی تو مائک بستر پر نہیں تھا۔ یوں ہی کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو مچھلی پکڑنے کا کانٹا اور اسی قسم کے تام جھام لیے چلا آ رہا تھا۔ میری نے دوبارہ بستر پکڑا اور اخبار پڑھنے لگی۔

Marfat.com

''تم سو رہی تھیں سو میں اولڈ فیتھ فُل کا ایک چکر لگا آیا۔''

''اچھا کیا...'' میری نے کہا، ''اخبار میں لکھا ہے کہ اب یہ سارا علاقہ سائنس دانوں کے لیے کھلی تجربہ گاہ ہے۔ کہتے ہیں اتنے بڑے پیمانے پر اتنے علاقے پر اثر انداز ہونے والی آگ پہلے کبھی نہیں لگی تھی۔ اب سائنس دان برسوں تک یہاں کی مٹی پر، بیجوں پر، کیڑے مکوڑوں اور جانوروں پر تحقیق کریں گے...''

''کرتے رہیں...'' مائک نے کہا، ''ہم نے تو تحقیق کر لی اور نتیجہ بھی پا لیا۔''

''کیا تیر مار آئے...'' میری بولی، ''کیا صبح صبح مچھلی پکڑنے نکل گئے تھے؟''

''یہی سمجھ لو۔'' مائک نے پُراسراریت سے کہا۔

''گرم پانی کے چشموں سے تو مچھلی بھی ابلی ہوئی نکلے گی۔'' میری ہنسی۔

''دیکھو، تمھارے لیے ایک نایاب چیز لایا ہوں۔ دیکھو گی تو حیران ہو جاؤ گی۔ جب سے آیا ہوں اسی کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ تم پریشان تھیں کہ اکیلا جانے کہاں چلا جاتا ہوں مگر مجھے یقین تھا کہ تمھارا دیا ہوا چھلاّ ضرور مل جائے گا۔''

''واقعی؟'' میری حیران ہوئی... ''دکھاؤ، دیکھے بغیر میں تو یقین نہیں کر سکتی۔''

''دیکھو...'' مائک نے چھلاّ دکھایا۔

''حیرت ہے!''... میری نے کہا... ''مگر ملا کہاں سے؟ میرا خیال تھا کہ کسی ملازم نے اڑا لیا کیوں کہ ہوٹل کے منتظمین نے تو صاف انکار کر دیا تھا کہ اُنھیں ایسا کوئی چھلاّ نہیں ملا۔''

''افراتفری میں لوگ بھاگے، خدا معلوم کس کے ہاتھ لگا، کیا ہوا...'' مائک نے کہا، ''بس قسمت میں تھا، دوبارہ مل گیا۔ اس تار میں الجھا ہوا تھا اور اسی میں یہ دوسری انگوٹھی بھی پھنسی ہوئی تھی...''

میری نے انگوٹھی ہتھیلی پر رکھی، ''کمال ہے، یہ بھی بہت پرانی معلوم ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کوئی اس کی تلاش میں آئے۔ ہمیں پولیس اسٹیشن میں دے دینی چاہیے۔''

''نہیں، ان دونوں انگوٹھیوں کو جدا نہیں ہونا چاہیے۔ تم خود ہی کہتی تھیں ناں کہ

Marfat.com

بعض چیزیں بھی ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔ اب میں ان دونوں کو ساتھ ساتھ پہنے رہوں گا... یاد ہے تم نے کہا تھا، میں ایک کی جگہ دو انگوٹھیاں دے دوں گی..."

میری نے حیرت سے مائک کو دیکھا۔ اسے لگا جیسے یہ اس کا مائک نہیں کوئی اور ہی شخص ہے۔ لوگ مرنے کے بعد ہی دوسرا جنم نہیں لیتے، زندگی میں بھی نئے نئے جنم لیتے رہتے ہیں، اس نے سوچا...!

Marfat.com

ہنسی کی بات

ہم میاں بیوی جہاز کے کیبن میں آئے اور سامان کھول کر رکھنا شروع کیا ہی تھا کہ کمرے میں لاوڈ اسپیکر شور مچانے لگا:

''سیفٹی ڈرل کے لیے تیار ہوجاؤ۔ تمھارے کمرے کی الماری میں لائف بیلٹ رکھی ہیں۔ ہدایات کے مطابق ان کو پہن لو اور کمرے کے باہر قطار میں کھڑے ہوجاؤ۔ سیفٹی بیلٹ پر جو نمبر ہے اس کے حساب سے قطار میں ڈیک چھ پر آنا ہوگا جہاں لائف بوٹ ہیں۔ ایلی ویٹر بند ہوں گے، بتیاں بجھا دی جائیں گی، صرف سیڑھیاں استعمال ہوں گی۔ مدھم چراغ راہوں میں روشن ہوں گے اور جہاز کا عملہ راہ نمائی کے لیے موجود ہوگا۔ جیسے ہی سائرن بجے سب کمروں سے باہر نکل آئیں، کوئی کمرے میں نہیں ٹھہرے گا۔ اگر آپ بیمار ہیں تب بھی باہر آجائیں، عملہ آپ کی مدد کرے گا۔ وہیل چیئر کی ضرورت ہو تو فون کردیں'' وغیرہ وغیرہ۔ پھر آگ لگ جانے کی خبر دینے والا بے حد خطرناک سائرن بجنے لگا اور جیسے ہی لائف بیلٹ پہن کر باہر نکلے ساری بتیاں گل ہوگئیں۔

''کروز میں کریبین کی سیر کو نکلے ہیں، ابھی تو جہاز کے ہاتھ پیر بھی نہیں ٹٹولے تھے کہ یہ افتاد پڑ گئی۔'' میں نے کہا۔

Marfat.com

''اور اس سے پہلے جو پاسپورٹ دکھانے اور جہاز میں داخل ہونے کے لیے کارڈ وغیرہ کے کارروائی ہوئی سو الگ۔'' حمید نے کہا، ''اب اوکھلی میں سر دیا تو موسلوں کیا ڈر۔''

معلوم تھا کہ صرف ڈرل ہے پھر بھی ڈر لگ رہا تھا۔ ٹمٹماتے چراغ کی روشنیوں اور نارنجی جیکٹ پہنے لڑکیوں کے اشارے پر آگے بڑھتے اور سیڑھیاں چڑھتے اترتے رہے۔ جب ڈیک نمبر چھ پر پہنچے اور سورج کی روشنی نظر آئی تب جان میں جان آئی۔

دوبارہ قطار بندی ہوئی اور لیکچر شروع ہوا کہ آج کی ڈرل یہیں تک ہوگی۔ اگر واقعی کوئی حادثہ پیش آیا تو اس وقت کی الٹی لٹکی ہوئی ساری کشتیاں پانی میں ہوں گی اور آپ کو اپنے نمبر کے حساب سے کشتیوں میں بیٹھنا ہوگا۔ لوگ اکتائے ہوئے لیکچر سن رہے تھے۔ لڑکیاں اپنے ساتھ کے لڑکوں سے چمٹ کر لیکچر کو بالکل ہی نظر انداز کر رہی تھیں۔ ایک تو اپنے بوائے فرینڈ کی گود میں اس طرح چڑھ گئی تھی کہ جیسے کوئی ننھا سا بچہ ماں کی گود میں ہو۔ ہمارے پیچھے کوئی سیاہ فام صاحب کسی گوری خاتون سے بحث کر رہے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر واقعی کوئی حادثہ ہوا تو کیا یہ سب یوں ہوگا۔ ایسی افراتفری ہوگی کہ لوگ قطار بندی بھی بھول جائیں گے، یہ چہلیں کس کو سوجھیں گی اور شاید اسی وقت کھلے کہ گود میں چڑھنے اور گلے میں بانہوں کے ہار ڈالنے والوں میں کون کس کا دوست ہے؟ بارے ڈرل ختم ہوئی اور قطاروں میں واپسی ہوئی۔ اس ڈرل سے ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ اس وقت ہزاروں مسافر اس جہاز میں ہیں۔ یہ جہاز ایسا چڑیا گھر ہے، جس میں ہر ملک اور ہر قسم کا جانور موجود ہے۔

ہم اس ڈرل سے گھبرائے ہوئے تھے مگر اس کے بعد سفر کے تجربات نہایت خوش گوار رہے۔ بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ ہم جہاں پناہ ہیں اور تالی بجا کر جس وقت جو چیز مانگیں گے وہ حاضر کردی جائے گی۔

شام کی چائے کے ساتھ بے شمار لوازمات تھے۔ ہم چند ایک چیزیں لے کر ڈیک گیارہ پر آ بیٹھے جو سمندر کی سیر کے لیے کھلا ہوا تھا مگر دھوپ سے بچنے کے لیے

Marfat.com

شامیانہ تنا ہوا تھا۔ حدِ نظر تک پھیلا سمندر ہمیشہ مجھے ازل اور ابد کا اشاریہ لگتا ہے اور اس کی لہروں کی مسلسل حرکت وقت کی علامت۔ اس کے بدلتے رنگ، طلوع اور غروبِ آفتاب کے مناظر، لہروں کا کبھی بے انتہا بپھر جانا، کبھی حد سے زیادہ پُرسکون ہوجانا دنیا کی رنگا رنگی کا روپ نظر آتا ہے۔ شاید اسی لیے سمندر کو تکتے رہنے سے دل نہیں بھرتا۔ شفق کے وقت قدرت کے آرٹسٹ نے جلدی جلدی تصویریں بنانی اور مٹانی شروع کیں۔ جو لوگ ریلنگ کے پاس بیٹھے دھوپ سے رنگ گلنار کر رہے تھے، اٹھ کر چلے گئے۔

رات کا کھانا اگر تکلف سے گرینڈ ریسٹورنٹ میں کھانا ہے تو لباس تبدیل کر کے آنا ہوگا۔ ہم تو تماشا دیکھنے کے شوقین ہیں، سو کپڑے بدل کر ہم بھی چلے۔ ریسٹورنٹ کا دروازہ ابھی نہیں کھلا تھا۔ دروازے کے آگے قطاریں لگ رہی تھیں۔ ہم نے دیکھا کہ خواتین جہاز کے بیوٹی پارلر سے بال بنوا کر اور نہایت سج دھج کر آ رہی ہیں۔ مرد حضرات عمدہ سوٹ پہنے ہوئے ہیں، جیسے کوئی اسٹیٹ ڈنر ہو۔ تبھی تو لوگ ایک ہفتے کے لیے دو دو بڑے سوٹ کیس لے کر نکلے ہوئے تھے اور کروز نہ صرف اس کی اجازت دیتا تھا بلکہ حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

ہماری میز پر صرف دو اور لوگ تھے۔ باقی نشستیں خالی تھیں اور ہمیشہ خالی رہیں۔ موجود لوگوں نے اپنا تعارف کروایا۔ آرلین سفید فام اور مائیکل سیاہ فام۔ یہ جوڑا کینیڈا سے آیا تھا۔ یہ وہی جوڑا تھا جو حادثے کی ٹریننگ میں ہمارے پیچھے کھڑا تھا۔ آرلین خوب بنی سنوری تھی۔ نیچے تک جاتے ہوئے گلے کے اوپر خوب صورت سا ہار، بلکہ دونوں ہی زیورات میں لدے ہوئے تھے۔ مائیکل بھی ہاتھ میں سونے کی کئی کئی انگوٹھیاں، گلے میں سونے کی موٹی سی زنجیر اور ایک ہاتھ میں بھاری سا کنگن پہنے ہوئے تھا۔

بیرا ایک سجا سجایا کیک لایا اور ہماری میز پر رکھ دیا۔ ’’کھانے سے پہلے کیک؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’آج آرلین کی سال گرہ ہے، اس کا کیک ہے۔ بس انھیں بتانا ہوتا ہے، پیسے ویسے نہیں دینے پڑتے۔‘‘

ذرا دیر میں چھ فٹ قد کا ہینڈسم سا بیرا آیا۔ اس نے آرلین کو مبارک باد دی۔ اتنی دیر میں دو بیرے اور آگئے۔ اس نے سب کا تعارف کروایا۔ ہیڈ ویٹر اسکاٹش تھا اور دوسرے بیرے مختلف ملکوں کے رہنے والے تھے۔ ایک بیرا استنبول کا رہنے والا تھا۔ پھر سب مل کر گانے لگے ہپی برتھ ڈے ٹو یو۔ اس لمبے چوڑے ہال میں کئی جگہ یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔

ہیڈ بیرے نے جھک کر آرلین سے پوچھا، ''کون سی سال گرہ ہے؟''

وہ ذرا ہچکچائی۔ مائیکل نے فوراً جواب دیا، ''پچاسویں۔''

''ارے تم تو تیس سال سے ایک دن بھی زیادہ نہیں لگتیں۔'' ہیڈ بیرے نے کہا۔

آرلین خوب ہنسی، ''یہ ہوئی ناں بات۔ چلو اس نیک شخص کے ساتھ میری تصویر لو۔'' یہ مائیکل کے ہاتھ میں کیمرا دے کر خود ہیڈ بیرے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ مائیکل نے دونوں کی تصویر لی۔ پھر اس نے بیرے کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا اور بولی، ''ایک اور۔'' مائیکل نے دوسری تصویر لی۔ اتنی دیر میں جہاز کا فوٹو گرافر آگیا جو ہر ایک کی تصویر لے رہا تھا۔ ''اب میں تم دونوں کی تصویر لیتا ہوں۔'' آرلین کرسی پر بیٹھ گئی، ''پہلے ایک تصویر صرف میری لو، میری سال گرہ ہے۔ پھر ہم دونوں کی لینا اور اس طرح کہ کپتان کی میز کا منظر پورا آئے۔'' تصویر لی گئی پھر اس نے ہماری تصویر لی۔

''اچھا کیک تو کاٹو۔'' مائیکل نے کہا، آرلین نے کیک کاٹا۔ ایک ایک ٹکڑا سب نے کھایا۔ پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ کھانے پر رسمی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ ڈیک نمبر چار پر تھے اور متعجب تھے کہ ہمیں اتنے اوپر ڈیک پر کیبن کیسے مل گیا۔

''ہم سے تو اوشن ویو کا وعدہ کیا گیا تھا مگر بعد میں لڑکی مکر گئی کہ پورے جہاز میں ایک سیٹ بھی خالی نہیں۔'' حمید نے کہا۔

''مگر بے چاری نے تحفہ تو بھیج دیا۔'' میں نے کہا۔

''تحفہ ہمارے کس کام کا ہے، شراب کی بوتل ہے۔''

Marfat.com

''شراب کی بوتل!'' مائیکل چہکا۔ ''بڑی خاص ہوتی ہے، ان کی شراب، تم نے پی؟''

''ہم لوگ پیتے پلاتے نہیں، کسی امریکن دوست کو دے دیں گے۔''

''آرلین! تم ان کے ساتھ جاکر بوتل لے آؤ نا۔ جب یہ پیتے نہیں تو اتنے تام جھام کے ساتھ خواہ مخواہ جگہ گھیر رہی ہوگی۔''

''کھانے کے بعد جب یہ کیبن میں جائیں گے، تب لے لوں گی۔''

''میرا خیال ہے ابھی لے آؤ، یہیں کھول کر پییں گے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''سب چیزیں مفت ہیں مگر شراب کے پیسے دینے پڑتے ہیں۔'' مائیکل نے ہمیں مطلع کیا۔

''نہیں یہاں اپنی بوتل کھول کر پینا اچھا نہیں لگے گا۔ کھانے پر شراب تم منگاؤ نا، آج میری سال گرہ بھی تو ہے۔'' یہ کہہ کر آرلین خوب ہنسی۔ اس کے دانت برابر اور خوب صورت تھے اور اس کی ہنسی میں اس کی خوش دلی کے ساتھ دانتوں کی خوب صورتی کا بھی خاصا حصہ تھا۔ خود بھی خوش شکل تھی۔

''اچھا بابا میں ہی منگا لوں گا۔'' مائیکل نے ہار ماننے کے انداز میں کہا۔

''اور تحفہ بھی دو گے نا، ہیرا لوں گی۔''

''وہ بھی لے لینا۔'' مائیکل نے بھی دانت نکال دیے۔

مینو دیکھ کر کھانا منگایا گیا۔ مائیکل نے شراب کا آرڈر دیا۔ کئی کورس ہوئے، کھانا بہت تھا مگر ہمارے مطلب کا کم تھا۔

''پھل کو جی چاہ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''الگ سے پھل کا آرڈر دو تو اس کے پیسے ہوتے ہیں۔'' مائیکل نے کہا۔

''تم بڑے باخبر ہو۔''

''ہاں میرا چوتھا چکر ہے، میں تو آتا رہتا ہوں۔''

''میں نے پناما کنال، الاسکا اور ویسٹرن کریبین کے کروز بھی لیے ہیں۔''

آرلین خاموش بیٹھی تھی۔

Marfat.com

''تم نہیں گئیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''نہیں... یہ اکیلا جاتا رہتا ہے... جب کبھی مجھے چھٹی مل جاتی ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں جیسے ابھی آ گئی۔''

''تو تمھارا میاں ہر وقت چھٹی پر رہتا ہے؟''

''اس کی اپنی بزنس ہے، میں جاب کرتی ہوں۔''

''بات سنو آرلین، وہ شراب کی بوتل!'' مائیکل نے یاد دلایا۔

''ہاں ہاں، جب یہ جائیں گے تب لے لوں گی نا۔''

''بس ہم تو اٹھ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چلو میں بھی چلتی ہوں۔''

ہمارے کیبن میں آ کر اور بوتل اپنے قابو میں کر کے وہ بستر پر بیٹھ گئی اور بولی، ''صبح تم لوگوں کا کیا پروگرام ہے؟''

''کچھ نہیں، ہم تو ڈیک پر بیٹھ کر سمندر کا نظارہ کرتے ہیں یا کچھ پڑھ لیتے ہیں۔''

''ناشتے کے بعد میں بھی آ جاؤں گی، تاش کھیلیں گے مگر تم لوگ صرف سمندر کا نظارہ کرتے ہو، نہ پول میں تیرتے ہو نہ صبح کو واک کے لیے جاتے ہو۔ میں تو چھ بجے اٹھتی ہوں، واک کے لیے جاتی ہوں، سات بجے باڈی اسکلپٹنگ ہوتی ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا، ''ہم گرم ملک کے ست لوگ ہیں۔ اپنی سستی میں مگن رہتے ہیں۔ کنارے سے نظارہ کرتے ہیں، ڈوبنے کو ضروری نہیں سمجھتے۔''

''یہ اچھی کہی۔'' وہ ہنسی، ''اور تم لوگ رات کھانے کے بعد ڈانس بھی نہیں کرتے؟''

''نہیں، جس دن کوئی اور پروگرام ہوگا، تب آئیں گے۔''

''ہزاروں پروگرام روز ہوتے ہیں۔ تنبولا اور کیسینو میں ہر طرح کا جوا۔ کل تمھیں سارے جہاز کی سیر کراؤں گی۔'' وہ اپنا گاؤن سنبھالتی کھڑی ہوگئی، رخصتی کے لیے

Marfat.com

میرے گال سے گال لگائے، پھر حمید کو اپنا گال پیش کیا اور بائی بائی کرتی رخصت ہوگئی۔

دوسرے دن میں سمندر کی نیرنگیاں دیکھنے میں غرق تھی اور حمید حسبِ معمول اخبار پڑھ رہے تھے کہ آرلین تاش لے کر آ پہنچی۔

''مائیکل کہاں ہے؟'' حمید نے پوچھا۔

''تالاب میں تیر رہا ہے اور وہاں جو کھیل ویل ہوتے ہیں، ان میں حصہ لے رہا ہے۔''

''تم نہیں تیرتیں؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تو رات کو مزہ آتا ہے، جب چاروں طرف روشنیاں ہوتی ہیں۔ دس بجے رات سے ایک بجے تک مزے دار پیزا اور پھر ہوائی اسٹائل اسٹال پر ناریل کے چھلکوں میں سجا ٹھنڈا اناناس... تیرتی نہیں ہو تو کبھی دیکھنے ہی آؤ۔''

''ہاں آؤں گی۔'' میں نے کہا۔

''اور ہاں آج کیپٹن کا ڈنر ہے۔ رات کو خوب بھڑکیلے کپڑے پہن کر آنا اور زیور بھی۔''

''میں بھڑکیلے کپڑے نہیں پہنتی، میرا مزاج نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر بھی بن سنور کر تو آنا۔ میں تو بھئی بہت سے کپڑے لے کر آئی ہوں، جہاز والے بھی یہی چاہتے ہیں۔ جبھی تو فی کس دو سوٹ کیس لانے کو کہتے ہیں اور ہر دوسری رات کوئی خاص رات ہوتی ہے اور الوداعی رات تو بہت خاص ہوتی ہے۔''

تھوڑی دیر تاش کھیلے، پھر میرا دل بھر گیا۔ ''میں لائبریری سے کتاب لے کر آتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جلدی آجانا، خشکی پر سیر کا پروگرام بھی طے کرنا ہے۔'' حمید نے کہا۔

''کروز پر کتابیں کون پڑھتا ہے؟'' آرلین نے کہا۔

''میں کیبن میں جا کر پڑھتی ہوں۔''

''کیبن میں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے جب ہزاروں دلچسپیوں کا سامان آپ

Marfat.com

کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔"

"اس کا جواب میں کل دے چکی ہوں۔" کہہ کر میں لائبریری کی طرف چلی جو ڈیک نمبر چھ پر بالکل اخیر میں تھی۔ میں فوٹو گیلری، فلاور شاپ، کافی شاپ، راندے وو اور گفٹ کی دکانوں سے گزرتی پتلی سی گیلری کو پار کر کے لائبریری پہنچی۔

لائبریری اندھیری پڑی تھی۔ میں نے روشنی جلائی تو دیکھا کہ مائیکل کسی سے لپٹا کھڑا تھا۔ مائیکل گھبرا کر الگ ہو گیا چبلی سی لڑکی نے مجھے بڑی ناگواری سے دیکھا۔ میں جلدی سے بغیر روشنی بجھائے الٹے پیروں واپس ہوئی۔

"کیا ہوا کتاب نہیں لائیں؟" حمید نے کہا۔

"کوئی ڈھنگ کی کتاب نہیں ملی۔"

"کتاب کے کیڑے ڈھنگ کی کتاب کب سے تلاش کرنے لگے!" حمید نے کہا۔ "انھیں تو بس چاٹنے سے مطلب۔ چلو اب پروگرام سیٹ کرلیں۔"

"یہیں کرلو۔" آرلین نے کہا۔

"نہیں بروشر کیبن میں ہیں۔" حمید نے کہا۔

"مگر ابھی تو ہم جہاز کی سیر کو جائیں گے۔ میں نے کل تمھاری بیوی سے وعدہ کیا تھا جہاز دکھانے کا، تم بھی چلو۔"

"نہیں میں کچھ دیر لیٹوں گا، طبیعت بھاری ہو رہی ہے، تم ہو آؤ۔" حمید نے مجھ سے کہا۔

"آؤ چلیں۔ پہلے رات کی تصویریں دیکھ لیتے ہیں۔ اگر اچھی ہوئیں تو خرید لیں گے۔ پھر دوسرے کمرے جھانکیں گے، مجھے بینک سے پیسے بھی نکالنے ہیں۔"

فوٹو لاؤنج سے پینٹنگز اتار کر رات کی کھینچی ہوئی تصویروں کے پرنٹ لگا دیے گئے تھے۔ کچھ لوگ خرید رہے تھے اور کچھ حسبِ ہدایت اپنی ناپسندیدہ تصویریں کوڑے کے ٹین میں ڈال رہے تھے۔ آرلین نے جو تصویر کیمرا مین سے الگ کھنچوائی تھی، وہ خرید لی اور اپنے شوہر کے ساتھ والی کوڑے کے ٹین میں ڈال دی۔ میں نے اور حمید نے ایک

Marfat.com

تصویر کھنچوائی تھی، سو میں نے وہ خرید لی۔ ڈانس سیکھنے کے کمرے میں ڈانس سکھایا جا رہا تھا۔ کرسٹل روم بڑا جگمگا رہا تھا مگر اس وقت خالی تھا۔

''تم کیپٹن کے ڈنر کے لیے بال نہیں بنواؤ گی؟'' آرلین نے پوچھا۔

''نہیں بھئی، میرے پاس سو ڈالر فالتو نہیں ہیں۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔ میں تو بال بنانے کا سارا سامان ساتھ لے کر آئی ہوں، خود ہی بنا لوں گی۔ مگر بھئی ایک سو بیس ڈالر کا مساج کروانے کو تو جی چاہتا ہے۔''

مجھے اپنے وطن کی ماسیاں یاد آئیں جو بے چاریاں گھنٹوں بیگمات کے ہاتھ پیر دباتی تھیں، تب چند ٹکے یا پرانا جوڑا پاتی تھیں۔

بار سے گزرے تو مائیکل بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ''ارے تمھارا میاں تو یہاں بیٹھا ہے۔'' میں نے کہا۔

''بیٹھا رہنے دو، ابھی یہاں پینٹنگز کی بولی لگے گی، اس کے لیے بیٹھا ہے۔''

''کیا اسے پینٹنگز خریدنے کا شوق ہے؟''

''کوئی کوڑیوں کے مول مل گئی تو لے لے گا پھر منھ مانگے داموں بیچے گا۔ تمھیں تو معلوم ہے نا کہ جہاز پر ٹیکس نہیں لگتا۔ میں بھی کچھ زیور لوں گی۔ دکان کی لڑکی میری دوست بن گئی ہے۔ سوچو، دنیا میں اس کا کہیں ٹھکانا نہیں۔ میاں سے طلاق لینے کے بعد بس جہاز پر ہی رہتی ہے۔ ایک کیبن ملا ہوا ہے، کھانا پینا، سونا اٹھنا سب یہیں ہے۔ کبھی سال میں ایک بار اپنی کسی دوست کے پاس چلی جاتی ہے۔''

''ارے وہ اکتاتی نہیں سمندر کے سفر سے؟''

''نہیں، کہتی ہے یہ میرا گھر ہے، یہاں کے لوگ میرے دوست ہیں اور بس۔''

''میں حمید کو فون کر لوں، شاید تصویروں کا نیلام بھی دیکھنا چاہیں۔''

''تو کل دیکھ لیں گے، ابھی تو ہمیں ڈیک پانچ پر جا کر بینک سے پیسے نکالنے ہیں۔ مجھے وہ ڈیک بہت پسند ہے۔ اس کی چھت اور سیڑھیوں کی ریلنگ ایسے جگمگاتی ہے جیسے سونا اور ہیرے لگے ہوں۔''

Marfat.com

''ہاں، مجھے بھی اس کا چھوٹا سا فوارہ اچھا لگتا ہے۔ اور سیڑھیوں کے پاس جو مجسمہ رکھا ہے، وہ لہروں کے ساتھ ہلتا اور آگے پیچھے ہوتا ہوا یوں لگتا ہے جیسے چل رہا ہو۔''

''اچھا! میں تو روز وہاں جاتی ہوں مگر میں نے نہیں دیکھا۔'' آرلین نے کہا۔

بینک سے پیسے لے کر وہ زیور کی دکان پر گئی مگر دکان بند تھی۔ ''لنچ پر گئی ہوگی۔ چلو ہم بھی لنچ کھالیں۔ فون کر کے اپنے میاں کو بلوا لو۔''

''اور مائیکل؟''

''وہ بعد میں وہیں پول کے پاس سے ہاٹ ڈاگ اور ہیم برگر لے کر کھالے گا۔''

''میں نے حمید کو فون کیا۔ انھوں نے کہا کہ وہ ڈیک گیارہ پر ملیں گے جہاں بوفے لنچ ہے۔''

''تم میاں بیوی ہر وقت ساتھ رہتے ہو! بور نہیں ہوتے؟'' آرلین نے مجھ سے پوچھا۔

''ہمارے یہاں یہی دستور ہے، مرن بھرن کا ساتھ ہوتا ہے۔''

''واقعی مرن بھرن کا ساتھ... تعجب ہے! ہم اس طرح ساتھ رہیں تو سچ مچ مرجائیں۔''

''تمھاری شادی کو بھی تو بہت دن ہوگئے، مائیکل بتا رہا تھا، سینٹ مارٹن کے ٹور پر ملا تھا، تم نہیں تھیں۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ تو بتاؤ مائیکل نے کیا کہا؟ کتنے سال ہوئے ہماری شادی کو؟''

''چودہ۔''

''اچھا!'' اس نے قہقہہ لگایا، ''مگر ہم ساتھ رہتے کہاں ہیں۔ وہ مچھلیاں پکڑنے کی فکر میں رہتا ہے۔ میں دو چار عورتوں کے ساتھ مل کر ساحل کے نزدیک ترین بازار چلی جاتی ہوں۔ دور ہو تو بس میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں۔ واپسی میں تمھارے سمندر کا نظارہ بھی کر لیتے ہیں۔''

Marfat.com

سینٹ تھامس، ورجن آئی لینڈ کے خوب صورت جزیرے میں مائیکل اور آرلین کو ہم نے ساتھ دیکھا۔ دنیا کی دس خوب صورت جگہوں میں شمار ہونے والی بے حد پُرسکون خلیج کی تصویر لے کر ہم گفٹ شاپ میں گئے تو وہ دونوں وہاں بھی جیولری خرید رہے تھے۔

''میرا خیال ہے یہ لوگ سونے کا کاروبار کرتے ہیں، ورنہ اتنا زیور کون خریدتا ہے؟'' حمید نے کہا۔

''ممکن ہے۔'' میں نے کہا۔

رات کو دیر سے جہاز پر پہنچے تو کھانا اپنے کیبن میں منگالیا، گرینڈ ریسٹورنٹ نہیں گئے، اس لیے آرلین اور مائیکل سے ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسرے دن بھی وہ جہاز پر کہیں نظر نہیں آئے۔ اتنے بڑے جہاز میں اتفاقاً ملنا بہت مشکل تھا۔ سینٹ مارٹن میں آب دوز کشتی میں سمندر کی تہ میں طرح طرح کے رنگین مونگے کے ڈھیر، اور قوسِ قزح کی طرح کی رنگین مچھلیوں کا نظارہ کررہے تھے، جب مائیکل نظر آیا۔

''آرلین کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آج جہاز میں ہیرے جواہرات کی سیل ہو رہی ہے، اس کی لمبی قطار میں کھڑی تھی۔ تقریباً جہاز کی ساری عورتیں وہاں ہیں، تم نہیں ٹھہریں؟''

''نہیں، ہیرے تو ہر جگہ مل جاتے ہیں مگر یہ انوکھا منظر کہاں دیکھنے کو ملے گا۔'' میں نے کہا۔

''بہت کم عورتیں اس طرح سوچتی ہیں۔ آرلین کہتی ہے، نکٹی چپٹی مچھلیاں صرف کھانے کی چیز ہیں، دیکھنے کی نہیں اور سمندر کے نیچے چھپی الا بلا کو ہم پیسے دے کر کیوں دیکھیں۔''

''اپنا اپنا خیال ہے۔'' میں نے کہا۔

آخری ڈنر کے دن تو عورتوں نے سجنے بننے کی انتہا کردی تھی۔ آرلین سے سمندر کی تہ کا ذکر آیا تو اس نے کہا، ''میں مچھلیاں وچھلیاں نہیں دیکھتی۔ جب مچھلی پکاتی

ہوں تو دیکھ لیتی ہوں یا میرا پڑوسی دریا سے پکڑ کر لاتا ہے تو بھیج دیتا ہے۔ دیکھو میں نے یہ مچھلی خریدی ہے۔" اپنے گلے میں پڑی موٹی سی زنجیر دکھائی جس میں سونے کی ایک مچھلی پڑی تھی اور آنکھوں کی جگہ لعل جڑے ہوئے تھے۔

کھانے کے دوران پھر تصویریں کھینچی گئیں۔ آرلین نے پھر ہیڈ بیرے کے ساتھ تصویر کھنچوائی اور واپس آکر مائیکل سے بولی، "کتنا ہینڈسم آدمی ہے۔ اگر میں اس کے ساتھ بھاگ جاؤں؟"

مائیکل کھسیانا سا ہوکر بولا، "بھاگ جاؤ، مگر پچھتاؤ گی۔"

کھانے کے کئی کورس آئس کریم اور میٹھے پکوانوں کے ساتھ بمشکل ختم ہوئے تھے کہ اعلان ہوا:

ایک گھنٹے بعد اسی جگہ بوفے ڈنر ہوگا اور آپ سب کے لیے ایک زبردست سرپرائز۔ ایک گھنٹے بعد ضرور تشریف لائیں۔ بیروں کا بھی اصرار تھا کہ ضرور آئیں۔ ایک گھنٹے کے لیے ہم تھیٹر میں جا بیٹھے جہاں ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور عورتوں کے گاؤن جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ زیادہ تر خواتین ایوننگ گاؤن میں تھیں مگر چند کے کپڑے اوپر سے بہت نیچے اور نیچے سے بہت اوپر تھے۔ کیپٹن نے اپنے تمام اسٹاف کا تعارف کروایا۔ پھر اسٹیج پر کٹھ پتلی کا تماشا ہوا۔ اس کے بعد بینڈ بجا اور چند جوڑے ناچنے لگے۔ ہمیں سرپرائز دیکھنے کا شوق تھا، اس لیے اٹھ کر چلے آئے۔ کھانے کے کمرے میں پہنچے تو سماں ہی دوسرا تھا۔ دروازے بند تھے۔ صرف سیڑھیوں سے نیچے اترنے کا بندوبست تھا اور ہر طرف پھلوں، سبزیوں اور برف کے مجسموں سے ایسی سجاوٹ کر رکھی تھی کہ آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں۔ گویا ایک آرٹ گیلری تھی جس میں فریم شدہ اور بغیر فریم کی تصویریں نہیں بلکہ ترکاریوں اور پھلوں سے بنے ہوئے گل دستے دیواروں پر سجے تھے۔ بڑے بڑے خوب صورت گل دستے میزوں پر رکھے تھے اور برف کی بنی ہوئی ٹوکریوں میں کٹے ہوئے پھل بھی آرٹ کا نمونہ نظر آ رہے تھے۔ بسکٹ، کیک اور سیکڑوں کھانے کی چیزیں بھی خوب صورتی سے سجی ہوئی تھیں۔ میں تصویریں لے رہی تھی کہ میری نگاہ آرلین پر پڑی

Marfat.com

جو ایک میز پر کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھی آئس کریم کھا رہی تھی۔

''تصویریں ہی لیتی رہو گی یا کچھ کھاؤ گی بھی؟'' اس نے مجھ سے کہا۔

''ارے ابھی کھانا کھائے دیر ہی کتنی ہوئی ہے، بالکل گنجائش نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم نے اپنے سفر کے آدھے پیسے بھی وصول نہیں کیے۔ اچھا اب کیا ارادہ ہے؟''

''اب اپنے کیبن میں جا کر سوئیں گے۔ صبح جلدی اٹھنا ہے۔''

''سونے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ کم از کم آج تو پول سائڈ کا تماشا دیکھ لو۔ رات کو بڑی رونق ہوتی ہے وہاں۔''

''تمھارا میاں کہاں ہے؟''

''بے چارہ مائیکل تو وہیں پڑا مچھلیوں سے کھیل رہا ہے۔'' وہ ہنسی۔

''سوئمنگ پول میں مچھلیاں؟... اچھا میں سمجھ گئی۔'' میں نے کہا۔

''سمجھ گئیں نا۔'' وہ خوب ہنسی۔ ''اب ایک بجے رات کو ہی لوٹے گا۔''

''تو تمھیں کوئی فکر نہیں؟''

''نہیں، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے، میں اپنی... اچھا یہ کیمرا اپنے میاں کو دے دو۔ وہ تصویریں لے لے گا اور میرے ساتھ غسل خانے تک چلو، کچھ باتیں کرتے ہیں۔ بس یہ آخری رات ہے جہاز پر۔''

وہ اپنا چھوٹا سا قیمتی پرس اٹھا کر میرے ساتھ ہو لی۔

غسل خانے کے بڑے سے آئینے کے سامنے اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے اس نے کہا، ''تمھیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ تم خوب ہنسو گی، مگر کسی اور سے مت کہنا۔''

''اچھا کہو۔''

''یہ جو میرے ساتھ کالیا ہے، یہ میرا شوہر نہیں ہے، بوائے فرینڈ بھی نہیں ہے۔

Marfat.com

کرایہ بچانے کے لیے ہم نے ایک کیبن لے لیا ہے۔ تمھیں تو معلوم ہے سنگل کا کرایہ کتنا زیادہ ہوتا ہے۔ پھر کینیڈا کا ڈالر بھی تمھارے امریکن ڈالر سے ہلکا ہے، اس لیے ہمیں اور بھی مہنگا پڑتا ہے۔''

میں بالکل نہیں ہنسی۔ میری شکل دیکھ کر وہ قہقہے لگانے لگی۔ ''ارے تم تو شاک میں چلی گئیں۔''

''شاک میں جانے کی بات ہی ہے۔ تم الگ کیبن کا کرایہ بھی دے سکتی تھیں اگر زیور اور ہیرے جواہرات نہ خریدتیں۔''

''واہ! اسی کے لیے تو میں نے پیسے بچائے، اور مزہ بھی تو رہا۔ دیکھو پاگل نے مجھے پچاس سال کا بنا دیا جب کہ میں چالیس کی ہوں اور میری سال گرہ تو ابھی بہت دور ہے اور یہ مزہ دیکھو کسی سے کہتا تھا کہ ہماری شادی کو چار سال ہوئے ہیں، کسی سے کہتا تھا دس اور تم سے کہا چودہ سال۔''

''اچھا تبھی۔'' میں کسی اور خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔

''تبھی کیا؟... بتاؤ نا۔ میں نے تمھیں اتنا بڑا راز بتا دیا، اب تمھیں بتانا پڑے گا۔''

''بھئی میں نے تمھارے میاں کو دیکھا تھا ذرا...'' میں ہچکچائی۔

''ہاں ہاں کہو نا۔ کسی کے ساتھ بوسہ بازی میں لگا ہوگا۔ تو بھئی مجھے کیا، میرا میاں تو ہے نہیں۔ اور دیکھو نا رات کو ایک کیبن میں سوتے ہیں۔ ہم نے یہ معاہدہ کرلیا تھا کہ کوئی ہینکی پینکی نہیں ہوگی... اس لیے ڈیڑھ دو بجے آ کر چپ چاپ پڑ کر سو جاتا ہے۔ اب دن میں بے چارہ یہ بھی نہ کرے!'' وہ پھر ہنسنے لگی۔

میں خاموش رہی۔ ''ارے بولتی کیوں نہیں، کچھ تو کہو۔'' اس نے مجھے ٹہوکا دیا۔

میں نے کہا، ''میں کیا بولوں۔ یہ بتاؤ اگر تم روز شراب خانے میں جا کر بیٹھی رہو اور کہو کہ میں پیتی نہیں تو کون یقین کرے گا؟''

''مجھے کسی کو یقین دلانے کی ضرورت ہی نہیں۔'' وہ بولی، ''میری اپنی مرضی ہے

Marfat.com

بس۔ اگر مجھے کسی ایسے شراب خانے میں بیٹھنا ہی پڑے جس کی شراب مجھے پسند نہ ہو تو میں بیٹھی رہوں گی، پیوں گی نہیں۔''

''تو یہ بات ہے... اس میں شراب کی رنگت تو درمیان میں نہیں آتی؟'' میں بھی خباثت پر اتر آئی۔

''آ بھی سکتی ہے۔'' اس نے مجھے آنکھ ماری اور ہنستے ہنستے دُہری ہوگئی، ''کچھ باتیں کہنے کی نہیں ہوتیں۔ ویسے تم بھی جانتی ہو، میں بھی جانتی ہوں۔''

اس کی آنکھوں سے ہنسی کے مارے اتنے آنسو نکلے کہ دوبارہ میک اپ درست کرنا پڑا۔

مجھے ہنسی پھر بھی نہ آئی۔

ورثہ

''سات سُر شُدھ ہیں۔'' افروز کی آواز نے کہنا شروع کیا۔

''موسیقی کے پنڈت کہتے ہیں کہ موسیقی کائنات میں ہر جگہ موجود ہے۔ اس کی بندش ہی گائیکی ہے۔ گویا ہوا کو باندھ لیتے ہیں۔''

''سُر ... سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی ہیں۔ پانچ کومل سُر ہوتے، پانچ تیور۔ ہر شخص کا 'سا' الگ ہوتا ہے۔ وہاں سے اپنے 'سا' کو پکڑ کر آگے چلتا ہے۔ نیچے سے اوپر جانا آروہی ہے، اوپر سے نیچے آنا اوّر وہی ہے... ہر راگ کی شکل الگ ہوتی ہے۔ بھیرویں میں سارے سُر کومل ہوتے ہیں، مالکونس میں پانچ۔ سارے سُر تیور بھی ہو سکتے ہیں جیسے ایمن کلیان میں۔''

''گانے والا بول کا بناؤ کرتا ہے، مرکیاں دکھاتا ہے، الاپ کرتا ہے۔ اکار گلے سے ادا ہوتے ہیں۔ راگنی آپ کے سامنے آکھڑی ہو، اس کا نام سروپ ہے، اور گانے والے کو یہ سروپ بنانا پڑتا ہے۔''

یہ سب کچھ ٹیپ میں تھا۔ میں کبھی سنتا تھا، کبھی نہیں۔ جو ٹیپ بھی لگاتا تھا، اکثر سنتے سنتے سو جاتا تھا۔ افروز کی آواز میرے لیے لوری کا کام دیتی تھی۔ اس کی اتنی عادت

Marfat.com

ہوگئی تھی کہ کسی دن بغیر ٹیپ سنے سونا چاہتا تو نیند نہ آتی۔ میں نے افروز کو لکھا تھا، ''زندگی بھر کسی چیز کی لت نہ لگائی تھی، فلسفہ یہ تھا کہ کسی چیز کا غلام نہ بنوں گا مگر اب تمھارا، تمھارے تصور کا، تمھاری تصویر کا اور تمھاری آواز کا غلام ہوگیا ہوں۔ تم موجود ہو تو پل بھر تمھارے بغیر نہیں رہا جاتا، تم نہیں ہو تو تمھاری تصویر دل کے پاس لگی رہتی ہے، تصور ذہن میں ہر لحظہ موجود ہے۔ رات کو تمھاری آواز سنے بن نہ چین ہے نہ نیند۔ پھر بھی خوش ہوں، وہ غلام ہی کیا جو غلامی پر صابر و شاکر ہی نہیں، خوش نہ ہو۔ تمھارا بے دام...''

وہ بھی مزے دار خط لکھتی تھی۔ جب میں نے لکھا، ہوسکے تو کراچی آجاؤ، یہاں ملتے رہنے کا نہیں تو مل سکنے کا امکان تو رہے گا۔ تو اس نے جواب دیا، ''جنگ کی وجہ سے ہوائی جہازوں کی پرواز بند ہے، ریل گاڑیاں خطرناک ہیں لیکن میں کراچی پہنچ جاؤں گی، چاہے سائیکل رکشا سے آنا پڑے۔ تمھاری منی سی بیٹی کا بھی تو خیال ہے۔ اسے کس پر اور کیسے چھوڑوں؟''

سائیکل رکشا کے ذکر پر یاد آیا کہ ہم ڈھاکا میں بیٹھتے تھے اور خوب بیٹھتے تھے۔ مجھے سائیکل رکشا کی یہ بات پسند تھی کہ اس میں دو آدمی بے فکری سے تبھی بیٹھ سکتے ہیں کہ ان کے بدن مس ہوتے رہیں۔ افروز کا گرم نرم لمس مجھے کتنا مسحور کرتا تھا۔ میں اس سے کہا کرتا تھا، ''میں محض ایک بیٹری ہوں۔ تم بیٹری چارجر ہو۔ تم مجھے چارج کرتی ہو تو مجھ میں توانائی رہتی ہے، تم دور ہوجاؤ گی تو میں بیٹری کا بے کار سیل ہوجاؤں گا۔''

یہ سب رومانوی باتیں تھیں۔ وہ مجھ سے دور تھی۔ میں اب بھی سارے کام کرتا تھا۔ میں اچھا ڈاکٹر اور اچھا انسان مشہور تھا۔ جنگ کے دنوں میں سیلرز سے کہا کرتا تھا، موت برحق ہے، اس سے ڈرو مت۔ ڈرو گے تو موت جلد پکڑے گی۔ میرا اسسٹنٹ ڈاکٹر جاوید جو اتفاق سے میرا سالا بھی تھا، بڑی اضطراری طبیعت کا مالک تھا۔ وہ میری اس بات کو نہیں مانتا تھا۔ زندگی میں بہت کم باتوں پر اس کا ایمان تھا۔ وہ وقت کے دھارے پر تنکے کی طرح بہنا چاہتا تھا۔ اضطراری طور پر فوج میں آگیا تھا اور اب فوج چھوڑ کر پرائیویٹ پریکٹس کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ اے ء کی جنگ شروع ہوگئی اور

اب ہم دونوں ایک ہی تباہ کن جہاز ''خیبر'' پر تھے۔ کبھی کبھی ڈیک پر بیٹھ کر چائے یا سگریٹ پیتے ہوئے ہم گھر کی باتیں کرتے تھے۔ اس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی، اس لیے وہ بہت برگشتہ دل تھا۔ میں اس کی اضطراری فطرت سے ڈرتا تھا اور اسے دھیرج کی تلقین کرتا تھا۔ وہ آگ کے شرارے کی طرح لپکتا تھا تو میں ٹھنڈی پھوار بن کر برستا تھا۔ وہ گرجتا تھا تو میں ہنس دیتا تھا۔ دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ اس کی بہن میں یہ گھن گرج نہیں تھی۔ افروز نے اپنا اضطرار، اپنی فطری آگ گانے کے فن میں ڈال دی تھی۔ جاوید کی نار ابھی نور بننے سے بہت دور تھی۔

ہمارے جہاز کے کپتان کا حکم تھا کہ تم لوگ تاش اور شطرنج میں وقت ضائع نہ کرو بلکہ جب بھی وقت ملے آرام کرلیا کرو، نامعلوم کب کیا وقت آن پڑے اور لگاتار کتنی کتنی دیر کام کرنا پڑے۔ اپنی توانائیاں ضائع نہ کرو... جاوید کہتا، ''توانائیاں بھی کیا نوٹ ہیں کہ بٹوے میں ڈال کر رکھ لو اور خرچ نہ کرو۔'' ساڑھے دس بجے میں نے جاوید کو اپنے کیبن سے رخصت کیا اور سوچا کہ کپتان کے کہنے پر ہی عمل کیا جائے۔ رات کا لباس تبدیل کرنے سے پہلے خیال آیا کہ گیارہ بجے کی خبریں سن لی جائیں۔ اس دوران افروز کی آواز کا ٹیپ لگا کر میں آنکھیں موند لیٹ رہا۔

پانی پر تاریکی اتر آئے تو کانوں میں پڑنے والی آوازیں دل میں اترنے لگتی ہیں... اور یہ ٹیپ تو وہ تھا جو میں نے اپنی فرمائش پر افروز سے بھروایا تھا۔ میں نے کہا تھا، مجھ سے باتیں کرتی جاؤ اور گانے گاتی جاؤ۔ باتیں تمھاری مرضی کی، گانے میری فرمائش کے ہوں گے... اس نے کہا تھا، موسیقی کے بارے میں تمھیں کچھ باتیں بتاتی رہوں گی تاکہ تمھیں سنتے ہوئے اور مجھے گاتے ہوئے مزہ آئے۔ افروز نے عرصے تک ریڈیو میں ملازمت کی تھی۔ ریڈیو کی ملازمت عموماً اچھی آواز پر ملتی ہے اور ریڈیو کا تجربہ اس آواز کو بنانے سنوارنے میں جادو دکھاتا ہے۔ افروز کی آواز میں مٹھاس اور رس پہلے سے تھا۔ ریڈیو نے اتار چڑھاؤ سکھا کر اسے نکھار دیا تھا۔ استادوں سے موسیقی بھی سیکھ لی تھی۔ اس کے بہت سے ٹیپ میرے پاس تھے جن میں سے چند میں ساتھ لے آیا تھا۔ اُس نے مجھ

سے کیا باتیں کی تھیں، سب ایک ساتھ جاننا نہیں چاہتا تھا۔ روز تھوڑی تھوڑی... عمرِ عزیز کے تجربوں کی طرح حاصل کرتا تھا یا اُس منجھے ہوئے شرابی کی طرح جو شامِ شفق میں ناپ کر جام میں انڈیل کر پیتا ہے۔ گھونٹ گھونٹ مزے لیتا ہے، اس کا جو پیتا جاتا ہے اور شاید اس بچی ہوئی کا بھی جو دوسرے دن یا آنے والے دنوں میں پیے گا۔

`کراچی کی ہوا نے افروز کی آواز کو چاروں طرف نشر کرنا شروع کیا تو میں نے ٹیپ دھیما اور دھیما کر دیا۔ خسیس شرابی کی طرح کہ یہ صرف میرے کانوں کے لیے تھا۔

''را کو کہتے ہیں ریکھب... گا، گندھار... ما، مدھم... پا پنچم... دھا، دھے وت اور نی نکھات...''

''یہ گانا راگ درگا میں ہے۔ چڑھتے ہوئے پانچ آروہی، سا... رے... ما... پا... دھا...''

میں نے گھڑی دیکھی۔ ٹیپ ریکارڈ بند کیا۔ دل میں شرمندہ سا ہوا کہ گانا ابھی شروع بھی نہ ہوا تھا مگر جنگ کی خبریں بھی تو بہت اہم ہوتی ہیں۔ شرمساری میں یا بے خیالی میں ٹیپ ریکارڈر سے ٹیپ نکال کر جیب میں ڈال لیا اور برج کی طرف چلا کہ خبریں سب کے ساتھ مل کر سنی جائیں تاکہ تبصرہ بھی ہو سکے۔ چیف انجینئر کے کیبن کے ساتھ سے گزرا تو ہلکی سی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ بلیک آؤٹ میں باہر ہر جگہ اندھیر تھا۔ میں اندر گیا تو اُس نے کہا، ''اس وقت کیسے؟''

''خبریں سن کر سونے کا پروگرام ہے...'' میں نے کہا۔

ابھی میری بات بمشکل ختم ہوئی تھی کہ خطرے کا الارم بجا... پھر ایک دھماکا ہوا جس سے اندازہ ہوا کہ جہاز پر حملہ ہوا ہے۔ چیف انجینئر کو پیغام ملا کہ جہاز کا انجن بند ہو گیا ہے اور اس میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ فوراً اُدھر روانہ ہوا اور میں اپنی ڈیوٹی کے مقام پر یعنی وارڈ روم میں آیا۔ خطرے کا الارم سنتے ہی میں نے لائف جیکٹ پہن لی تھی۔ جس وقت وارڈ روم میں آیا وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ایک دروازہ کھول کر جھانکنے کی کوشش کی کہ صورتِ حال دیکھوں۔ اس وقت تین سیلرز اندر آئے جو زخمی تھے۔ اُنھوں نے بتایا

کہ بہت لوگ زخمی ہوئے ہیں۔ وہ خود چلنے کے قابل تھے، اس لیے چل کر آ گئے۔ وہ اسی حصے میں آئے تھے جہاں میرا کیبن تھا۔ اگر میں چند منٹ پہلے وہاں سے نہ نکلا ہوتا تو شاید میں بھی زخمی ہوجاتا۔ میں نے اُن زخمیوں کی مرہم پٹی شروع کی، تیسرے آدمی کو ابتدائی طبی امداد دے رہا تھا کہ دوسرا دھماکا ہوا۔ اس دھماکے سے سارا جہاز بُری طرح ہل کر رہ گیا۔ زخمی کی مرہم پٹی کرنے کے بعد میں نے ایک دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ جکڑ گیا ہے اور کسی طرح نہیں کھل رہا۔ باقی دروازے دیکھے تو وہ اسی طرح بند تھے کہ کسی طرح نہیں کھل رہے تھے۔ دل پریشان ہوا اور لمحے بھر کو خیال آیا کہ اب جہاز کے ساتھ ہم بھی تہ میں اتر جائیں گے۔ پھر ہمت باندھ کر دوبارہ کوشش شروع کی۔ جو دروازہ ڈیک کی طرف کھلتا تھا، اُس کے ہینڈل کو الٹا گھمایا تو وہ کھل گیا۔ ہم تینوں باہر نکلے۔ سامنے جاوید نظر آیا، اس کی پتلون کا ایک پائنچا غائب تھا اور ٹانگ پر اچھا خاصا زخم تھا۔ میں اس کی مرہم پٹی کرنا چاہتا تھا مگر جہاز جل رہا تھا۔ کیپٹن کی طرف سے اعلان ہوچکا تھا کہ جہاز کو جلد سے جلد چھوڑ دیا جائے۔ جاوید لمحہ بھر بھی جہاز میں ٹھہرنے کو تیار نہ تھا، اُس نے کہا میں رافٹ میں جارہا ہوں، وہاں آکر مرہم پٹی کردینا۔ وہ پانی میں کود گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ جہاز بائیں طرف جھک رہا ہے۔ جہاز کے تیل، پینٹ اور جلتے ہوئے فرنیچر نے کچھ روشنی کر رکھی تھی۔ خیال آیا، سمندر میں کودنے کے بجائے کیوں نہ بائیں طرف چلا جائے۔ جب جہاز پانی کی سطح تک پہنچے گا تو خود بخود پانی میں اتر جاؤں گا۔ ابھی جہاز کے درمیان میں پہنچا تھا کہ ایک اور دھماکا ہوا۔ میں دو بڑے جنریٹر کے بیچ میں تھا ورنہ پرخچے اڑ جاتے۔ میں کاغذ کے پرزے کی طرح اڑا، ڈیک کے کنارے لگی رسی سے ٹکرایا اور بے ہوش ہوگیا۔

جب پورا جہاز پانی میں ڈوبا اور پانی کی چھینٹیں میرے چہرے پر پڑیں تو مجھے ہوش آیا۔ اس وقت جہاز کا کوئی ٹوٹا ہوا تختہ ہاتھ لگا اور میں نے تیل کی چکنائی ہٹاتے ہوئے اس کے سہارے جہاز سے دور جانے کی کوشش کی۔ اس وقت مجھے یہ خیال بھی آیا کہ نہ صرف اس وقت جلتے اور ڈوبتے ہوئے جہاز کے نزدیک رہنا خطرناک ہے بلکہ میں

Marfat.com

نے اس پر سے چھلانگ نہ لگانے اور اس کے ساتھ پانی میں اترنے کا ارادہ کر کے بھی غلطی کی تھی، اس طرح میں جہاز کے نیچے دب سکتا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ جہاز ٹیڑھا ہونے کے بجائے معجزانہ طور پر سیدھا پانی میں اتر گیا تھا... سو گز گیا ہوں گا کہ ایک لائف بوٹ نظر آئی جس میں جہاز کا کپتان اور کئی لوگ سوار تھے۔ لائف بوٹ ربر کی تھی اور کئی حصوں میں اس لیے بانٹی جاسکتی تھی کہ کہیں سوراخ ہو جائے تو ساری ہوا ایک ساتھ نہ نکل جائے۔ اس آٹھ حصوں میں بٹی ہوئی بوٹ کے آدھے حصے ناکارہ ہو چکے تھے۔ جاوید کو وہاں دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا... بوٹ میں جگہ نہیں تھی اور میں زخمی نہیں تھا، اس لیے تختے اور بوٹ کو پکڑ کر پانی میں ہی رہنے کو غنیمت جانا لیکن جاوید کو جو بوٹ کے کنارے کو پکڑے ہوئے تھا، کشتی والوں کی خوشامد کر کے میں نے لائف بوٹ میں بٹھا دیا۔ ابتدائی طبی مدد کے لیے سامان ہر بوٹ میں موجود ہوتا ہے، وہ طلب کیا تو معلوم ہوا کہ لائف بوٹ پھٹ جانے کی وجہ سے کھانے پینے کے پیکٹ اور ابتدائی طبی امداد کی ساری چیزیں بہہ چکی تھیں۔

جلتے جہاز کی روشنی میں کچھ لوگ ننگے نظر آئے۔ لوگ نائٹ سوٹ پہنے ہوئے تھے، دھماکے سے ان کے کپڑے اڑ گئے تھے۔ میرے فلیپ کندھوں پر نہیں تھے۔ زین کی پتلون پھٹ چکی تھی مگر جیب میں ٹیپ موجود تھا۔ پتلون کی جیب سے ٹیپ نکال کر میں نے قمیص کی جیب میں ڈالا۔ لائف بوٹ میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی مدد سے قمیص کی آستینیں پھاڑ کر جاوید کی مرہم پٹی کی، اُس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ مجھے اس کی شدید تکلیف کا احساس تھا مگر ایسی حالت میں سوائے جلد مدد آنے کی دعا کے اور میں کیا کر سکتا تھا۔ میں نے اُسے آنکھیں بند کر کے سو جانے کی تلقین کی اور دعا مانگتا رہا۔ کپتان نے بتایا تھا کہ پہلے حملے کے بعد ہی اس نے نیول ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دے دی تھی اور مدد آنے کی امید تھی۔

کوئی دو فرلانگ دور دوسری لائف بوٹ نظر آئی، وہ بھی کٹی پھٹی ہوگی۔ اس پر بھی ضرورت سے زیادہ لوگ سوار تھے اور بہت سے چاروں طرف چمٹے ہوئے تھے... جلتے

Marfat.com

ہوئے تیل کی روشنی میں یکایک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ سب میرے ساتھ نہیں ہو رہا۔ میں صرف دیکھ رہا ہوں... جیسے طوفانوں کی، ٹوٹی بادبانی کشتیوں اور ٹکڑے ٹکڑے جہازوں کی تصویریں مغربی آرٹسٹوں کی روغنی تصویروں میں دیکھی تھیں۔ یہ معروضی کیفیت بھی ایک طرح کا سیفٹی والو تھی یا کیا تھی کہ یہ کرب میرے لیے قابلِ برداشت بن گیا۔ یوں بھی مجھے دل سے یقین تھا کہ مدد ضرور آئے گی، صرف صبر کی ضرورت ہے۔ اسی صبر کی تلقین میں اوروں کو کرتا رہا۔ جب تک تیل جلتا رہا، روشنی رہی اس کے بعد اندھیرا چھا گیا... تاریک پانی میں وہ رات اُس وقت بھی ایک بھیانک خواب تھی اور آج بھی ہے... خصوصاً جب مجھے نفسا نفسی کا وہ عالم یاد آتا ہے کہ لوگ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر زخمیوں کو دھکیل کر پانی میں پھینک دیتے تھے۔ دو مرتبہ جاوید کو لائف بوٹ میں ڈالا اور دو مرتبہ وہ مجھے پانی میں ملا۔

''ابو، آپ کہاں غرق ہیں؟'' مینا کی آواز نے یکایک مجھے چونکا دیا... لفظ 'غرق' پر میں مسکرایا۔

''بحیرۂ عرب میں غرق تھا بیٹی...'' میں نے کہا۔ وہ شاید سمجھی نہیں۔

''اب نکل آیئے ناں۔'' اس نے ہنس کر کہا، ''گھر میں اتنا تو شور ہو رہا ہے اور آپ سو رہے ہیں۔ ابھی اتنی رات بھی نہیں ہوئی...''

''سو نہیں رہا... پرانی یادوں میں کھو رہا ہوں۔ تم بتاؤ، اپنی مہندی کے دن غریب ابو کو کیسے یاد کیا؟''

زرد کپڑوں میں پیلی پیلی مینا کا رنگ ایک دم گلابی ہو گیا۔ ''میری سہیلیاں پیچھے پڑی ہوئی ہیں کہ گانا گاؤ۔'' اس نے کہا۔

''تو گا دو...'' میں نے کہا۔ اس کی آواز ماں کی طرح میٹھی اور پیاری تھی۔ اسی لیے اس کا نام مینا پڑ گیا تھا۔ شاید اسی رعایت سے جاوید کی بیٹی طوطی کہلاتی۔ آج اُس کی مہندی کا دن بھی تھا، دونوں کی شادیاں ایک ہی دن ہو رہی تھیں۔

''مجھے معلوم ہے...'' مینا نے منہ بسورا۔ ''بعد میں میرا مذاق اڑائیں گی کہ اپنی

مہندی میں تم نے خود گایا تھا۔''

مجھے ہنسی آ گئی... میری بیٹی اتنی بھولی ہے کہ بعض اوقات سوچتا ہوں کہ وہ زندگی کی تلخیوں کو کیوں کر جھیلے گی... پھر اس کا ٹھنڈا مزاج اور صبر کی طاقت مجھے حوصلہ دیتی ہے۔ اس کے خلاف جاوید کی بیٹی طوطی سے میں ڈرتا ہوں... اس میں جاوید کا اضطرار اور اضطراب ہے... میں مرد ہوں اور جانتا ہوں کہ بیٹیوں میں یہ بے صبری کتنی خطرناک ہوسکتی ہے۔

''تو ابو میں کیا کروں؟'' مینا پگلی نے پوچھا۔

''یوں کرو...'' میں نے کہا، ''اس شرط پر گاؤ کہ طوطی بھی گائے گی... بعد میں تم کہہ سکو گی کہ تم نے اپنی شادی میں نہیں کزن کی شادی میں گایا تھا۔''

''اچھا ابو...'' بات مینا کی سمجھ میں آ گئی۔

وہ اپنا گوٹا لگا پلو جھلاتی جا رہی تھی کہ میں نے کہا، ''ذرا زور سے گانا تاکہ میں بھی سنوں، چچا غالب کہہ گئے ہیں:

بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات

سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر''

اس نے مسکرا کر پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر مسکراتی ہوئی چلی گئی۔ بیس اکیس سال ہی کی تو ہے۔ شادی کے نام سے خوش ہے۔ ذمہ داریوں کو ابھی نہیں جانتی۔ میں نے اسے کبھی نہیں بتایا کہ جہاز پر ہونے والے پہلے دھماکے سے ہی میرے دونوں کانوں کے پردے پھٹ گئے تھے۔ پانی میں تھا تب بھی کانوں میں درد ہو رہا تھا۔ بعد میں دوا دارو سے کسی حد تک بہتر ہوگئے مگر اب بھی اونچا سنتا ہوں۔ مینا بھولی بے چاری سمجھتی ہے، عمر کے ساتھ میری سماعت میں خلل آ رہا ہے۔ بہت عرصے تک افروز یہی سمجھتی رہی کہ میں اب اُس کے گانے پہلے کی طرح ذوق و شوق سے نہیں سنتا۔ آخر ایک دن میں نے اسے بتایا... اُس قیامت رات کا سارا حال سنایا اور دوسرے دن کا بھی۔

وہ صبح کیسی عجیب صبح تھی جب ہم بے یار و مددگار پانی کے سینے پر تیر رہے تھے

Marfat.com

لیکن تھکن سے ہمارا ریشہ ریشہ چُور تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ مر رہے تھے۔ خیال تھا کہ دس بجے تک مدد ضرور آجائے گی... بھوک اور پیاس کا احساس بھی شروع ہو چکا تھا... صبح ایک سیب تیرتا ہوا دکھائی دیا، ایک سیلر نے جلدی سے چھلانگ لگائی، اُس سیب کو پکڑا اور بے تابی سے کھانے لگا... ہم سب حسرت سے تکتے رہے... تھوڑی دیر بعد پانی کا ایک ڈبہ نظر آیا، وہ دوسرے شخص نے پکڑا مگر وہ اُس سے نہ کھلا۔ تب سب نے باری باری دانتوں سے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ اس ڈبے میں سوراخ ہو گیا تب جتنے لوگ پی سکے، سب نے ایک ایک گھونٹ پانی پیا۔ میں نے آخری گھونٹ جاوید کے لیے بچایا، چاروں طرف دیکھا، جاوید کہیں نہیں تھا۔ لوگوں سے پوچھا تو انھوں نے نگاہیں جھکالیں۔ پھر ایک نے کہا، تم نے سنا نہیں... وہ تمھیں خدا حافظ کہہ کر گیا ہے... اس نے کہا، ''میں اب مزید انتظار نہیں کر سکتا۔'' پھر اس نے اپنی جیکٹ اتار کر پانی میں کھڑے سیلر کو دی اور خود بلبلے چھوڑتا تہ میں چلا گیا۔''

پاؤں تلے زمین نہیں تھی پانی تھا... لگا جیسے وہ بھی نکلے جا رہا ہو... جاوید مجھے خدا حافظ کہہ کر چلا گیا، مجھے پتا بھی نہ چلا... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کب ہوا؟ میں دیکھتا تو کبھی ایسا نہ ہونے دیتا... کیا کسی کی سازش تھی؟ کیا جان بوجھ کر ایسے وقت گیا جب میں متوجہ نہ تھا؟ میں آج تک خود کو مجرم سمجھتا ہوں، حالاں کہ میں دل میں جانتا ہوں کہ اس کی طبیعت، اس کی شخصیت میں جو جلد بازی تھی، اس کی وجہ سے اس کی جان گئی۔ جاوید ہر کھیل میں ہر بازی جیتنا چاہتا تھا مگر شتابی سے۔ زندگی کی بازی وہ ہار گیا کیوں کہ یہ بازی جو مستقل مزاجی چاہتی تھی، وہ اس کا مزاج نہیں تھی۔ جن زخمیوں نے صبر سے کام لیا، وہ بچ گئے۔ کئی ہٹے کٹے صبر نہ کر سکے اور اسی طرح اپنی لائف جیکٹ دوسروں کو تھما کر بلبلے چھوڑتے تہ میں اتر گئے... جب تک امید رہتی، مرنے کی رفتار سست رہتی۔ جب آس ٹوٹنے لگتی، مرنے والوں کی رفتار تیز ہو جاتی۔

صبح مدد آنے کی آس ٹوٹی تو دوپہر کو خاصے لوگ ختم ہوئے۔ پھر دو بجے بہت دور ایک مرچنٹ جہاز نظر آیا۔ آس بندھی، لائف بوٹ میں باری باری آدمی کھڑے ہوتے

Marfat.com

اور قمیص لہراتے۔ ہر شخص اس یقین کے ساتھ قمیص ہلاتا کہ میں لہراؤں گا تو جہاز والے ضرور دیکھ لیں گے اور سب کو بچانے کا سہرا میرے سر بندھے گا۔ مگر جہاز والوں کو جو آشتی میں سفر کر رہے تھے، بیچ سمندر میں ڈوبنے والوں کا جھنڈا نظر نہ آیا اور جب جہاز ہمیں نظر آنا بند ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی تازہ آس بھی ڈوب گئی۔ جب تک جہاز دکھائی دیتا رہا اور اسے متوجہ کرنے کی کوشش ہوتی رہی کوئی شخص نہیں مرا، جیسے ہی وہ جہاز نگاہوں سے اوجھل ہوا پھر چند لوگ داغِ مفارقت دے گئے... میں خود سے کہتا رہا، میں کچھ نہیں کر سکتا مگر ہمت تو کر سکتا ہوں، دوسروں کو تسلی تو دے سکتا ہوں، اگر مرنا میری قسمت میں ہوتا تو میں پہلے ہی حملے میں اپنے کیبن میں مر سکتا تھا۔ مگر کسی نے مجھے خبریں سننے کے لیے اکسایا... دوسری بار اگر کیبن کا دروازہ نہ کھلتا تو میں جہاز کے ساتھ پانی میں چلا جاتا... کسی نے مجھے الٹا ہینڈل گھمانے کی تلقین کی۔ تیسری بار جب میں جہاز کے ساتھ پانی میں بے ہوشی کے عالم میں اترا تو آسانی سے جہاز کے نیچے آ کر کچل سکتا تھا... ایسا نہیں ہوا تو اب کہ ہوش و حواس قائم ہیں، مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ نیول ہیڈ کوارٹر کو معلوم ہے کہ ہمارے جہاز پر حملہ ہوا ہے اور وہ یقیناً ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے... اس یقین نے جو کہ میری غیر اضطراری فطرت کا، میری شخصیت کا حصہ تھا، مجھے زندہ رکھا... باوجود ان ساری کٹھنائیوں کے جن سے گھبرا کر دوسرے جی ہار بیٹھے۔

وہ سارا دن بھی پانی میں گزرا... کیسے گزرا، سوچتا ہوں تو اب بھی پریشانی کا احساس ہوتا ہے... کمرے میں بند ہو جانے کی بات یاد آتی ہے تو آج بھی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ اوپر اللہ اور آسمان تھا، نیچے پانی اور موت... میں نے اپنی نگاہیں، اپنا دل اوپر رکھا جیسے بہت زیادہ بلندی پر سے نیچے جھانکنے کو منع کیا جاتا ہے، میں نے نیچے ہونے پر بھی نیچے نہیں دیکھا۔

آخر رات کے دس بجے مدد آئی۔ میرا اندازہ یہی ہے جب کہ مدد کے لیے آنے والوں کا آج بھی یہ کہنا ہے کہ وہ مغرب کے وقت پہنچ گئے تھے۔ میرے لیے مغرب کا وقت بہت پہلے گزر چکا تھا... وقت کتنا اضافی ہو سکتا ہے، زندگی میں اس کا اندازہ سب ہی

Marfat.com

کو ہوتا ہے۔ اصل تھکن کا احساس اس وقت ہوا جب جہاز کی سیڑھیاں چڑھنی شروع کیں... ایک ایک قدم ایورسٹ کی چوٹی سر کرنے کے برابر تھا۔ سب ہی ڈیک پر جا کر مُردوں کی طرح پڑ گئے۔ کسی نے چادر دی کہ گیلے کپڑے اتار دو... وہیں لیٹے لیٹے کپڑے اتارے۔ پھر جہاز کے ڈاکٹر نے اپنی شلوار قمیص پہننے کو دی... میں جس وقت کپڑے پہن رہا تھا، ایک ہوائی جہاز اوپر سے گزرا... فوراً میرا ہاتھ لائف جیکٹ کی طرف بڑھا... پھر کسی نے بتایا کہ ہمارا اپنا جہاز ہے جو ہماری تلاش میں نکلا ہوا ہے۔

جس وقت ہوائی حملے کا خطرہ ہوتا یا راڈار میں کشتی نظر آتی، ہمارا جہاز کھڑا ہو جاتا۔ جہاز بھی کیا تھا بڑی کشتی سمجھیے جو چھوٹے موٹے کاموں کے لیے تھی... جہاز والے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور ہمیں بتا رہے تھے کہ رات کو گیارہ بجے فون ملا تھا مگر جہاز کا نام اور پوزیشن غلط ملی تھی۔ کوڈ ورڈ میں غلطی ہو جانے سے دیر ہوئی حالاں کہ وہ لوگ پندرہ منٹ کے اندر اندر مدد کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ بریک واٹر سے نکلے تو سامنے آگ کا گولا نظر آیا۔ سمجھے کہ یہی وہ جہاز ہے جس کے بچاؤ کو نکلے ہیں۔ نزدیک پہنچے تو جہاز کے ٹکڑے پورے پانی پر بکھرے ہوئے تھے اور جہاز جل رہا تھا۔ یہ دوسرا جہاز تھا مگر اس کے لوگوں کو بچانا بھی فرض تھا۔ زخمی اٹھائے، چند نعشیں بھی لیں اور پھر اس جگہ پہنچے جہاں کی پوزیشن لی تھی مگر وہاں کوئی جہاز نہ تھا۔ سوچا کہ شاید اتنی دیر میں تھوڑی دور نکل گیا۔ قاعدے کے مطابق مزید تلاش اسی علاقے میں جاری رکھی۔ ایک گھنٹے کی تلاش کے بعد بھی جب کوئی سراغ نہ ملا تو واپس کنارے ہو گئے۔ وہاں زخمیوں کو چھوڑا، پھر اپنے ساتھ مزید ڈاکٹر، دوائیں اور کمبل لیے، ڈاک یارڈ سگنل بھیجا کہ جہاں سے وہ زخمی اٹھا کر لائے ہیں، وہاں مزید تلاش جاری رکھیں اور یہ بھی ہماری تلاش میں نکلے۔ اس وقت صحیح نام اور جگہ کی اطلاع ہوئی اور تب یہ اندازہ لگایا کہ رات کے لائف بوٹوں میں نکلے لوگ اس وقت کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ خاصا علاقہ چھانا، سارا دن لگ گیا، تب کہیں ہم لوگ دکھائی دیے جو سب کشتیوں کو ایک جگہ رکھنے اور اکٹھے رہنے کی کوشش کر رہے تھے کہ دوسروں کی موجودگی میں حوصلہ رہے... پہلے زندوں کو اٹھایا۔ پھر نعشیں جتنی ملیں، وہ نکالیں

Marfat.com

اور کنارے کا رخ کیا۔

میں نے یہ سب باتیں تھوڑی تھوڑی کر کے بعد میں سنیں۔ میں ڈیک پر لیٹے ہوئے یہی سوچتا رہا کہ میں جاوید کے بغیر گھر پہنچوں گا تو افروز کو کیا منھ دکھاؤں گا اور جاوید کی نئی نویلی دُلہن جو امید سے ہے، مجھ سے پوچھ بیٹھی تو اس سے کیا کہوں گا؟

افروز نے اور جاوید کی بیوی نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا... اُن کے لیے میرا بچ جانا ہی بہت بڑی بات تھی لیکن مجھے آج تک یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جاوید کی موت میں میرا ہاتھ ہو یا خود زندہ رہ کر میں نے اُس کے ساتھ زیادتی کی ہو۔ عجیب بات ہے کہ اس وقت جب کہ چاروں طرف لوگ مر رہے تھے، حقیقت میں مر رہے تھے... میرا سالا، میرا دوست تہ میں ڈوب چکا تھا۔ میرے جی کو یقین نہیں تھا کہ شاید نہ مر رہے ہوں، شاید سب کچھ خواب ہو، زندگی میں بُرے خواب بھی تو نظر آتے ہیں اور جس وقت دکھائی دیتے ہیں تو کیسے اصلی لگتے ہیں کہ انسان بالکل بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کبھی کبھی میں افروز کا وہ ٹیپ بھی سنتا ہوں جو سمندر میں پتلون کی جیب سے نکال کر قمیص کی جیب میں دل کے پاس رکھ لیا تھا۔ سیلن سے وہ ٹیپ خراب ہو گیا ہے۔ اب اس میں سے سسکیوں کی سی آواز آتی ہے... کئی جگہ سے مٹ گیا ہے، جیسے افروز خاموش ہو گئی ہو۔ پھر کہیں سے خود بخود بجنے لگتا ہے۔

افروز ہمارے دوسرے بچے کی پیدائش میں ختم ہو گئی۔ اس کی موت کے بعد سے اس کے سارے ٹیپ مجھے بے حد عزیز ہو گئے۔ مرتے وقت اُس نے کہا تھا، ''آج سے آپ مینا کی ماں اور باپ دونوں ہیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ طوطی کی ماں نے مینا کی ماں بن کر دکھایا۔ میں طوطی کے باپ کی جگہ رہا۔ یوں ہم دونوں نے مل جل کر دونوں بیٹیوں کو پالا۔

آج رات جب یہ ہنگامہ فرو ہوگا، مہمان رخصت ہو جائیں گے تو میں مینا اور طوطی کو افروز کی آواز کا بھرا ہوا ایک ایک ٹیپ دوں گا تا کہ مشکل وقت میں وہ اسے سنیں اور آسودہ ہوں، جیسے میں پچھلے بیس سال سے ہو رہا ہوں۔ آواز کا ٹیپ ان کو دینے کے

Marfat.com

بعد بھی میرا ٹیپ میرے پاس رہے گا جیسے زندگی اور جین کا ورثہ... کہ آپ کے پاس بھی ہوتا ہے اور دوسری نسلوں کو بھی منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ میری بیوی نے میٹھی آواز اپنے کسی پُرکھے سے پائی اور اپنی بیٹی کو دی... میری بیٹی اپنے بچوں کو دے گی... یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ میری بیٹی نے میرا قد، میرے کتابی چہرے کے ساتھ میرا ٹھنڈا مزاج بھی لیا ہے لیکن طوطی میں اپنے باپ کی بے چینی ہے...سوچتا ہوں زندگی اس کے لیے آئندہ چل کر تکلیف دہ ہوگی مگر اس ورثے کی تلافی میں کیوں کروں! کیا اس کے باپ کی کہانی اُسے سنا دوں؟ مگر کہانیوں سے کیا ہوتا ہے... انسان کہانیوں سے بدل جاتے تو زندگی کتنی آسان ہوتی... اندر کی خصلتیں جو انسان ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے، اس کی زندگی کس حد تک بناتی اور بگاڑتی ہیں، اس کا ادراک کتنے لوگوں کو ہے!...لوگ سمجھتے ہیں وہ قادر ہیں مگر دراصل نہیں ہیں۔ اندر کی خصلتوں کی حد تک نہیں ہیں... جبر و قدر کا مسئلہ میرے نزدیک یہی ہے، تدبیر اور تقدیر کا جھگڑا بھی یہی ہے... طوطی کو صبر چاہیے اور مستقل مزاجی کہ وہ عورت ہے اور پاکستان میں پیدا ہوئی ہے مگر اس میں اپنے باپ کی بے صبری ہے۔ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں ہے۔ میں اسے جاوید کی کہانی سنا ہی دیتا ہوں شاید طوطی کو خود پر قابو رکھنے میں اس سے کچھ مدد ملے۔

لوگ رخصت ہو رہے ہیں۔ میں اب ان کے کمرے میں جاتا ہوں... جاتا تو ہوں پر دیکھیے کیا کہتا ہوں۔

تمغا

اُس نے دس بارہ سال سے کچھ نہیں لکھا تھا لیکن اطمینان تھا کہ ادب کے کوچے کے لوگ اسے بھولے نہیں ہیں، کیوں کہ ادبی تقریبات کے دعوت نامے برابر اس کے پاس آتے تھے۔

ایک دن اپنے ایک ایسے دوست کی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں جارہا تھا جو کھاتا پیتا تھا۔ تقریب ایک اچھے ہوٹل میں تھی اور امید تھی کہ پرانے دوستوں سے ملاقات ہونے کے علاوہ اچھا وقت گزر جائے گا۔ وہ اپنے جوتے چمکا کر باہر نکلنے ہی والا تھا کہ ایک اجنبی شخص کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ اپنے سونے کے کمرے میں اس طرح بلا اجازت کسی اجنبی کو آتے دیکھ کر اسے اچنبھا ہوا۔

''تم کون ہو، اور بغیر دستک دیے کیسے اندر چلے آرہے ہو؟'' اس نے چمک کر کہا۔

''مجھے پہچاننے کی کوشش کرو۔'' اجنبی بے تکلفی سے بولا۔

ادیب نے غور سے اسے دیکھا، مگر ذرا بھی نہ پہچان سکا۔ قدرے محتاط ہو کر اس نے پوچھا، ''کیا آپ پہلے بھی میرے ہاں آئے ہیں؟''

''آتے ہیں، کیا مطلب؟'' اجنبی بولا۔ ''میں آتا تھا اور دن میں کئی کئی مرتبہ۔''

''اسی طرح بے روک ٹوک؟'' ادیب حیران ہوا۔

''بالکل...''

''نہیں... میرے ہاں تو کبھی کوئی بغیر دستک دیے، بلا اجازت نہیں آتا۔''

''یاد کرو۔'' اجنبی نے طنز سے کہا، ''جب تمھارے یہ ٹھاٹھ باٹھ نہ تھے تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جو تمھارے ہاں بے روک ٹوک نہ آتا ہو اور تم اس کے آنے پر خوش نہ ہوتے ہو۔''

''مجھے یاد نہیں پڑتا۔'' ادیب نے ذہن پر زور دیا، ''کیا تم ہمیشہ اسی طرح میرے سونے کے کمرے میں چلے آتے تھے؟''

''ہاں... بیڈ روم میں، لکھنے کے کمرے میں، غسل خانے میں... ہر جگہ، ہر وقت۔''

''ناممکن!'' ادیب نے زور دے کر کہا، ''میرے ہاں کبھی بھی کوئی اس طرح نہیں آسکتا۔''

''میں آیا کرتا تھا، تمھارے خلوت کدے میں بھی، اور تم میرا استقبال کرتے تھے، تمھاری بیوی اس بات پر جھنجلاتی تھی، یاد کرو۔''

''مجھے یاد نہیں، کیا میرا حافظہ اتنا کمزور ہوگیا ہے!!''

''حافظہ بھی سوٹ کیس کی طرح ہوتا ہے دوست! اس کی گنجائش لامحدود نہیں ہوتی۔ اگر منھ تک بھر جائے اور آدمی پھر بھی کچھ رکھنا چاہے تو کچھ نہ کچھ نکالنا پڑتا ہے۔ تم نے نکالنے کے لیے غلط چیزوں کا انتخاب کیا۔ حافظے کو کاٹھ کباڑ سے بھر لینا اور مفید چیزوں کو نکال پھینکنا نادانی ہی تو ہے...''

''تمھاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔'' ادیب نے کہا۔

''پہلے تو خوب سمجھ میں آجاتی تھیں۔'' اجنبی نے کہا، ''اچھا، ایک بات پر غور کرو، نامعلوم علم کو چھوڑو... معلوم علم میں جو ہزاروں لاکھوں کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا کتنا فی صد ایک نہایت عالم اور قابل شخص اپنے ذہن میں رکھ سکتا ہے۔ بہت ہی کم نا!... تو پھر کوئی بھی شخص اپنے علم پر یا حافظے پر فخر کیسے کرسکتا ہے؟''

Marfat.com

''تم مجھے الجھا رہے ہو، میں اس وقت باہر جارہا تھا۔''

''کل حاضر ہوسکتا ہوں؟''

''نہیں، کل میں سیر وتفریح کے لیے لمبی چھٹی پر جارہا ہوں، اسے غارت کرنا نہیں چاہتا۔''

''اوہ...'' اجنبی نے مایوسی سے کہا، ''کبھی تم نے سوچا کہ انسان سیر وتفریح کا، نئی چیزیں اور نئی جگہیں دیکھنے کا کتنا دل دادہ ہے لیکن اس کے اندر جو سات عجائب ہیں، ان سے سرسری گزر جاتا ہے۔ ان میں سے پانچ کو وہ حواسِ خمسہ کہتا ہے لیکن وہ نہایت اہم قوتوں کی طاقت کونہیں جانتا۔ اپنی قوتِ فکر اور قوتِ ارادی کو اہمیت نہیں دیتا حالاں کہ اگر ان قوتوں کو بڑھا لے تو وہ چھٹی حس پیدا ہوجائے جس سے آدمی ''سپرمین'' بن جاتا ہے۔ آنے والے زمانوں کو جان سکتا ہے اور قدرت کو مٹھی میں لے سکتا ہے۔ وہ سات آسمانوں، سات سمندروں، سات ستاروں اور سات عجائب میں الجھا رہتا ہے لیکن اپنے ذہن کے سات تختوں میں اترنے کی کوشش نہیں کرتا۔''

''تم مجھے باتوں میں الجھا کر کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہو؟ صاف صاف بتاؤ تم کیوں آئے ہو؟''

''واقعی مجھے نہیں آنا چاہیے تھا، میں نے غلطی کی۔ سوچا، مدت ہوگئی چلو ایک مرتبہ اور آزمائے لیتے ہیں۔'' اجنبی نے کہا۔

''بڑی عنایت آپ کی۔'' ادیب طنز سے بولا، ''لیکن جناب کو یہ وہم کیوں تھا کہ میں بے چینی سے آپ کا منتظر ہوں گا اور آپ کو دیکھتے ہی شادیِ مرگ میں مبتلا ہوجاؤں گا۔ کیا آپ میری یک طرفہ محبت میں گرفتار ہیں؟''

''جی نہیں، آپ گرفتار تھے، آپ کا والہانہ عشق دیکھ کر ہی میں آپ کے پاس آیا کرتا تھا۔''

''تم ضرور پاگل ہو۔'' ادیب نے غصے سے کہا، ''میری بیوی تمھاری باتیں سن لے تو نہ جانے کیا سمجھے۔''

''جس وقت کی بات میں کر رہا ہوں، اس وقت تم اپنی بیوی سے اتنا نہیں ڈرتے تھے۔''

''تم بار بار یہ جتانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو کہ میرے اور بیوی کے ذاتی تعلقات کے بارے میں بھی جانتے ہو۔''

''اس لیے کہ میں تخلیے میں بھی حاضر ہوا ہوں اور تم نے مجھے دھتکارا نہیں ہے، ہاں تھوڑی دیر انتظار کی زحمت ضروری ہے۔''

''اب تم حد سے بڑھ رہے ہو!'' ادیب غرایا۔

''مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب تمھیں میری ضرورت نہیں ہے۔ اب تم معقول اور متمول شخصیت ہو۔ تمھاری قدریں بدل گئی ہیں۔ اب صرف وہ لوگ تمھارے لیے قابلِ اعتنا ہیں جو گھنٹی بجا کر آئیں، جن کے لیے ٹرالی بھر بھر ناشتے کا انتظام ہو اور جو سیاست میں تجارت اور تجارت میں سیاست کی باتیں کریں...تم یقیناً میرے بغیر بھی خوش ہو۔''

''میں نے کبھی تمھاری کمی محسوس نہیں کی، جب کروں گا تو اطلاع دوں گا، اب تم جاسکتے ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ تم مجھے بیوقوف بنا کر جو کچھ اینٹھنا چاہتے تھے، وہ نہ اینٹھ سکے۔''

''میں کچھ لینے نہیں دینے آیا تھا۔'' اجنبی نے بگڑ کر کہا، ''جب بھی آیا کچھ دے کر ہی گیا۔ تم نہایت محسن کش نکلے۔''

''آہا...'' ادیب نے طنز کو مزاح میں ڈھالا۔ ''آپ میرے ہاں تشریف لاتے رہے، میں آپ کی خاطریں کرتا رہا، بڑھاوے دیتا رہا۔ آپ ہر دفعہ مجھے کچھ دے کر گئے ...نہیں دوست ایسا کبھی نہیں ہوا۔''

''تم نہ مانو تو اور بات ہے۔'' اجنبی نے دکھ سے کہا۔

''یہ ہوسکتا ہے کہ یہ سب تم نے کسی اور کے ساتھ کیا ہو اور آج کسی اور کے دھوکے میں میرے پاس آگئے ہو۔''

Marfat.com

''تو پھر میں جاؤں...اجازت ہے؟'' اجنبی بولا۔

''ضرور... جاؤ اور پھر کبھی نہ آنے کے لیے...مگر جانے سے پہلے اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔''

''میرا نام ہے تخیل، آئیڈیا، نیا خیال... جسے تم ہمیشہ تازہ ہوا کا جھونکا کہا کرتے تھے اور جب بھی میں آتا تھا، نہال ہوجاتے تھے...اب پہچانے؟''

''ہاں یار.. بڑی غلطی ہوئی۔'' ادیب نے پشیمانی سے کہا۔

''میں ہمیشہ نئے نئے روپ میں تمھارے پاس آتا تھا اور تم ہمیشہ پہچان لیتے تھے۔'' اجنبی بولا۔

''واقعی...'' ادیب نے دکھ بھرے لہجے میں کہا، ''کتنی عجیب بات ہے کہ آج میں تمھیں نہیں پہچانا، مگر تم بھی تو برسوں بعد آئے ہو، شاید دس بارہ سال بعد؟''

''نہیں، میں کئی بار آیا مگر تم اتنے مصروف تھے کہ رخ دے کر بات نہیں کی، مایوس ہوکر لوٹ گیا۔''

''تم کہہ رہے تھے کہ تم مجھے کچھ دینے آئے تھے؟''

''ہاں، پہلے اچھوتے اور نئے خیال دیکھتے ہی تم باغ باغ ہوجاتے تھے مگر اب تمھیں ان کی ضرورت نہیں، میں نے سوچا کہ تمھیں تمھارے مطلب کی بات بتا دی جائے۔ آخر ماضی میں تم نے بھی کچھ کام کیا ہے۔''

''کیا ہے میرے مطلب کی بات؟''

''تمھیں معلوم ہے سال میں دو فصلوں کی طرح تمغوں کے بھی دو موسم ہوتے ہیں۔ آج یہی موسم ہے۔ ایسے میں اکثر لوگ اور کوئی کام نہیں کرتے صرف یہی تمغے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ تمھارے لیے بھی یہ کوشش کرلی جاتی، مگر تم جلدی میں ہو...''

''نہیں...'' ادیب نے مسکراتے ہوئے کہا، ''اب اتنی جلدی بھی نہیں۔ بتاؤ تمغے کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں؟''

Marfat.com

''چل سکتے ہو تو میرے ساتھ چلے چلو...''

''ضرور...'' ادیب نے کہا۔

جس وقت وہ دونوں ''تمغا چوک'' میں پہنچے، بارش ہو رہی تھی، مگر وہاں کی چہل پہل بتا رہی تھی کہ خراب موسم کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں۔

''دیکھو... وہ تمغے کا درخت ہے، اس پر سارے تمغے لٹکے ہوئے ہیں اور لوگ بساط بھر کوشش کر رہے ہیں۔'' اجنبی نے کہا۔

''مگر یہ تو ممنوعہ علاقے میں ہے، چاروں طرف کٹہرہ ہے، سنتری بھی کھڑے ہیں۔ خاصا مشکل کام معلوم ہوتا ہے۔'' ادیب نے کہا۔

''پھر بھی دیکھو کتنے لوگ پہنچے ہوئے ہیں اور بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہے ہیں۔ کوئی چھت پر سے کوشش کر رہا ہے، کوئی ٹہنی جھکا رہا ہے، کوئی بانس اٹھا لایا ہے، جن کے قد چھوٹے ہیں، وہ دوسروں کے کندھوں پر کھڑے ہوگئے ہیں۔''

''یہ اپنے قد بڑھنے تک انتظار کیوں نہیں کر لیتے؟''

''اس لیے کہ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ درخت اس وقت ہوگا یا نہیں۔ اس کٹہرے کی کنجی اس وقت کس کے پاس ہوگی؟ انھوں نے تو آج کے سنتری سے جان پہچان بڑھائی ہے۔ آج جو رعایت ملی ہے کل ملے نہ ملے۔'' اجنبی بولا، ''اور پھر ان بے چاروں کو اپنے قد بڑھنے کی امید ہی کب ہے!''

''تو پھر ہمیں جلدی کرنی چاہیے، درخت پر بہت کم تمغے رہ گئے ہیں۔'' ادیب گھبرا کر بولا۔

''تم فکر نہ کرو... ایک تمغا کسی کے لیے رکھوایا گیا تھا مگر اس شخص کو اس میں دلچسپی نہیں ہے۔ ہم سنتری سے مانگے لیتے ہیں، اس بے چارے کو تو ڈھنگ سے نام بھی نہیں آتے۔ تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی آتا ہوں۔''

چند منٹ بعد اجنبی کٹہرے میں تھا۔ اس نے وہیں سے اخبار میں چھپا ہوا ڈبا ادیب کی طرف بڑھایا۔

Marfat.com

''لو، یہ سنبھالو اور چلتے بنو۔''

''تم نہیں آ رہے؟'' ادیب نے اخبار میں چھپائے ڈبے کو دل سے لگائے لگائے پوچھا۔

''نہیں، یہ میری تمھاری آخری ملاقات ہے۔ خدا حافظ، تمغا مبارک۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی دوست۔'' ادیب نے شکایتاً کہا۔

''حقیقت کو مانو...'' اجنبی نے کہا، ''اب تمھیں میری ضرورت نہیں۔ میں آیا بھی تو تم پہچان نہ سکو گے، تمھاری پہچان کی حِس ہی مر گئی ہے، مگر آج یوں ہی خیال آیا کہ یہ تمغا تمھارا حق ہے، کیوں کہ یہ ایسے ہی لکھنے والوں کو پیش کیا جاتا ہے جنھوں نے کم از کم دس بارہ سال سے کوئی نیا خیال پیش نہ کیا ہو...''

Marfat.com

ایجاد

اس کے لیے یہ ایک لمبی رات کی صبح تھی، اور آج وہ بے حد خوش تھا۔ حصولِ تمنا انسان کے دل کو کتنا گداز کر دیتی ہے۔ اینی سے شادی کے بعد آج پہلی مرتبہ اس پر یہ کیفیت طاری ہوئی تھی۔ آج اتنے دن بعد پھر اُس کا دل چاہتا تھا کہ دنیا کے سارے گناہ بخش دے، راہ چلتوں سے لپٹ جائے، پنجروں کے سارے پرندوں کو چھوڑ دے اور قید خانے کے در کھول کر کہے، ''قیدیو! جاؤ اب تم آزاد ہو۔'' ہاں واقعی جب بادشاہ کسی بات پر بے حد خوش ہوتے تھے تو جیلوں کے دروازے کھول دیتے تھے اور قیدیوں کو آزاد کر دیتے تھے۔ شاید ہر شخص پر خوشی کا اثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اُس کی زندگی میں بھی پرانے بادشاہوں کی طرح یہ خوشی کے لمحے کم کم آتے تھے۔

وہ لپکا ہوا ماں کے کمرے میں در آیا۔ ماہر سائنس داں ہوتے ہوئے بھی ماں کے لیے تو وہ بچہ ہی تھا اور اس وقت اُس کی حرکتیں بھی بچوں کی سی تھیں۔ اس کی باچھیں یوں کھلی ہوئی تھیں جیسے کسی بچے کو اپنا دل پسند ماموں ابھی ابھی گلی کے موڑ پر نظر آیا ہو اور وہ ماں کو اطلاع دینے کے بعد فوراً ممتا کی گود میں چڑھنے کو پلٹ جانے والا ہو۔ اس کے ہاتھ میں تھرما میٹر سے ملتی جلتی کوئی چیز تھی، ماں اسے تھرما میٹر ہی سمجھی

کیوں کہ اُس کے اندر پارہ تھا اور اوپر بہت سے نمبر لکھے ہوئے تھے۔ اس کے گال فرطِ جوش سے سرخ ہو رہے تھے اور آنکھوں سے خوشی کے شرارے جھڑ رہے تھے، ان آنکھوں سے جو ایک مدت سے موٹر شیشوں کے پیچھے سوئی سوئی نظر آتی تھیں، ماں نے برسوں سے بیٹے کو اتنا خوش نہ دیکھا تھا۔ زمانہ گزر گیا تھا کہ جوان ہوتے ہوئے بھی اس کے چہرے پر ایک روکھاوٹ، ایک سوچ سی چھائی رہتی تھی۔ ماں سے بات کرتے ہوئے بھی وہ کھویا کھویا رہتا تھا اور کئی دفعہ سچ مچ روایتی پروفیسروں اور سائنس دانوں کی سی حرکتیں کر جاتا تھا۔ بات کو ادھورا چھوڑ کر چل دینا، بغیر کھانا کھائے یہ سمجھ لینا کہ کھانا کھا چکا ہے اور کھانا کھا کر تھوڑی دیر بعد دوبارہ مانگ لینا۔ یہ باتیں تو اُس کی شخصیت کا جزو ہوگئی تھیں۔ اگر چند دن یوں نہ ہوتا تو ماں کو تعجب ہونے لگتا۔ آج بیٹے کو اتنا خوش دیکھ کر ماں بھی کھل اٹھی، مگر اس سے پیش تر کہ وہ کچھ کہتی، بیٹے نے کہا، ''ماں، جلدی سے منھ کھولو۔'' بیٹے کی خوشی کی خاطر ماں نے منھ کھول دیا اور بیٹے نے وہ چیز جو تھرمامیٹر سے ملتی جلتی تھی، اس کے منھ میں ٹھونس دی اور پھر کرسی پر بیٹھ کر یوں اس کی طرف دیکھنے لگا جیسے کوئی منا سا بچہ مداری کی ٹوپی میں سے نکلنے والے کبوتر کا انتظار کرتا ہے۔ کبھی وہ گھڑی کو دیکھتا، کبھی ماں کے چہرے پر نگاہ ڈالتا۔ ایک منٹ گھنٹوں ہوئے جارہے تھے۔ وہ ماں کے چہرے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے پاس رہتے ہوئے اس نے کبھی نہیں دیکھا کہ ماں کے چہرے پر بڑھاپے کے اثرات اتنے گہرے ہوگئے ہیں۔ اُف! واقعی اس کی بے خبری مجرمانہ تھی۔ اتنی پیاری، اتنی محبت کرنے والی ماں سے یہ بے اعتنائی۔ اس کی ماں تو اس پر دل و جان سے فدا تھی اور وہ خود احسان فراموش اور ناکردہ کار۔ لیکن اب وہ اس زیادتی کی تلافی کردے گا۔ اب اسے فرصت ہے۔ آج ہی وہ ماں کو اس کی سہیلیوں سے ملانے لے جائے گا جن سے ملنے کو کیسی کلپتی تڑپتی رہتی ہے، مگر دوری کی وجہ سے تنہا نہیں جاسکتی اور کوئی اسے لے کر نہیں جاتا۔ ہائے ماں تم کتنی عظیم، کتنی پیاری اور کتنی قابلِ احترام ہو مگر ٹھہرو وقت ہوگیا ہے، ایک منٹ گزر چکا تھا۔ اس نے ماں کے منھ سے نلکی نکال لی اور روشنی کی طرف کرکے اسے غور سے دیکھنے

Marfat.com

لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر وہی سائنس دانوں والی سنجیدگی لوٹ آئی تھی اور ماں برسوں بعد چونچال ہونے والے بچے کو اتنی جلدی بدلتے دیکھ کر افسردہ ہو چلی تھی۔ میٹر کو پڑھتے ہوئے اس کے چہرے پر افسردگی اور پیشانی کی سلوٹیں گہری ہوگئیں۔

''کیا بخار ہے؟'' ماں نے تشویش سے پوچھا۔

''ہاں! مگر اتنا نہیں جتنا میں نے سوچا تھا۔ جتنا میں نے سوچا تھا۔'' بڑبڑاتا ہوا وہ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گیا۔

''پگلا۔'' ماں نے کہا۔

اب اس کا پیچھا کرنا بے سود تھا۔ وہ الھڑ بچے سے پھر سائنس داں بن چکا تھا اور اس کا ذہن اس کے خیالوں سے پھیر دینا جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ بچے ایک دفعہ بڑھ جاتے ہیں تو ماں باپ سے کتنی دور چلے جاتے ہیں۔ ماں دکھ سے سوچتی رہ گئی۔

ماں کا خیال تھا کہ وہ سیدھا لیبارٹری کا رخ کرے گا، مگر وہ اپنے والد کی لائبریری میں جا پہنچا تھا، جہاں اس کے والد موٹی سی ایک کتاب میں غرق تھے۔

''ابا! میں ذرا... میں ذرا...'' نگاہیں اٹھا کر اُنھوں نے دیکھا۔ بیٹے کو دیکھ کر وہ ذرا سا مسکرائے۔ اس کے ہاتھ میں تھرما میٹر جیسی کوئی چیز دیکھ کر وہ بولے:

''مجھ پر تجربہ کرنے کا ارادہ ہے کچھ؟''

''ذرا یہ منہ میں رکھیے گا ایک منٹ۔'' اس نے لجاجت سے کہا۔

''کیوں نہیں ضرور، لاؤ۔'' اُنھوں نے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ منہ کھولیے، میں خود رکھوں گا۔''

''یہ بھی ضروری ہے؟''

''جی ہاں۔''

باپ نے منہ کھول دیا اور بیٹے نے نلکی اُن کے منہ میں لگا کر گھڑی اور کبھی ان کے چہرے کا معائنہ شروع کر دیا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے نامعلوم کب باپ کا چہرہ

Marfat.com

جھریوں سے اس قدر لپ گیا تھا، اس نے تو کبھی اس بات پر غور ہی نہیں کیا۔ ان کی آنکھیں پہلے کے مقابلے میں کتنی دھند لاگئی تھیں، وہ تو اس چہرے کو بالکل بھولا ہوا تھا، اس حد تک کہ ایک دن کسی ضروری کام سے وہ لیبارٹری میں آئے تو چیزوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے اس نے بے دلی سے اُن کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنے حسابوں بڑے خلوص سے کہا تھا، ''میرا خیال ہے ہم پہلے بھی کہیں ملے ہیں۔'' اس بات پر باپ بگڑ کر فوراً واپس آگئے تھے۔ بعد میں وہ بہت شرمندہ ہوا تھا، گھر آکر اس نے معافی بھی مانگی تھی کہ کام میں مشغول ہونے کے سبب اس نے ان کی طرف اچھی طرح دیکھا نہیں تھا۔ مگر واقعی میں کس قدر حماقت کی تھی اس نے۔ باپ کے دل پر کیا بیتی ہوگی۔ اب وہ اس حماقت کی بھی تلافی کردے گا۔ وہ ساری باتیں جو باپ اس سے کرنا چاہتا تھا اور جن کے لیے اس کے پاس وقت نہ تھا، سنے گا۔ سنے گا اور ہاں میں ہاں ملائے گا کہ بوڑھے باپوں کو اس بات کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ جوان بچے اُن کی ہر بات پر آمنا و صدقنا کہیں۔ یہ بوڑھا مہربان چہرہ، یہ گھنی بھنویں، یہ مروّت بھری مسکراہٹ، محبت بھری آنکھیں۔ حد ہے اس کے احمق پن کی۔ واقعی، کہیں یہ چہرہ بھی بھلایا جاسکتا ہے... ایک منٹ ہو چکا تھا۔ اس نے آلہ نکالا، اسے دیکھا اور بغیر باپ کی طرف دیکھے باہر نکل گیا۔

کتنا محسوس کرتا ہے اپنی ناکامی کو یہ لڑکا، اگر کچھ کسر رہ بھی گئی تو کیا ہوگیا، مجھ سے بات تو کرتا۔ موسم کی بات، اپنے نئے تجربے کی بات، مگر نہیں یہ تو اپنے کام کے پیچھے پاگل ہوا پھرتا ہے پاگل۔

سائنس داں اب سیدھا اپنی بیوی کے کمرے میں پہنچا۔

''بھئی، کہاں ہو تم؟''

''یہ رہی، کیوں؟'' وہ شاید الماری کی صفائی کر رہی تھی، ہاتھ میلے تھے، بے شمار چیزیں فرش پر اور میزوں پر بکھری ہوئی تھیں۔

''منہ کھولو ذرا۔''

''خیریت!'' مگر دوسری بات کہنے سے پہلے شیشے کی نلکی اس کے منہ کو بند

Marfat.com

کر چکی تھی۔

''گن گن گن؟'' اس نے ہاتھ نچا کر پوچھا کہ یہ کیا چکر ہے مگر اس کا شوہر تو اس وقت کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ وہ اس کے چہرے کو بڑی محویت سے تک رہا تھا۔ اس نے اس دل کش چہرے کے ساتھ کتنی زیادتی کی تھی۔ اس کے لیے بھی اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ کبھی کسی دوست کے ساتھ پکچر چلی جاتی، کبھی دل مار کر بیٹھ رہتی مگر بے چاری حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتی، کبھی لاتی بھی تو کیسے میٹھے انداز میں جیسے شکوہ نہیں کر رہی، اُس کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہو۔ پھر گھر کی ساری ذمہ داری، بچوں کی تربیت کیسی خوش اسلوبی سے سنبھال لی تھی۔ یہ سب اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے شوہر سے بے انتہا محبت تھی، بے حد و بے حساب، مگر اس نے اس عورت کو کیا دیا تھا، لاتعلقی اور رُکھائی... اب یقیناً وہ اس کی تلافی کر دے گا۔ اپنی کوتاہی اور لاپروائی کے بدلے اب وہ اسے کسی پہاڑ پر لے جائے گا جہاں وہ دونوں آزاد پرندوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ پھر اینی کو اس سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ خلافِ عادت اس کو یوں اپنی طرف دیکھتے پا کر اینی گھبرا گئی اور مسکرا کر ہاتھ نچایا گویا مجھے بخار نہیں ہے۔ وہ مسکرایا اور گھڑی پر نظریں جما دیں۔ اینی نے تنگ آ کر بے چینی سے اسے اپنے ہاتھ دکھائے اور الماری کی طرف اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو ''یہ کیا فضول کا کھڑاک ہے، ہٹاؤ، مجھے کام کرنا ہے۔'' ہر عورت کے لیے شوہر کی بڑی سے بڑی سائنسی ایجاد کے مقابلے میں اس کا اپنا کام زیادہ اہم ہوتا ہے۔ الماری کی صفائی کے بعد اسے منّے کے کپڑے بھی دھونے تھے۔

''منہ کھولو۔'' اور جس وقت اس نے نلکی منہ سے نکالی، وہ اس کی گردن میں جھول گئی۔

''کیا ان فضول چکروں میں پڑے رہتے ہو، کبھی ہمارے لیے وقت نہیں ہے، تمھارے پاس۔'' اس نے لہجے کی مٹھاس سے شکوے کے بِس میں رس گھول کر کہا۔ شوہر نے اسے میٹھی نظروں سے دیکھا اور پھر آلے پر نگاہیں گاڑ دیں۔ دفعتاً وہ چلا اٹھا۔

Marfat.com

"جھوٹ... سب جھوٹ... افوہ، کیا دھوکا ہے زندگیوں میں۔ حد ہے، حد ہے... کیا فائدہ ہے... کیا فائدہ ہے جینے کا۔" یکایک اس نے اپنے بال نوچ لیے، گریباں تار تار کر ڈالا، شیشے کی نلکی کو پارے سمیت یوں چبا ڈالا جیسے وہ میٹھی گولی ہو اور پھر وہ اوندھے منھ چوکھٹ پر گر پڑا۔

اپنی روتی چلاتی بھاگی اور سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔

پوسٹ مارٹم میں معلوم ہوا کہ مرنے سے پہلے سائنس داں کا دماغ خراب ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ذہنی توازن کھونے کے صحیح وقت کا تعین نہ ہو سکا۔ اس کے باپ، ماں اور بیوی کا کہنا تھا کہ آج اس کا رویہ بے حد بدلا ہوا اور اجنبی سا تھا۔ شاید وہ اس وقت بھی اپنے حواسوں میں نہ ہو اور عین ممکن ہے، اس وقت بھی جب اس نے اپنی ڈائری میں اس دن کی تاریخ کے آگے یہ تحریر لکھی تھی:

> آج میں نے ایک ایسی چیز ایجاد کر لی ہے جو دنیا میں تہلکہ مچا دے گی۔ اس چیز کی ایجاد میں میرے کتنے سال خرچ ہوئے ہیں، پندرہ قیمتی سال اور آج تک میں نے کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ آخرکار آج میرا تجربہ مکمل ہوا اور کامیاب بھی۔ ابھی اس آلے کو میں نے تین ہستیوں پر آزمایا ہے۔ اپنے پیارے ٹامی پر، اپنی بلی پر اور اپنے ایک دوست پر، دوست جو میرا سب سے عزیز دوست تھا اور ایک عرصے سے مجھ سے سائنسی راز معلوم کرتا رہتا تھا، اس امتحان میں بری طرح فیل ہو گیا اور میں نے اُس کے منھ پر کہہ دیا، "مہربان اب مجھے پتا چل گیا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔ دوستی کے پردے میں منافقت۔ چلے جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی یہاں آنے کی تکلیف نہ کرنا۔" اب میں جا کر اسے اماں، ابا اور بیوی اپنی پر آزماؤں گا اور انھیں بتاؤں گا کہ اب میں آزاد ہوں، ان کے لیے ہوں، بہت دنوں کے لیے۔ وہ جہاں کہیں گے

جاؤں گا جو چاہیں گے کروں گا مگر ذرا صبر۔ پہلے فہرست بنا کر نام تو لکھ لوں تا کہ واپس آتے ہی اپنے تجربے کے نتیجے لکھ سکوں اور ہاں ابھی میں نے اپنی ایجاد کا نام بھی تو نہیں سوچا... ٹھیک ہے، میں اسے کہوں گا۔ ''پیمانہ محبت۔''

یہ سائنس داں کی آخری تحریر تھی۔

Marfat.com

حلقۂ دامِ خیال

میں اپنا بستر بند کھول رہا تھا کہ امجد لپک کر آیا اور اسٹریپ سے میرا ہاتھ ہٹا دیا۔ آج اسے بڑے بھائی کا کام کرنا کتنا بُرا معلوم ہو رہا تھا۔ میں ہاتھ جھاڑ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔

فرح کمرے میں یوں داخل ہوئی جیسے ہوا کا جھونکا۔ وہ مسہری کے تکیے سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔

''کہو کیسی ہو؟'' امجد کی پیٹھ ہماری طرف تھی، میں نے فرح کا خوب صورت گورا ہاتھ تھام لیا۔

''اچھی ہوں...'' چہرے سے خوشی امنڈی پڑ رہی تھی۔

''میرے آنے سے خوش ہو؟''

وہ مسکرائی، بڑے پیار، بڑی اپنائیت سے جیسے کہہ رہی ہو، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اپنے اوپر جھکا لیا۔ آج وہ اتنی اچھی بنی ہوئی تھی ورنہ پہلے وہ میرے سائے سے بھی بھاگتی تھی۔ ''کوئی دیکھ لے گا''، ''کوئی دیکھ لے گا'' ہر وقت اس کی زبان پر رہتا تھا مگر آج جیسے اس نے سب کے خوف کو دل سے نکال

Marfat.com

دیا تھا۔ میں جانتا تھا، یہ ایک سال کی جدائی کا فیض تھا۔ ایک سال! امجد نے پلٹ کر بستر پلنگ پر رکھا تو میں نے جلدی سے فرح کے ہاتھ چھوڑ دیے...

''اور سناؤ؟'' میں نے تکلفاً کہا... وہ صرف میری آنکھوں میں دیکھ کر مسکراتی رہی۔

''امجد... ذرا میرا نائٹ سوٹ نکال دینا، سوٹ کیس میں ہوگا اوپر ہی...''

سوٹ کیس کھول کر نائٹ سوٹ نکالنے کے بجائے نہ جانے کیسے اس نے وہ بوتل نکال لی جسے میں نے اپنے خیال میں بڑا چھپا کر رکھا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے لینی چاہی مگر مجھ سے پہلے فرح نے لپک لی، لیبل پڑھا اور اداس ہوگئی۔ ہونٹوں کے کنارے سکڑ گئے اور آنکھوں میں جیسے مایوسی دوڑ گئی۔

''امجد بھیا ذرا ماچس لانا دوڑ کے۔'' میں نے بہانے سے امجد کو باہر بھیجا۔

''اچھا تو پینے لگے...!'' وہ باہر جانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''بات تو سنو فرح... بہت کم... بس برائے نام... اچھا تم کہتی ہو تو چھوڑ دوں گا۔ سچ کہتا ہوں بالکل چھوڑ دوں گا۔''

''اتنی آسانی سے؟'' اس کے لہجے میں طنز بھی تھا، افسردگی بھی۔

''ہاں اتنی آسانی سے... صبح تمھارے سامنے میں اس بھری بوتل کو نیچے چوبچے میں پھینک دوں گا... اور اس کے بعد کبھی... کبھی نہیں پیوں گا... یقین کرتی ہو؟'' میں اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہونھ...'' وہ بے یقینی سے بولی۔

''اچھا ذرا مسکراؤ...''

وہ مسکرائی اور پھر شرما گئی۔

''آج رات کو آؤ گی ناں، باتیں کریں گے... اتنی بہت سی باتیں کرنے کو ہیں۔'' وہ نظریں نیچی کیے اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔ امجد آ رہا تھا... ''بتاؤ آؤ گی؟''

اس نے خفیف سی گردن ہلائی، شرمائی اور پھر کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں نے

Marfat.com

بوتل کو پھر تولیے میں لپیٹ کر سوٹ کیس میں چھپا دیا۔ سوٹ کیس کو مقفل کر کے اسٹریپ بھی کس دیے۔ نائٹ سوٹ لے کر چلا ہی تھا کہ امی آ گئیں۔ معلوم ہوتا تھا جیسے انھیں مجھ سے پل بھر دور رہنا بھی شاق گزر رہا ہو۔ وہ مجھ سے باتیں کرتی رہیں، خوش گوار باتیں، سب کو اتنا خوش میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ جب میں گھر میں رہتا تھا تو امی زیادہ تر گھر کے اخراجات کے جھگڑے گوش گزار کرتی رہتی تھیں یا کسی نہ کسی کی بیماری کا ذکر...مگر آج نہ خرچ کا رونا تھا نہ بیماری کا... وہ مجھے میری غیر حاضری میں ہونے والے دلچسپ واقعات سنا رہی تھیں۔ امجد، ٹلّو، بلّو سب میرے گرد یوں گھیرا ڈالے دے رہے تھے جیسے میں چڑیا گھر کے لیے آج ہی افریقا سے پکڑ کر لایا گیا ہوں۔

بھابی کام میں مشغول آتے جاتے ہنس کر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور کہہ جاتی تھیں۔ بھائی جان اس فکر میں ذرا دور خاموش بیٹھے تھے کہ میں امی وغیرہم سے نمٹ لوں تو پھر وہ اطمینان سے مجھ سے باتیں کریں۔ آج وہ بھی بہت خوش تھے اور ان کی پیشانی پر پڑی ہوئی مستقل سلوٹیں بھی آج نکل گئی تھیں... ایک گلابی سایہ بھی کبھی پاس کبھی دور برابر لہرا رہا تھا...

جب امی کے دلچسپ واقعات ختم ہو گئے، بھابی کے چست فقرے اونگھنے لگے، بھائی جان کے جذبۂ تجسس کی بھی تھوڑی سی تسکین ہو گئی اور بچوں کو نیند کی دیوی نے بالکل ہی آن دبوچا تب جا کر مجھے فرصت ملی۔ کوٹھے پر اپنے بستر پر لیٹنے کے بعد بھی مجھے نیند نہ آئی۔ خیال آیا، بھائی جان کے بچوں کے لیے لائے ہوئے کھلونے ابھی دے دیتا تو بہتر ہوتا، خوش ہو جاتے۔ خیر، صبح نکال دوں گا۔ نہ معلوم امی اپنا تحفہ دیکھ کر خوش ہوں گی یا نہیں اور فرح!...فرح کو اپنی پرفیوم پسند آئے گی یا نہیں۔ اس کو اصرار تھا کہ میں اسے اتنا چھوٹا تحفہ دیا کروں جسے وہ اپنے کپڑوں میں چھپا سکے۔ My Sin کی ہوش رُبا مہک ضرور اُسے بھائے گی۔

دروازہ ہلکے سے کسی نے تھپتھپایا۔ اٹھ کر کھولا تو فرح تھی... فرح!!... مجھے بالکل امید نہیں تھی کہ وہ آئے گی... وہ کیسے آ گئی۔ میں اپنی آنکھوں کو ملنے لگا کہیں خواب تو نہیں

Marfat.com

دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی فرح تھی جس سے ایک بات کرنے کے لیے سیکڑوں مرحلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ کتنا سمجھاتا تھا، فرح نکاح کے بعد میاں بیوی میں کوئی پردہ نہیں رہتا۔ شادی یہی ہے رخصتی وخصتی سب ڈھکوسلا ہے۔ مگر اس کی سمجھ میں کہاں آتا تھا۔ دوپٹے کا کونا انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہتی، ''میں یہاں کسی کی بیوی کی حیثیت سے نہیں ہوں، ایک ایسی لڑکی کی حیثیت سے ہوں جس کے ماں باپ مر چکے ہیں اور جو چچا چچی کے ہاں رہ رہی ہے، اس انتظار میں کہ اس کے شوہر کو ملازمت مل جائے تو...'' اس کی آواز بھرا جاتی اور وہ بھاگ جاتی۔ میں خواہ کتنا ہی سمجھاؤں مگر امی کی کڑی نظریں اور خود اس کا خوف دو باتیں کرنے کی مہلت بھی نہ دیتا اور آج وہ خود چلی آئی تھی۔ میں خوشی سے دیوانہ سا ہونے لگا۔ شاید وہ مجھے بوتل کی یاد دہانی کرانے آئی تھی۔ میں نے اسے یقین دلایا تم بالکل فکر مت کرو، میں علی الصبح جب سب سو رہے ہوں گے بوتل نیچے پھینک دوں گا، گندی نالی اور کوڑے کے ڈھیر میں۔ پھر میں اس سے باتیں کرتا رہا... ڈھیر ساری باتیں... مجھے یاد نہیں کیا کیا باتیں۔ میں ہوش میں تھوڑا ہی تھا جیسے بالکل مخمور ہو رہا ہوں۔ آج کی رات کتنی حسین، کتنی مسرت خیز تھی۔ فرح کو میں ہمیشہ سانولی سلونی سی لڑکی سمجھتا تھا مگر آج... وہ کتنی حسین نظر آ رہی تھی، بالکل گلابی!! اس کی آنکھوں میں نشہ تھا، شوخی تھی... وہ اس سہمی سہمی فرح سے کتنی مختلف تھی... یہ سب ایک سال کی جدائی کا اعجاز تھا یا اس رات کا؟... اس رات سب کتنے خوش تھے، کتنے مختلف تھے۔ ہر چیز حسین تھی، مسرت سے بھرپور، ہر طرف پیار ہی پیار تھا... یہ رات تھی یا سحر تھا!! رات بھر مجھے سرور سا رہا۔ My Sin کی خوش بو رات بھر میرے دل و دماغ پر چھائی رہی، مجھ میں بس گئی جیسے ساری شیشی میں نے اپنے اوپر اونڈھالی ہو۔

صبح سو کر اٹھا تو چائے کی طلب بُری طرح ستا رہی تھی۔ اوپر کوئی نہیں تھا، نیچے بھی خاموشی تھی۔ سوچا اٹھ کر جاؤں، بھابی کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر ایک پیالی گرما گرم چائے کی پیوں۔ کرسی سے ڈریسنگ گاؤن اٹھا کر پہنتا ہوا میں سیڑھیاں اتر گیا۔ کوئی باہر کا دروازہ زور زور سے کھٹکھٹا رہا تھا۔ میں سیدھا اُدھر ہی چلا گیا... گھر میں عجیب غیر معمولی

Marfat.com

خاموشی تھی۔ دروازہ کھولا تو بوڑھا عبداللہ کھڑا تھا۔ ''آپ کب آئے چھوٹے صاحب؟'' اس نے پرانے نوکروں کی خاص بے تکلفی سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔

''رات ہی تو پہنچا ہوں...''

''اوہو... آپ کو بڑی تکلیف ہوئی ہوگی... دراصل...'' وہ ہکلا ہکلا کر کہنے لگا، ''بچی بیمار تھی کل ہی گھر چلا گیا تھا ورنہ روز یہیں رہتا تھا۔''

''نہیں مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔'' میں نے فراخ دلی سے کہا۔

''آپ نے قفل کیسے کھولا... اچھا یاد آیا اس کی ایک کنجی آپ کے پاس بھی رہتی تھی۔''

''کون سا قفل بھئی؟ کیا کہہ رہے ہو؟...'' میں کچھ نہ سمجھا تھا۔

''گھر کے قفل کی بات کر رہا ہوں صاحب... پرسوں جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے پورے مکان کو تالا لگا دیا، ہاں جی، کیا فائدہ کھلا رکھنے سے، میں تو بس باہر کی کوٹھڑی میں پڑا رہتا ہوں۔''

''سب لوگ چلے گئے... کہاں؟'' میں نے حیران ہوکر پوچھا۔

''جی وہ یہ ہوا... آپ کے آنے کی تو کوئی اطلاع نہیں تھی، اچانک اپنے میر صاحب نے سب کو بلوا بھیجا، یہیں تو ہیں تین چار اسٹیشن چھوڑ کے، بس جھٹ پٹ ہی سب تیار ہوکر چلے گئے...''

''مگر کب؟''

''پرسوں رات۔''

مجھے یقین ہوگیا میرے پیچھے بے چارے کا دماغ چل گیا، پہلے بھی سنکی سا تھا... میں اسے لیے ہوئے اندر آیا۔ کھانے کے کمرے میں کچھ برتن ابھی تک میز پر پڑے تھے۔ رات کو کھانا دیر سے کھایا تھا۔ بھابی نے سوچا ہوگا صبح دیکھا جائے گا۔

''صاحب، میں نے تو کوئی چیز نہیں چھیڑی، جلدی میں جو جیسے چھوڑ گیا، ویسے ہی رہنے دی۔ آکر خود ہی سنبھال لیں گے۔''

Marfat.com

''امجد... امجد...'' میں نے زور سے آواز دی۔

''امجد بھیا بھی گئے... سب گئے۔''

میں نے چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔ گھر واقعی خالی خالی سا نظر آ رہا تھا۔ ہر کمرے میں پھرا، کہیں بھی کوئی نہ تھا... فرح کے کمرے میں ایک گلابی جوڑا مسہری پر پڑا تھا، جیسے جلدی میں چھوڑ دیا گیا ہو۔ فرح رات کو یہی جوڑا تو پہنے تھی، یہ کیا جادو ہے۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا اوپر بھاگا۔ کہیں اس طلسم میں میرا سامان تو غائب نہیں ہوگیا۔

خدا کا شکر ہے میرا سامان سب اپنی جگہ موجود تھا۔ صرف مائی سِن (My Sin) کی شیشی زمین پر ٹوٹی پڑی تھی اور سارا عطر بہہ گیا تھا۔

مگر سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ جس بھری بوتل کو میں نے فرح کے سامنے کوٹھے پر سے نیچے پھینک دیا تھا، وہ میری مسہری کے سرہانے زمین پر پڑی ہوئی تھی اور بالکل خالی...

Marfat.com

بیگم جی

''دُر پھٹے منہ... ہر وقت کھی کھی کرتی رہتی ہے اس کے ساتھ۔ کیا نئی شادی ہوئی ہے تیری؟ اور اس بندے کو بھی اور کوئی کام نہیں ہے، تیرے ساتھ مخول کرنے کے سوا؟''
بیگم نے کہا مگر سختی کے ساتھ نہیں جیسے پہلی بیگم کہتی تھی، اس نئی بیگم کو میں بیگم جی کہتی تھی۔
شکل کی بہت اچھی، عادت کی بھلی مگر تقدیر کی شودی بیٹی تھی۔ بیگم کی زبان میں مٹھاس ہی مٹھاس تھی، مگر اس کا خاوند نرا کوڑا مانو زہر۔ میرا تو شکر ہے صاحب کے ساتھ کوئی کام ہی نہیں تھا مگر دن رات بیگم کو ڈانٹے ڈپٹے سنتی تھی۔ جتنا بیگم سنتی جاتی تھی، وہ اور شیر ہوتا جاتا تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر پھٹکارتا۔ جو چیز خود غلط جگہ رکھتا اور نہ ملتی تب بھی بیگم کو ڈانٹتا۔ خود صبح نکلتا تو رات کو گھر میں گھستا لیکن جس دن بیگم میکے یا کسی سہیلی کے گھر چلی جاتی، اس دن بہانے نکال نکال کر گھر کرتا۔ اگر وہ کسی بات کا جواب دیتی تو الٹے ہاتھ کا ایسا لپڑ منہ پر مارتا کہ شودی لہولہان ہو جاتی۔

یہ نہیں تھا کہ وہ کسی گرے پڑے گھر کی تھی۔ بہت اچھے گھرانے اور کھاتے پیتے ماں باپ کی کڑی تھی۔ خاندان میں جج اور وکیل اور ڈاکٹر سبھی تھے، انھیں کی عزت بچانے کی خاطر ساری مار پھٹکار سہتی تھی اور میرے سوا کسی سے کچھ نہ کہتی تھی۔ مجھ سے بھی کیا

Marfat.com

کہتی، میں تو سب کچھ آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ کبھی رات کو دیر تک کام کرتی تو رات کو وہیں پڑ رہتی۔ یہ بھی دیکھا کہ خاوند رات کو دو بجے بیگم کو سوتے سے اٹھا کر کہتا کہ فلاں چیز ابھی اسی وقت ڈھونڈ کر لا اور وہ نیند کی ماتی اسی وقت اٹھ کر اس کی فرمائشیں پوری کرتی۔ ایک رات کہہ دیا کہ صبح کو ڈھونڈ دوں گی، تو اس کی دُھنائی شروع کردی۔ مجھے بھی غصہ چڑھ گیا۔ میں بھی چھ فٹ کی پنجابی جٹ ہوں۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ ''صاحب جی، اب بیگم پر ہاتھ اٹھایا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

صاحب نے مجھے ایسے گھور کر دیکھا جیسے کچا چبا جائے گا، پھر ہاتھ چھڑا کر کمرے میں چلا گیا۔ بیگم اسٹڈی میں جاکر دیوان پر لیٹ کر رونے لگی۔ میں اس کے پیچھے گئی، دروازہ اندر سے بند کرلیا اور اس سے کہا، ''اب بہت ہوگیا، تم اسے چھوڑ کر چلی کیوں نہیں جاتیں؟''

''کہاں جاؤں؟'' آنسوؤں کی بوچھاڑ میں بولی۔

''میکے چلی جاؤ، خیر سے تمھارے مائی باپ ہیں، بہن بھائی سب کھاتے پیتے ہیں، تمھارا اپنا پیسا بھی ہوگا۔''

''کہاں! سب صاحب نے اپنے قبضے میں کر رکھا ہے، زیور بھی بہانے سے کئی دفعہ مانگا کہ فلاں بینک میں رکھوادوں، یہ کروں مگر میں نے دیا نہیں۔ اس کا بھی غصہ ہے اور آج جو تو نے ہاتھ پکڑا ہے، اس کی کسر بھی تو مجھی پر نکالیں گے۔''

''تو کیوں بیگم جی، مجھ نوکرانی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی کہ معلوم تھا مجھے مارا تو میں ایک لپڑ کھینچ ماروں گی۔ آپ کو اس لیے مارتے ہیں کہ آپ مار سہتی ہیں۔ میں نے بھی بہت مار کھائی ہے بیگم جی، مگر اب کسی کی مار نہیں کھاؤں گی۔''

''تو نے بھی مار کھائی ہے؟'' بیگم حیران ہوئی۔ ''یہ تیرا آدمی جو تجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے روز اپنا کام چھوڑ کر آجاتا ہے، تجھے مارتا بھی ہے؟''

''نہیں بیگم جی، یہ میرا خاوند نہیں ہے۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا، صرف آپ کو بتا رہی ہوں کہ میں اس کے ساتھ نکل آئی ہوں۔ میرا آدمی بھی اسی طرح مجھے بات بے بات

مارتا تھا۔ خود دوسری عورتوں کے ساتھ سوتا تھا، مجھ پر ایسے ویسے الزام لگاتا تھا۔ ہر وقت میری نگرینی کرتا تھا، تاکا جھانکی میں رہتا تھا۔ جن گھروں میں کام کرتی تھی وہاں جا کر جاسوسی کرتا تھا اور جب وہاں میری تعریفیں سنتا تو جل کر اور مجھے مارتا تھا۔ اپنا مالی کا کام ٹھیک سے کرتا نہیں تھا، ایک دن بیگم نے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیا۔ عورت ذات کی اس کے دل میں عزت تو کوئی نہیں تھی، پر بیگم پر اس کا بس نہیں چلا، وہاں سے جلا بھنا آیا تو بے بات مجھے ٹھونکنا شروع کر دیا۔ اسی وقت رمضو کسی کام سے میرے گھر کی طرف آ گیا۔ اس نے مجھے پٹتے دیکھا تو شودے کو ترس آ گیا۔ میں نے بھی آپ کی طرح کسی کو نہیں بتایا تھا کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔ رمضو نے اپنی آنکھ سے دیکھا تو پوچھا۔ اس کا آسرا ملا تو میں نے سارا حال سنا دیا۔ اس نے کہا، تو میرے ساتھ نکل چل۔ کراچی بڑی جگہ ہے کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا، نوکریاں بھی وہاں بہت ہیں۔ تب میں اپنی نکی کو بھی چھوڑ کر اس کے ساتھ آ گئی۔ پہلے جس گھر میں نوکری کی وہاں رمضو کو اپنا بھائی بتایا مگر یہ خانہ خراب دن میں کئی کئی چکر لگاتا اور میرے ساتھ ٹھٹا مخول کرتا تھا۔ بیگم کو شک ہو گیا، وہ تو شیرنی تھی۔ اس نے اپنے آدمی کو خوب دبا کر رکھا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے ترلے کرتا تھا اور یہ رانی کی طرح حکم چلاتی تھی۔ آپ سے بالکل الٹ تھی اور بڑی چلتر باز۔ سارا دن خرمستیاں کرتی، دو دو گھنٹے فون پر بات کرتی، سہیلیوں میں پھرتی اور شام کو سر پر پٹی باندھ کر لیٹ جاتی اور خاوند سے خوب خدمتیں کرواتی۔ کبھی حکیم کبھی ڈاکٹر کے پاس جاتی، کبھی پیروں فقیروں کے چکر لگواتی۔ مجھ پر شک پڑا تو اس نے دوسرے نوکروں کو میرے پیچھے لگوا دیا کہ دیکھو یہ کہاں رہتے ہیں اور کون ہیں؟ میں نے وہ گھر چھوڑ دیا اور یہاں آ گئی۔ یہاں سب آرام ہے بیگم جی۔ پر آپ کا دکھ نہیں دیکھا جاتا، آپ یہاں سے نکل جاؤ۔''

''میں کیسے نکل جاؤں، میرا کون ہے؟''

''آپ پڑھی لکھی ہو اکیلی ہی چلی جاؤ، نوکری کر لو، ایسی زندگی کا کیا فائدہ!''

''ہاں کہہ تو ٹھیک رہی ہے مگر ہمت کہاں سے لاؤں، دو قدم جانے کا حوصلہ نہیں۔ اس آدمی نے میرا حوصلہ ہمت جیسے چھین کر کھا لی۔ کہیں آ جا نہیں سکتی۔ اماں کے گھر

Marfat.com

جانے تک سے ڈر لگتا ہے۔ ڈرائیور سے ایک ایک بات پوچھتا ہے۔ کس وقت گئی، کس وقت آئی اور وہاں کون کون تھا؟''

''ہاں بیگم جی، یوں ہی ہوتا ہے۔ میرے اندر بھی بالکل ایسا ہی ڈر بیٹھ گیا تھا کہ کسی طرف دیکھتے بھی ڈرتی تھی مگر جب دل کڑا کرلیا تو کرلیا۔ رمضو کے ساتھ میں نے نکاح پڑھوا لیا۔''

''ایسا تھوڑی ہوتا ہے بیوقوف، جب تجھے طلاق نہیں ہوئی تو نکاح کیسے پڑھوالیا۔ کس نے پڑھا دیا تیرا نکاح؟''

''ٹھیک ہے بیگم جی، ہم نے مولوی کو ساری بات نہیں بتائی مگر اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ وہ میرا انصاف کرے گا۔ اپنی چھوٹی سی کڑی کو چھوڑ کر آجانا آسان نہیں بیگم جی مگر کوئی مجھے بتائے کہ میں کیا کرتی۔ وہ تو مجھے جان سے مار کر دم لیتا مگر تم سے تو میں یہ نہیں کہتی۔ تم اکیلی چلی جاؤ، مائی باپ سے کہو تمھیں کہیں چھپا دیں۔''

''ارے پگلی انھیں تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ میرے ساتھ اس کا کیا برتاؤ ہے۔ تب بھی وہ اس سے ڈرتے ہیں۔ دو دن رہنے کے لیے جاؤں تو یہ واپس لینے پہنچ جاتا ہے اور وہ یہ کہنے کے بجائے کہ دو دن اس کو ہمارے پاس چھوڑ دو، میری خوشامد کرتے ہیں کہ اس کے ساتھ چلی جاؤں۔''

''تبھی تو شیر ہوگیا ہے صاحب... خیر بیگم جی، اب تم سو جاؤ، صبح بات کریں گے۔ اب تم صاحب سے بات مت کرنا، نہ اس کی کسی بات کا جواب دینا اور آج کے بعد اسی کمرے کو اندر سے بند کر کے یہیں سویا کرنا اور چاہے جتنا کھٹکھٹائے نہ کھولنا۔''

''تو مجھے مروائے گی۔'' بیگم بولی۔

''ایسے جینے سے تو مرجانا اچھا بیگم جی۔'' میں نے کہا، ''میں باہر نکلی تو بیگم نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔''

دوسرے دن میں نے بیگم سے چھٹی لی، کئی بار بیگم کے ساتھ ان کے میکے جا چکی تھی۔ وہاں گئی اور رتی رتی بات بیگم کی اماں کو بتا دی۔ ان کو کچھ اندازہ تو تھا مگر بات

Marfat.com

اتنی بڑھی ہوئی ہے، یہ پتا نہیں تھا۔ بہت روئیں، رو رو کر آنکھیں سُجالیں۔

''میں نے کہا، رونے سے کام نہیں چلے گا، بیگم جی کے لیے کچھ سوچو۔''

بولیں، ''کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا، داماد سے صاف بات کرنی ہوگی کہ سدھر جاؤ۔''

میں نے کہا، ''تمھارا جمائی ایسا سدھرنے والا نہیں، دو چار تگڑے آدمی بھجواؤ کہ ہاتھ پیر توڑ دیں۔''

شودی ڈر سے پیلی پڑ گئی۔ بولی، ''نہ نہ ایسا نہ کہو، شریفوں میں یہ نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا، ''شریفوں میں وہ بھی نہیں ہونا چاہیے جو بیگم جی کے ساتھ ہو رہا ہے، رذیلوں کے ساتھ کمینہ ہی بننا پڑتا ہے۔''

بڑی بیگم بولی، ''تمھیں تو پتا ہے کہ انڈے مچھلی کی بو گرم پانی سے نہیں جاتی، ٹھنڈے پانی سے جاتی ہے۔''

میں نے کہا، ''آپ کی کڑی نے تو کوشش کرلی، پر وہ انڈا ہے نہ مچھلی ہے، اس پر ابلتا ہوا پانی ڈالو گے تب ہی کام بنے گا۔''

مجھے پتا چل گیا، ان لوگوں سے کچھ نہیں ہونے کا۔ بیگم کی طرح وہ بھی شرافت کو چاٹیں گے۔

خیر، میں باہر نکلی تو لگا کوئی میرے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ پلٹ کر دیکھا تو گلزار میرا پہلا خاوند تھا۔ پہلے تو میں ڈری پھر سوچا کہ ڈرنے سے تو کبھی کام نکلا نہیں۔ دل کڑا کرلیا، ''کیا بات ہے رے، کون ہے، کیوں میرے پیچھے لگا چلا آ رہا ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''اچھا اب تو پہچان بھی نہیں رئی، میں اتی دور سے ڈھونڈتا آریا ہوں۔'' وہ میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا۔ بولا، ''تیرے ساس سسر تیری یاد میں روتے ہیں، منی بیمار پڑ گئی ہے۔ اماں ہر وقت مجھے گالیاں دیتی ہے اور ابا تو کسی کی ہاتھ کی روٹی ہی نہیں کھاتا۔''

میں نے کہا، زیادہ باتیں نہ بنا، تیرا میرا کوئی تعلق نہیں واپس بیگم کی اماں کے گھر

Marfat.com

میں چلی گئی کہ وہ سمجھے میں یہیں کام کرتی ہوں۔ بیگم کی اماں ساری رام کہانی بیگم کے ابا کو سنا رہی تھیں اور وہ یوں بیٹھے تھے کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ ایک گھنٹے بعد میں گھر سے نکلی۔ نوکروں کو خوب سمجھا دیا کہ کوئی میرا پوچھے تو کچھ نہ بتانا مگر دوسرے دن گلزار میرے گھر پہنچ گیا اور میری خوشامد کرنے لگا کہ گھر چل۔ تیرا میرا نکاح سلامت ہے اور سارے گھر والے تجھے معاف کرنے کو تیار ہیں تو کیوں اپنی زندگی برباد کر رہی ہے۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ رمضو بھی آہستہ آہستہ دور جا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر منہ مارنے لگا تھا۔ اپنی نکی بہت یاد آتی تھی۔ میں نے کہا، ''دیکھ گلزار ے میری یہ شرطیں ہیں کہ تو مجھے گالی دے گا نہ مارے گا اور نہ میرے پیچھے پولیس کی طرح پھرے گا۔'' اس نے میری ساری شرطیں مان لیں۔ پھر میں نے اس سے کہا، ایک کام میرا اور کرنا ہے اگر تو اس میں شریک ہو تو میں تیرے ساتھ چلوں گی۔''

اس نے کہا، ''بے شک۔''

میں نے کہا، ''بیگم کو یہاں سے نکالنا ہے۔ میں چاہتی ہوں بیگم بھی میری طرح کہیں دور چلی جائے۔ پھر جس طرح تو میری خوشامد کر کے لے جا رہا ہے، اس کا آدمی بھی ہاتھ پیر جوڑ کر اسے لائے۔''

گلزار نے کہا، ''میرا کام میرے ساتھ ہے، صاحب کی بات اس کے ساتھ ہے، وہ لے جائے نہ لے جائے، ہاں جو تو کہے گی، میں کرنے کو تیار ہوں، مگر پولیس وولیس کے بکھیڑے میں نہ پڑوں گا۔''

میں نے کہا، ''پولیس وولیس کا کوئی بکھیڑا نہیں۔ لاہور تک بیگم ہمارے ساتھ جائے گی، وہاں اس کی سہیلی آن کر اسے لے جائے گی اور ہم آگے اپنے شہر چلے جائیں گے۔''

اس نے کہا، ''میرے کو منظور ہے۔''

بیگم بڑی مشکل سے مانی مگر مان گئی۔ اس کی بدھی (عقل) کام نہیں کر رہی تھی، ساری اسکیم میں نے بنائی۔ چھوٹا موٹا سامان بندھوایا، زیور رکھوایا جو تھوڑے بہت پیسے تھے

وہ لیے، رات کو گلزار ٹیکسی لے کر آیا۔ میں پہلے سے اس میں چھپی بیٹھی تھی۔ بیگم میرا برقع اوڑھ کر ڈرتی کانپتی آن کر بیٹھ گئی۔ کسی نے دیکھا بھی ہوگا تو پروا نہیں کی۔ یوں ہم اسٹیشن پہنچے اور بیگم نے لاہور تک اسی طرح برقع پہنے میری بہن بن کر سفر کیا۔ راستے بھر نہ کھایا نہ پیا، روتی رہی اور آہیں بھرتی رہی۔ میں نے مسافر عورتوں سے کہا کہ اس کا آدمی شودا گزر گیا ہے۔

لاہور میں بیگم جی کی سہیلی اسٹیشن پر آئی اور اسے لے گئی۔ میں نے سہیلی سے پتا لکھوا لیا کہ کبھی لاہور آئی تو بیگم کنے جاؤں گی۔ 'گوجانوالہ' کے اسٹیشن پر گلزار کا بھائی اور اس کا بیٹا بھی ہمیں لینے آیا تھا۔ اس کا اپنا تانگہ تھا جس میں پردہ دار سواریوں کے لیے پردہ بندھا ہوا تھا۔ گلزار نے کہا، ''رات بھائی کے گھر رہیں گے، کل سویرے سویرے بس سے اپنے گاؤں چلے جائیں گے۔''

دیور سارے راستے مخول کرتا رہا، ''اچھی تو رہی بھابی، سمندر میں ڈبکی لگائی، کلفٹن کی سیر کی، کتی فلمیں دیکھیں؟'' اس کا موڈ اچھا تھا تو میں بھی ہنس ہنس کر بات کرتی رہی۔ شکر ہے کہ رمضو کے بارے میں کسی نے کچھ نہ پوچھا، میں نے بھی اس کی کوئی بات نہیں کی۔

میں تانگے میں پیچھے بیٹھی تھی۔ تینوں مرد آگے بیٹھے تھے۔ کبھی کبھی پردہ ہٹا کر دیکھتی کہ تانگہ کھیتوں کے بیچ جا رہا ہے۔ اجنبی جگہ کی مجھے کیا پہچان! ایک جگہ لگا جیسے جنگل شروع ہوگیا۔

گلزار نے پوچھا، ''کچھ کھائے پیے گی؟''

میں نے کہا، ''لا دے کیا کھلا رہا ہے؟''

تانگہ رک گیا اور گلزار پردہ اٹھا کر اندر آیا۔ ہاتھ میں اتنا بڑا چاقو تھا۔ بولا، ''لے...'' اور چاقو میری ناک پر رکھ کر چلا دیا۔ میں چیخی، ناک پر ہاتھ رکھا تو خونم خون۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں۔ آنکھ کھلی تو اسپتال میں تھی۔ کون اسپتال میں ڈال گیا، یہ بھی پتا نہ چلا۔ کتنے دن ناک پر پٹی رہی۔ زخم بھر گیا تو اسی اسپتال میں کام کرنے لگی۔ رہنے

Marfat.com

کھانے کا ٹھکانے ہوگیا مگر شکل ایسی ہوگئی کہ کسی کو دکھانے جوگی نہیں۔ ہر وقت ناک پر چادر رکھتی تھی۔

پھر ایک دن بیگم کی تلاش میں نکلی۔ بڑی مشکل سے سہیلی کا پتا ملا۔ اس نے بتایا بیگم نے اسکول میں نوکری کرلی ہے اور ایک فلیٹ میں رہتی ہے۔ میں وہاں جاکر بیٹھ گئی۔ شام کو بیگم آئی تو پہچانی تک نہیں۔ میں نے نام بتایا، ناک پر سے چادر ہٹائی تو شودی رو پڑی۔ گلے لگایا بولی بس آج سے میرے ساتھ رہو، کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے خیر خیریت پوچھی تو بولی، ''تیرے صاحب نے میرے ماں باپ کی خوشامد کرکے کسی نہ کسی طرح میرا پتا معلوم کرلیا ہے۔ آج ہی اس کا خط ملا ہے، لکھا ہے کہ تم واپس آجاؤ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب تمھیں کچھ نہ کہوں گا۔ کبھی تم پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا اور تمھیں رانی بنا کر رکھوں گا۔ بیگم جی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔'' بیگم جی، میرے آدمی نے بھی یہی سب کہا تھا۔ میں اتنا بھی نہ کہہ سکی، صرف سوچتی رہ گئی۔

میری آنکھ کے آنسو کٹی ناک کے سوراخوں سے دو دریاؤں کی طرح بہنے لگے۔

Marfat.com

چُپ

میں سوچتی ہوں، کیا این کو بتا دوں کہ بریسلٹ شرلی کے پاس ہے۔ شرلی کہہ چکی ہے کہ وہ ہر حالت میں انکار کرے گی۔ دھمکا بھی چکی ہے۔ یہ بھی سنا چکی ہے:

"سوچ لو بینا، کس کا یقین کیا جائے گا۔ تمھارا یا میرا؟"

کبھی بات نکلتی ہے تو لوگ پوچھتے ہیں، امریکا میں نسلی تعصب ہے؟ میں سوچتی ہوں، میں نے آزمایا کیوں نہیں۔ دیکھتی تو سہی لوگ میرا یقین کرتے یا شرلی کا۔ پھر خیال آتا ہے، آزمائشیں آپ کے صبر کا بھی امتحان ہوسکتی ہیں۔ ایسی آزمائشوں میں آپ کو آخری حد تک، جہاں تک جاسکیں، جانا پڑتا ہے۔ ان میں درمیانی راستہ نہیں ہے۔ ہم جیسے میانہ روی اختیار کرنے والوں کے لیے چپ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

این کی آنکھیں آج پھر سرخ اور سوجی سوجی تھیں۔ وہ روتی بات بات پر تھی مگر ہنستی بھی خوب تھی۔

"میں نے تمھارا نام ویپنگ وِلو (روتا وِلو) رکھ دیا ہے۔" ایک دن میں نے اس سے کہا۔ میری اس بات پر وہ روتے میں بھی ہنس دی تھی۔ اس کی ہر بات میں تضاد تھا، یہاں تک کہ اس کی ذات میں بھی۔ وہ بے حد چھوٹے قد کی تھی مگر اتنی متوازن کہ اس کی

کوتاہ قامتی کا احساس کم ہی ہوتا تھا۔ ذہنی طور پر اسے نابغہ کہہ سکتے ہیں۔ پہلے دن اس کی ذہانت اور کام میں اس کی قابلیت کا سکہ میرے اوپر بیٹھ ہی رہا تھا کہ اس کا بوائے فرینڈ آیا اور بولا:

''تمھاری کار کو پھر کسی نے مار دیا۔''

اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، ''مذاق کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ ابھی میں کار پارک کی طرف گیا تو میں نے دیکھا کہ...''

اس کی بات ختم ہونے سے پہلے وہ ہوا کی طرح اڑتی ہوئی کمرے سے غائب ہوگئی۔ دوبارہ داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں سرخ اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔ بچوں کی طرح رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی، ''اب میں کیا کروں گی، ابھی تو پچھلی چوٹ کا حساب بے باق نہیں ہوا۔ انشورنس میرے ماہانہ پیسے پھر بڑھا دے گی۔''

اس کا بوائے فرینڈ خاموش تھا۔ ہم سب خاموش تھے۔ اسے نئی گاڑی لیے ہوئے ابھی بمشکل دو ماہ ہوئے تھے کہ دوسری مرتبہ کوئی اس کی پارکنگ میں کھڑی ہوئی کار کو ٹکر مار کر بھاگ گیا تھا۔ پھر وہ اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ باہر کھانا کھانے چلی گئی۔ واپس آئی تب بھی اس کی آنکھیں سرخ تھیں مگر بظاہر وہ نارمل تھی اور تھوڑی دیر کے بعد میں نے اسے کسی بات پر کھلکھلا کر ہنستے ہوئے دیکھا۔

اس کا نام این تھا اور اکیس سال تھی۔ کمپیوٹر پر اس کی انگلیاں بجلی کی طرح چلتی تھیں۔ پانچ سال سے وہ اس دفتر میں کام کر رہی تھی، اس سے پہلے کہیں اور۔ اب بھی ماں کے بزنس میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھی۔ کالج میں پڑھتی تھی اور ہم سب کو یقین تھا کہ گریجویشن کرتے ہی اُسے اِس سے بہتر جگہ مل جائے گی۔ وہ بتاتی تھی کہ پانچ چھ سال کی عمر سے گھروں میں اخبار پھینک رہی ہے۔ شروع میں اس کے والد ساتھ جاتے تھے۔ پھر وہ سائیکل پر اکیلی جانے لگی۔ ہر سال کرسمس کے موقعے پر اپنے گاہکوں کو معمولی سے کرسمس کارڈ پھینکتی تھی اور وہ اسے بطور ٹپ اچھے خاصے پیسے دیتے تھے۔ اس کا بوائے فرینڈ بین اس کے مقابلے میں بہت سیدھا سادا تھا۔ چالاکی تو این میں بھی نہیں تھی جیسی اس دفتر

Marfat.com

کی چند اور ہم عمر لڑکیوں میں تھی مگر این میں ذہانت، پھرتی اور تیزی بلا کی تھی۔ اس کے مقابلے میں لڑکا اوسط تھا بلکہ ٹھس۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ کیا ان دونوں کا شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا، ”یقیناً، مگر اس میں ابھی بہت دن ہیں۔“ ٹھنڈا سانس بھر کر بولی، ”ابھی تو میری گریجویشن میں ایک سال ہے۔ بین تو میرے بھی بعد کرے گا۔ پھر نوکری تلاش کرے گا۔ اس کے بعد ہماری شادی ہوگی۔“

”تم دونوں کب سے ڈیٹ کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ساڑھے چار سال سے۔“

”تم دونوں اور کسی کے ساتھ باہر نہیں جاتے؟“

”نہیں۔“ اس نے کہا۔

”تم دونوں کبھی ساتھ نہیں رہے؟“

”نہیں وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتا ہے، میں اپنے والدین کے ساتھ۔“

”تمھارے والدین بین کو پسند کرتے ہیں؟“

”ہاں، بہت۔“ اس نے کہا۔

”تو معاملہ پکا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

”معاف کرنا مگر میں نے تو سنا ہے کہ تمھارے ہاں ڈیٹ اس مقصد کے لیے ہوتی ہے کہ تم آدمیوں کو جان جاؤ، اچھے برے میں فرق کر سکو، تم ایک ہی لڑکے کے ساتھ جا رہی ہو تو دوسرے لوگوں کو کیسے جانو بوجھو گی؟“

”بہت جان لیا۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ اکیس سال کی ہے، چار سال سے ایک ہی لڑکے کے ساتھ جا رہی ہے پھر بھی اس نے مردوں کو جان لیا، کمال ہے۔ دل میں سوچا، ذہین ہے، شاید جان ہی لیا ہو۔ پانچ سال کی عمر سے کام کرنے والی لڑکی کی جان کاری ہم گھر گھس لڑکیاں کیا سمجھ سکتی ہیں۔ پھر ایک دن میں نے اسے روتے پکڑا۔ اب تک میری اس کی تھوڑی بہت دوستی ہو گئی تھی۔

Marfat.com

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔ دوسری لڑکیوں کے ساتھ سب سے پہلے یہی خیال آتا ہے کہ باس سے ڈانٹ پڑی مگر اپنے کام کے معاملے میں وہ سیکڑوں سے بہتر تھی، اس لیے اس کے لیے یہ خیال نہ آیا۔ بات صحیح نکلی۔

''ذاتی معاملہ ہے۔'' اس نے کہا۔

''بین کے ساتھ جھگڑا ہوا؟'' میں نے یوں ہی شرارت سے کہا۔

امید اس کی بھی نہیں تھی مگر خلافِ امید اس نے دھیرے سے کہا۔ ''ہاں!''

''کیا ہوا؟''

''ہم نے تعلقات توڑ لیے۔''

''سچ مچ!'' مجھے حیرت ہوئی، ''ہوا کیا؟''

''بس لڑائی ہوگئی، قطع تعلق ہوگیا۔''

''تم نے کیا کہ اس نے؟''

''میں نے۔''

''حسد وغیرہ کچھ؟''

''نہیں۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر جواب دے رہی تھی۔ جب وہ ایک لفظ پر مشتمل جواب دینے لگی تو زیادہ کریدنا مجھے اچھا نہیں لگا۔

''تم اس سے بہت زیادہ اسمارٹ ہو۔'' میں نے کہا، ''مگر جب تمھاری دوبارہ دوستی ہوجائے تو اسے یہ مت بتانا کہ یہ بات میں نے کہی تھی۔''

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ برستی بارش میں دھوپ سی نکلی اور پھر بدلیوں میں چھپ گئی۔ ''نہیں کہوں گی۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

بین بھی اسی دفتر کے دوسرے حصے میں کام کرتا تھا۔ وہ این کو فون کرتا رہا۔ شروع میں وہ فون پر اس سے بات نہیں کرتی تھی مگر پھر کرنے لگی۔ البتہ اس کے ساتھ باہر جانے کو ہرگز تیار نہ ہوئی۔

ایک دن دفتر کے بعد میں اور این ساتھ باہر نکلیں تو دروازے پر کوئی اور لڑکا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ نیم تاریکی میں صاف نظر نہیں آیا مگر یقین تھا کہ بین نہیں کوئی اور لڑکا ہے۔ اس لڑکے کا قد طویل تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ اسی عمارت کے دوسرے دفتر میں کام کرتا ہے اور این سے پہلے بھی کئی مرتبہ ساتھ کھانے پر جانے کی بات کر چکا تھا۔ اس کا نام جان تھا۔ قد کاٹھ کا اچھا تھا۔ بین سے شکلاً بہتر تھا۔ عمر میں بھی اس سے زیادہ تھا اور عہدے میں بھی۔ اب این باقاعدہ اس کے ساتھ جانے لگی تھی۔ بین اکثر نظر آتا تھا۔ مجھے دیکھتا تو ''ہائے'' ضرور کرتا۔ اس کی صورت پر ایک بے بسی اور کھسیاہٹ سی طاری رہتی تھی۔

کبھی کبھی یوں بھی ہوا کہ این موجود ہے اور بین کوئی کاغذ لے کر ہمارے دفتر میں آیا۔ بین بات کرنے کی کوشش کرتا تو این لیے دیے ایسے جواب دیتی جیسے کسی بھی اَن جانے شخص کو دیتی بلکہ اس سے بھی زیادہ روکھے پن سے، کیوں کہ دفتروں میں اَن جانے اور پہلی مرتبہ آنے والوں سے ہنس کر بات کرنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔

''ایک دن میں نے این کے ہاتھ میں سونے کا جگمگاتا بریسلٹ دیکھا۔''

''اوہو بڑا چمک رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کرسمس کا تحفہ ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''کرسمس میں تو ابھی کئی ہفتے ہیں، اتنی جلدی مل گیا۔''

''ہاں، لمبی کہانی ہے۔'' اس نے کہا۔

''سناؤ۔''

''جب وقت ہوگا۔''

ایسی باتوں کے دوران کوئی نہ کوئی کام نکل آتا یا ٹیلی فون آجاتا اور ہماری باتیں ادھوری رہ جاتیں۔ اکثر یوں بھی ہوتا کہ ہمارے کام کے اوقات بدل جاتے اور کئی کئی دن اس سے ملاقات نہ ہوتی۔ ایک دن وہ اپنا کام ختم کر کے جا رہی تھی، جب میں داخل ہوئی۔ میں نے ہائے کہا تو اس نے اپنی بڑی بھوری آنکھیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ وہ نم، سرخ

Marfat.com

اور سوجی ہوئی تھیں۔

''بینا، پلیز ڈومی اے فیور۔'' میرے کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے مجھ سے کہا۔

''کیا؟''

''اپنی آنکھیں کھلی رکھنا، جہاں کہیں بھی جاؤ۔''

''کیا ہوا؟''

''میرا بریسلٹ کہیں گر گیا ہے۔''

''ارے!'' میرے منہ سے نکلا، ''تم نے ڈھونڈا؟''

''میں نے سب جگہ دیکھ لیا۔ لاسٹ اینڈ فاؤنڈ میں بھی کہہ دیا۔ جہاں جہاں گئی تھی، وہاں بھی اطلاع دے دی مگر زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ اپنے ہی علاقے میں ہو۔ تم خیال رکھوگی نا۔''

''یقیناً تم بے فکر رہو، جیسے ہی مجھے ملا، تمھیں فون کردوں گی۔''

''نہیں، شرلی کو دے دینا۔'' این نے کہا۔

''او کے۔'' میں نے رسماً کہا۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا۔ شرلی مجھے بالکل پسند نہیں تھی۔ کہنے کو این اور شرلی دوست تھیں، دونوں پڑوسنیں بھی تھیں اور ایک ہی کالج میں پڑھتی تھیں مگر دونوں کی عادتوں، خصلتوں میں بہت فرق تھا۔ شرلی چھچھوری، جھوٹی، چالاک اور ہر طرح اپنا کام نکالنے والی تھی۔ وہ میرے سامنے لوگوں سے جھوٹ بولتی تھی اور بعد میں اس کی توجیہہ کرتی تھی۔ فون پر کام ٹالنے کی کوشش کرنا، اپنا کام دوسروں کے سر منڈھ دینا اور خود دوسرے دفتروں میں جا کر باتیں مٹھولنا اس کا مشغلہ تھا۔ بے حد موٹی تھی اور مٹک مٹک کر چلتی تھی۔

ایک گھنٹے بعد این کا فون شرلی کے لیے آیا۔ این اپنے بریسلٹ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ این نے کہا، میں نے نہیں سنا مگر شرلی کا جواب میں نے سنا۔ وہ بڑی بوڑھی عورتوں کی طرح کہہ رہی تھی، ''مگر اس میں تمھاری تو کوئی غلطی نہیں۔ اس کا کلاسپ ڈھیلا تھا۔'' این نے کیا پھر کچھ کہا۔

Marfat.com

''مجھے معلوم تو نہیں۔'' شرلی بولی، ''مگر اندازہ ہے کہ ڈھیلا یا خراب ہی ہوگا، تبھی تو کہیں گر گیا۔''

این کے جواب میں پھر اس نے کہا، ''اچھا، مجھے معلوم نہیں کہ وہ تمھارے ہاتھ میں اتنا ڈھیلا تھا۔'' پھر وہ خباثت سے مسکرائی اور بولی، ''جان سے کہو نا کہ ایک اور دلا دے۔''

این نے کچھ کہہ کر فون رکھ دیا اور شرلی یہ کہہ کر مٹکتی ہوئی چلی گئی کہ وہ پندرہ منٹ کے لیے کافی اور سگریٹ پینے جا رہی ہے۔

چند منٹ بعد ایک ضروری فون آیا۔ کام شرلی کا تھا مگر وہ صاحبہ اچھی خاصی گرم تھیں، اس لیے میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ فائل میں کاغذ نہ ملا تو میں نے شرلی کی دراز ٹٹولی۔ ایک دوسرے کی دراز میں سے چیزیں ضرورت پڑنے پر نکال لینے میں کوئی برائی نہیں تھی مگر بلا ضرورت ہم کبھی کسی کی دراز نہیں چھوتے تھے۔ شرلی کے نام کے کارڈوں کا ڈبہ کھسکایا تو وہ کھل گیا اور اندر سے کوئی چمکیلی چیز جھانکی۔ مجھے شبہ سا ہوا۔ کھول کر دیکھا تو این کا بریسلٹ تھا۔ وقت کم تھا، شرلی کسی لمحے آ سکتی تھی۔ اگر وہیں چھوڑ دیا تو دوبارہ اس کا ملنا مشکل ہے اور بعد میں کسی کو بتایا تو کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا۔ لمحے بھر میں اسے نکال کر میں نے ایک اور دراز میں جہاں پرانے کاغذ، لفافے وغیرہ پڑے تھے، ایک پرانے سے لفافے میں ڈال کر چھپا دیا۔

جب شرلی واپس آئی تو میں نے اس سے اکڑ کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

فون پر بات کرنے والی خاتون کی کہانی سنا کر میں نے کہا، ''میں نے تمھاری دراز میں کاغذ ڈھونڈنے کی کوشش کی تو ایک اور چیز ملی۔''

''کیا؟'' اس کا رنگ اڑا۔

''تم خود سمجھ لو۔'' میں نے کہا، ''اگر تم مجھے یہ بتا دو کہ تم نے ایسا کیوں کیا تو میں این کو نہیں بتاؤں گی کہ بریسلٹ کہاں سے ملا۔ کہہ دوں گی کہ کہیں پڑا مل گیا۔''

''مجھے واقعی پڑا ملا تھا، میں نے اس کے ہاتھ سے نہیں اتارا۔'' شرلی نے

Marfat.com

ڈھٹائی سے کہا، ''اس کا کلاسپ ڈھیلا ہے۔''

''مگر تمھیں معلوم تو ہے کہ این کا ہے اور تم اس کی دوست ہو۔''

''یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہے، سمجھ لو۔''

اس نے اپنے موٹے کندھے جھٹکے، ''اس کو بھی مفت ملا تھا۔ اس نے پیسے خرچ نہیں کیے تھے۔''

''پھر بھی اس کی چیز تھی۔'' ابھی میں کچھ اور کہنے والی تھی کہ اس نے جھلا کر اپنی موٹی بھدی زبان میں گالی دی اور بولی، ''اگر تم اسے بتانا چاہتی ہو کہ میری دراز سے نکلا ہے تو بتا دو، آئی ڈونٹ کیئر... یہ نوکری تو میں ویسے بھی چھوڑ رہی ہوں۔''

''این نے کہا تھا کہ بریسلٹ مل جائے تو شرلی کو دے دینا۔'' میں نے دراز کھول کر بریسلٹ نکالا۔

''لو یہ سنبھالو۔''

بریسلٹ اسے دیتے ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ بے خیالی میں وہی کیا جو این نے کہا تھا، ''میں این کو فون کر دیتی ہوں۔'' میں نے بعد میں اضافہ کیا۔

''ڈونٹ بودر، میں خود فون کرلوں گی۔'' شرلی نے کہا۔

''نہیں، میں فون کروں گی۔'' میں ڈٹ گئی مگر اس وقت این کے گھر پر کوئی نہیں تھا اور اس کے ہاں ریکارڈنگ مشین بھی نہیں تھی۔

''این گھر نہیں ہے۔'' شرلی نے اطمینان سے کہا، ''مجھے معلوم ہے وہ کہاں گئی ہے۔ اصل میں کام سے فارغ ہو کر مجھے بھی اسی جگہ جانا ہے۔''

اور پھر وہ اپنی موٹی موٹی پنڈلیوں کو لچکاتی ایک اور دفتر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہاں جا کر کیا کہانی سنائے گی، میں سوچتی رہ گئی۔ آدھے راستے سے وہ پلٹ کر آئی۔

''بینا ستو، تم وعدہ کرلو یہ کسی کو نہیں بتاؤ گی کہ بریسلٹ کہاں سے ملا تو میں بھی کسی کو نہیں بتاؤں گی کہ وہ تمھاری دراز سے نکلا ہے۔''

Marfat.com

''میری دراز سے؟'' میں اس کی شکل دیکھتی رہ گئی۔

''سوچ لو۔ لوگ جس کا بھی یقین کریں، تمھارا یا میرا۔'' اس کے چہرے پر سچ مچ خباثت برس رہی تھی۔

''کیا دھمکی دے رہی ہو!'' میں نے غصے سے کہا، ''میں تو پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تمھاری دراز کی بات کسی کو نہیں بتاؤں گی مگر سن رکھو شرلی کہ دھمکیوں میں آنے والی میں بھی نہیں۔'' میرا طنطنہ دیکھ کر وہ نرم پڑی۔ حالاں کہ اندر سے میں بھی کانپ رہی تھی۔ لوگ کس کا یقین کریں گے، تمھارا یا میرا، ملکی یا غیر ملکی کا، شرلی کا یا بینا کا، اس کی بات خاصی صاف تھی۔

''بس ٹھیک ہے۔'' وہ نارمل آواز میں بولی۔

''اب تمھیں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، میں سب کو بتادوں گی۔''

''کیا بتادو گی؟'' میں چونکی۔

''کوئی بات سوچ لوں گی۔ تمھارا اور میرا نام نہیں آئے گا۔''

دوسرے دن سارے دفتروں میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ این کا بریسلٹ جس کارڈ سے خریدا گیا تھا، اس میں قیمتی چیزیں خود بخود انشورڈ ہوجاتی ہیں۔ چناں چہ جان کو انشورنس کی طرف سے اس بریسلٹ کے پیسے مل جائیں گے اور این کو دوسرا بریسلٹ مل جائے گا۔

شرلی کو پرانا بریسلٹ مل ہی گیا تھا جس کے بارے میں یقین ہے کہ اس نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ شرلی کو بریسلٹ دینے کی غلطی کرنے اور اس کے دھمکانے کے بعد میں نے بھی چپ رہنے میں عافیت جانی۔

میرے اور این کے اوقات یکساں نہ رہے تو کئی دن اس سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک دن ہوئی تو میں نے بات نکالی۔

''جان کو بریسلٹ کے پیسے مل گئے؟ تمھارا نیا بریسلٹ آگیا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے جھلا کر کہا۔

Marfat.com

''ملے بھی ہوں گے تو خبیث، کمینہ مجھے تھوڑا ہی دے گا، کسی اور نئی لڑکی کو دے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ نہایت مکروہ، گھناؤنا، غلیظ شخص ہے وہ۔''

''اچھا!'' میں نے تعجب سے کہا، ''تم نے اس کی خاطر چار سال کی دوستی بے چارے بین سے توڑی، اب پھر جوڑ لو۔ وہ غریب تو برابر فون پر بات کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔''

''نہیں، میں سوچتی ہوں کہ واقعی میں نے ابھی مردوں کو سمجھا ہی کہاں ہے جو کسی ایک مرد کو چن سکوں! آج میں ایک نئے لڑکے کے ساتھ ڈیٹ پر جا رہی ہوں۔''

''اچھا، این ایک بات بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اگر تمھارا پرانا بریسلٹ مل جائے تو کیا جان کو لوٹا دو گی؟''

''ہرگز نہیں۔ جو کچھ اس پاجی نے مجھ سے لیا ہے، وہ کون سا مجھے لوٹا رہا ہے۔''

وہ پرس کاندھے پر ڈال کر کھٹ کھٹ کرتی بیرونی دروازے کی طرف چلی گئی۔

Marfat.com

واللہ اعلم بالصّواب

نوجوانی کا زمانہ تھا، مطالعے کا شوق تھا جو کچھ پڑھتا ہضم کرتا جاتا۔ ایک پرانی کتاب ہاتھ آئی۔ اشرف صبوحی کا مضمون مرزا گوہر پڑھا۔ کیا شفاف موتی کی سی زبان تھی۔ میرا طریقہ تھا جو تحریر اچھی لگتی، اس کے اقتباس نوٹ بک میں اتار لیتا تھا۔ سو مرزا گوہر سے میں نے یہ اقتباسات اپنی کاپی میں لکھے:

"... پوتڑوں کے امیر تھے۔ بچپن سونے چاندی کے پنگوڑوں میں گزرا... کوئی بازی ایسی نہ تھی جس کا انھیں شوق نہ ہو، نہ کوئی لیاقت نہ سلیقہ، نہ جسم محنت و مشقت کا عادی تھا، نہ مزاج میں صلاحیت۔ نوکری ملتی تو کس برتے پر اور اگر مل بھی جاتی تو پرائی تابع داری کون کرتا۔

... چناں چہ مرزا گوہر نے متروک الدنیا بننے کے لیے یہ تمام درجے طے کر لیے تھے اور اب ان کے یہ دن مزاروں پر فاتحہ پڑھنے، درگاہوں پر چلّہ کشی کرنے اور عالموں، فقیروں، درویشوں کی تلاش میں گزرتے تھے... آخر قبرستان کی مسجد میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے ترس کھا کر مرزا گوہر کو ایک وظیفہ بتایا کہ یہ دعوتِ دردائیل سے متعلق ہے۔

Marfat.com

والله اعلم بالصواب

...انتالیسواں دن تھا اور چار گھنٹے پڑھتے ہوئے گزرے تھے کہ یکایک ساری مسجد ہلنے لگی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ زلزلہ آ گیا۔ حجرے کے کواڑ ٹوٹے جاتے تھے۔ مہیب مہیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا شور تھا جیسے آسمان سے پتھر کی ہزاروں سلیں برس رہی ہوں یا صدہا ریل گاڑیاں ہیں جو زمین کی چھاتی روندرہی ہیں۔ یہ ہول ناک منظر لحہ بہ لحہ ترقی کر رہا تھا اور مرزا بے چارہ سہا سمٹا ہوا اپنے کام میں مصروف تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور تسبیح چل رہی تھی کہ یکایک حجرے کے دروازے کو سخت دھکا لگا۔ دونوں کواڑ پاش پاش ہوگئے۔

مرزا نے ڈرتے ڈرتے آنکھ کھولی۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک قوی ہیکل خوب صورت جوان، نہایت بارعب ہتھیار لگائے اندر داخل ہوا۔ حصار کے گرد تیغچکر لگائے اور تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا۔'' (یہ دردائیل مؤکل تھا)

اس تحریر نے میرے دل و ذہن پر عجب طرح کا اثر کیا۔ دن تو جیسے تیسے کٹ جاتا مگر رات کو تنہائی میں یہ مناظر نظروں کے سامنے ناچتے اور دل پر ہیبت سی بیٹھ جاتی۔ دیواروں سے آہوں کی آوازیں آتیں۔ چھت کی کڑیاں زور زور سے چرچراتیں، کبھی لگتا، کمرے میں دھواں بھر رہا ہے، کبھی محسوس ہوتا کہ برابر کے کمرے میں کوئی چل رہا ہے۔

ایک رات خواب دیکھا کہ چھت سے دھڑا دھڑ پتھر میرے اوپر برس رہے ہیں۔ خواب کچھ ایسا حقیقت لیے ہوئے اور صاف تھا کہ جب آنکھ کھلی اور خود کو دبا ہوا نہ پایا تو حیرت ہوئی۔ فرش پر پڑا لحاف اور گری پڑی چیزیں یوں لگیں جیسے پتھروں کے ڈھیر ہوں۔ ڈرتے ڈرتے انھیں چھو کر دیکھا۔ اعتبار آیا کہ پتھر نہیں مگر پھر نیند نہ آئی۔ آخر اٹھ بیٹھا اور اس قسم کی ایک ڈراؤنی، آسیبی، مافوق الفطرت یا مابعد الطبیعیاتی جو بھی آپ کہیں، کہانی لکھ ڈالی۔

دوسرے دن یہ کہانی اپنے دوستوں کو سنائی۔ اُنھوں نے بڑی دلچسپی سے سنی۔ ڈرے سہے رہے جیسے پتھر ان کے سر پر برس رہے ہوں۔

ایک بولا، ''یار، تو ایسا لکھ تو نہیں سکتا جب تک یہ سچ نہ ہو۔''

''سچ ہی تو ہے۔'' میں نے مذاقاً کہا۔

اس پر یار لوگ چونکے اور کریدنے لگے... میں نے کچھ اور بڑھا چڑھا کر سنا دیا۔

یہ بات پھیلنے لگی۔ پاس پڑوسی جو کبھی بات نہ پوچھتے تھے، راہ چلتے روک لیتے اور علیک سلیک کے بعد اس واقعے کی ٹوہ لیتے۔

میں اور نمک مرچ لگا کر سنا دیتا۔

نیک سچا مشہور تھا۔ کسی نے نہ سوچا کہ بے پر کی اڑا رہا ہے۔ سوچا بھی ہوگا مگر ہمیں تو مفت کی شہرت مل رہی تھی، سو ہم ڈٹے رہے۔

پھر ایک دن کہانی کے مسودے کو غور سے پڑھا۔ اب تک لوگوں کو جو کچھ سنایا تھا وہ، اس کے علاوہ اور کچھ مال مسالہ اس میں ڈالا اور ایک رسالے کو ''سچی کہانی'' کے نام سے بھیج دیا۔ کہانی چھپ گئی۔ ان دنوں لکھنے والوں کے نام خطوط آنے کا بھی خاصا رواج تھا۔ چناں چہ پڑھنے والوں کے خطوط ملنے لگے۔ کوئی تعریف کرتا، کوئی مزید جاننے کی کوشش کرتا، کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے لکھا کہ کہانی سچی نہیں مگر اچھی ہے۔

بات اتنی پھیل گئی اور اتنے لوگوں نے اسے سچ جانا کہ اب اسے جھوٹ اور بے پر کی کہتے ہوئے شرم دامن گیر ہوئی، لوگ مذاق اڑائیں گے۔ خود بیوقوف بنے، اس کا غصہ بھی مجھ پر اتاریں گے۔ میرا اعتبار اٹھ جائے گا۔ ہر شخص جھوٹا اور فریبی سمجھے گا۔ اب تو سچی بات کو بھی بے پر کی کہیں گے۔ اپنے اندر سے ہی کوئی بولا:

''چپ بھی رہو، نہ تم نے کسی کا کچھ بگاڑا، نہ تمھارا کچھ بگڑا۔ افسانوں اور کہانیوں کی فرمائشیں آ رہی ہیں، ان کو پورا کرو اور دھیان اس کہانی سے ہٹاؤ۔''

چناں چہ میں نے اور کہانیاں لکھیں۔ بچپن سے مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ جانے کب تحریر میں پختگی آ گئی تھی۔ اپنے الفاظ کے چناؤ اور اندازِ تحریر پر بارہا خود حیرت ہوئی۔ جو کہانی کسی رسالے کو بھیجتا فوراً چھپ جاتی۔ انسانوں کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کا شوق تھا، اس لیے نفسیاتی افسانے لکھنے لگا۔ میری پہلی کہانی کو لوگ بھولے نہ تھے۔ اس پر لے دے جاری تھی۔ میں نے اس کو بھی ایک نفسیاتی تجربہ بنا لیا کہ دیکھیں کتنے عاقل اور بالغ لوگ ایسے محیر العقول کارناموں کو سچا سمجھتے ہیں اور اس سچ میں بیان کرنے والے کی شخصیت کا کتنا ہاتھ ہوتا ہے۔ کوئی لچا، لفنگا، گپ باز ہوتا تو کب کا لوگ اسے جھوٹا جان کر بھول بھال گئے

Marfat.com

ہوتے، مگر میری کہانی تو محیر العقول واقعات میں ایک سند کی حیثیت اختیار کر گئی... کوئی کہتا کہ ایسا نہیں ہوسکتا تو لوگ کہتے... ''شبیر سے پوچھ لو، اس کے ساتھ کیا ہوا؟''

اب شبیر میاں کیا کہتے۔ ایک جھوٹ سے ہزار جھوٹ جنم لیتے ہیں۔ اتنا آگے بڑھ کر پیچھے ہٹنا آسان نہیں... نفسیاتی تجربے کی چھڑی تھام کے، سر کو اثبات میں ہلاتے رہتے... یہی نہیں، جب بات مدھم پڑنے لگی تو میں کوئی اور محیر العقول واقعہ گھڑ کر سنا دیتا۔ وہ بھی جلد جڑ پکڑ لیتا اور پان کی بیل کی طرح پھیلے چلے جاتا۔ پھول پھل نہ سہی لیکن اس کا گھن دیکھ دیکھ کر میں خوش ہوتا۔

ہاں نفسیاتی تجربے نے یہ بات سُجھائی کہ جوں جوں میری عمر بڑھ رہی ہے، میں بظاہر مدبر نظر آنے لگا ہوں، توں توں لوگوں کو میری بات کا زیادہ یقین آتا جا رہا ہے۔ عمر بھی دھوکے کی ٹٹی ہوسکتی ہے۔ یہ نفسیاتی تجربہ بھی بُرا نہ تھا۔ وہی دوست جو منھ پر بے اعتباری کی باتیں کرتے تھے، اب ایسے واقعات کو خوب ہوا دینے لگے... چند دن گزرے تھے کہ محیر العقول واقعات، کارنامے اور پھر کرامات میں تبدیل ہونے لگے... میں دل ہی دل میں ہنستا رہا۔

ایک دن ایک دوست کسی شخص کو لے کر آئے کہ اس کی ماں سخت بیمار ہے۔ بے چارہ بے حد پریشان ہے۔ میں نے کہا، ''تمھیں ایک ایسے شخص سے ملوا دیتا ہوں جن کی دعا میں بے حد اثر ہے۔ امید ہے کہ تمھاری والدہ صحت یاب ہو جائیں گی۔''

''کیوں غلط بات تم نے کی...؟'' میں نے بگڑ کر کہا۔

''غلط بات کیسی...؟'' دوست نے کہا، ''مجھے یقین ہے کہ تمھاری دعا میں اثر ہے... اور اب تو میں اسے لے آیا ہوں جو چاہو اس سے کہہ دو۔''

میں نے دل میں سوچا... دعا کرنا تو گناہ نہیں... دو ہی باتیں ہوسکتی ہیں یا تو اس کی ماں ٹھیک ہو جائیں گی جس سے اس شخص کو خوشی ہوگی یا مر جائیں گی جس سے اس کا اعتبار مجھ پر سے جاتا رہے گا... سو اس میں کوئی حرج نہیں... ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہوگا... اب اللہ کو یہ منظور تھا کہ وہ خاتون صحت یاب ہوگئیں... میرے دوست کی کہی بات صرف ایک مرتبہ صحیح

Marfat.com

ہوئی لیکن سیکڑوں کہانیاں اس ایک بات سے نکلیں... یہاں تک مشہور ہوا کہ ان صاحبہ کو ناقابلِ علاج بیماری تھی مگر میرے اتنا کہنے سے کہ... "انھیں تو کچھ بھی نہیں"... وہ موذی مرض جاتا رہا۔ وہ صاحب جن کی والدہ صحت یاب ہوئی تھیں، میرے مرید کہلانے لگے اور لوگ باقاعدہ میرے ہاتھ پر بیعت کرنے آنے لگے۔ جن کو میں طرح طرح سے ٹالتا رہا۔

میرے وہ دوست جو ان صاحب کو لائے تھے، بار بار مجھے سمجھاتے کہ لوگوں کے بھلے کی بات ہے، دعا کرنا عیب نہیں۔ آپ ان کے لیے دعا کریں گے، وہ آپ کے حق میں دعا کریں گے... نہ ان کا کچھ بگڑے گا نہ آپ کا... میں نے خفت مٹانے کو داڑھی رکھ لی۔ داڑھی اتنی تیزی سے نہیں بڑھی جتنا کہ میرا اعتبار بڑھا۔ اس اعتبار کے سہارے دوست نے کون سے قصے سنا سنا کر مجھے ولی اور قطب بنا دیا... جب بات بڑھنے لگی تو میں نے اپنے دوست کو سرزنش کی مگر وہ باز نہ آئے۔

احساسِ جرم میں خیال آیا کہ ساری دنیا جھانکی، ہزاروں کتابیں نگلیں، آخر وہ دنیا بھی دیکھوں جس کی تہمت مجھ پر ہے... میں نے تصوف اور طریقت پر کتابیں پڑھنی شروع کیں... شریعت پر بھی عمل شروع کیا، رو رو کر اللہ سے دعا مانگتا کہ مجھے اتنا حوصلہ دے کہ جو کچھ میرے بارے میں اب تک کہا گیا ہے، اس کی حقیقت بیان کرسکوں۔

اس نئے سفر میں جو میں نے شروع کیا تھا، کیا کھویا کیا پایا، یہ بالکل دوسری بات ہے جو نہ میں کہنا چاہتا ہوں، نہ مجھے اجازت ہے... البتہ آج جب مجھے معلوم ہوا کہ میرا آخری وقت قریب ہے، تمام حقیقت بے کم و کاست لکھ رہا ہوں۔ میرے بارے میں جو کچھ کہا جاتا رہا، وہ اس غلطی کی بنا پر تھا جو میں نے اَن جانے میں کی تھی... بس ایک بات خوشی کی ہے کہ ایک جھوٹ نے مجھے سچ اور ایک تخیل نے حقیقت کی راہ پر ڈال دیا۔ شاید مشیتِ ایزدی یہی تھی... خدا اور خلقت مجھے معاف کرے۔ میرا بیان ختم ہوا اور زندگی بھی چند لمحوں میں ختم ہونے والی ہے... رہے نام اللہ کا۔

خاکسار شبیر توقیری

یہاں شبیر توقیری کا بیان ختم ہوا۔ اس بیان کے نیچے ان کے دوست نے جو خود کو

شبیر صاحب کا مریدِ خاص کہتے تھے، نہایت باریک قلم سے لکھا:

مرشد اور دوست! تمھارا کام تو تمام ہوا لیکن میرا ابھی باقی ہے۔ تمھیں قطب بنا کر میں شہرت کی قطب میناری سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ یہ میرا تجربہ ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوا... تم اپنا بیان لکھ گئے، اچھا کیا۔ جب میں اپنے تجربوں کے نتائج سے مطمئن ہو جاؤں گا، تمھارے بیان کے ساتھ شائع کرا دوں گا۔ سارا معاملہ صاف ہو جائے گا... اور ہم دونوں سرخ رُو ٹھہریں گے۔

اس عرصے میں جو کتابیں ان مریدِ خاص نے مرشد پر لکھیں، اندھا دھند فروخت ہوئیں۔ سب یہی کہتے کہ کچھ تو ان صاحب میں بھی ہے آخر ولی را ولی می شناسد... مریدِ خاص بھی لکھنے کے فن سے واقف تھے اور مرشد کی مافوق الفطرت کہانیوں کے ساتھ بین السطور اپنے بھی ٹانکے جاتے تھے۔ حسبِ توقع ان کے معتقدین اور مریدوں کی تعداد دن دونی رات چوگنی بڑھنے لگی۔

آخر ایک دن ان کے ایک مرید سامنے آئے اور بولے، ''حضور، بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''کہو۔''

''مرشد، آپ کے قلم سے اپنی تعریف کچھ زیب نہیں دیتی۔ یہ خدمت مجھے عنایت ہو تو دیکھیے کیا کر دکھاتا ہوں۔ اپنی زندگی کے واقعات ارشاد فرمائیے، میں قلم بند کرتا جاتا ہوں۔''

''بسم اللہ...'' مرشد نے فرمایا۔

پیر نے جو کچھ کہا، مرید نے ایسے چمکا کر لکھا، ایسی توضیحات بیان کیں اور وہ حاشیہ بندی کی کہ جو پڑھتا، نہ صرف صدفی صد سچ سمجھتا بلکہ اَش اَش کرتا۔

مرشد کے ساتھ مرید کی شہرت، عزت، دولت اور حلقہ بگوشوں میں تیزی سے اضافہ ہونے لگا۔

آخر ایک دن جب مرشد کا وقتِ رخصت نزدیک آیا تو اُنھوں نے کہا:

Marfat.com

"بس بھئی، بہت دن خلقت کو پردے میں رکھا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے اور میرے مرحوم دوست نے ایک تجربہ کیا تھا۔ اب میں اپنا ذاتی بیان، دوست کی تحریری شہادت کے ساتھ چھپوانا چاہتا ہوں۔ میرا آخری وقت ہے، ظاہر ہے کہ لوگ اسے تسلیم کرلیں گے اور میں دوست کے ساتھ کیے ہوئے وعدے سے سرخ رُو ہوں گا۔"

مرید نے بلبلا کر کہا، "یہ کیا کرتے ہیں حضرت! سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ ایک عمر کی عزت مٹی میں مل جائے گی۔ لاکھ کا محل خاک ہوجائے گا... لوگ میری داڑھی نوچ ڈالیں گے۔ آپ کے مزارِ مبارک پر اللہ نہ کرے پھول کی جگہ پتھر برسیں گے... یہ مناسب موقع نہیں... اپنے خادم پر بھروسا رکھیے... اطمینان سے سدھاریے... جب آپ کے وصال کو کچھ عرصہ گزر جائے گا، عاجز کا اور خلقت کا دل ٹھہر جائے گا، میں آپ کے، اپنے اور آپ کے مرشد کے تجربوں پر مبنی ایک تھیسیس لکھ کر چھپوا دوں گا۔ آپ تو جانتے ہیں تحقیق جتنے وسیع عرصے پر پھیلی ہو، اتنی ہی وقیع ہوتی ہے۔ آپ کے دوست اور آپ کے بیان کی روشنی میں کسی کے لیے چون و چرا کی گنجائش نہ ہوگی... آخرکار سچ کا بول بالا ہوگا، باطل کے اندھیرے...

اس طویل تقریر کے دوران ہی مرشد کا انتقال ہوگیا۔ مرید نے ان کے اور دوست کے تحریری بیان چپکے سے ان کے ساتھ قبر میں رکھ کر دفن کردیے۔

مرشد کے وصال کے وقت اور فوری بعد جو محیر العقول واقعات ظہور میں نہیں آئے وہ اپنے تخیل کے بل پر ان حضرت نے قلم بند کیے اور بڑے کروفر سے ایک کتاب چھپوائی۔ مرشد کا عالی شان مقبرہ بنوایا اور خود سجادہ نشین بنے کہ ان کے کہنے کے مطابق آخری وقت میں مرشد کی یہی ہدایت تھی... ان کی ہدایت پر عمل نہ کرنا ان جیسے ہیچ مداں کے بس میں نہ تھا۔

گمان و یقیں

سامنے دروازے کے شیشے سے دوسرے گھر کے ایک درخت پر نظر پڑی۔ ننگے منگے درخت کے اوپری دو شاخے کے سنگم سے ذرا اوپر ایک بھورا سوکھا پتا اٹکا ہوا تھا... واحد پتا... مشہورِ زمانہ کہانی ''درخت کا آخری پتا'' یاد آئی جس میں ایک آرٹسٹ ایک پتا پینٹ کر کے درخت پر باندھ دیتا ہے تا کہ زندگی سے مایوس ہیروئن کو سہارا رہے کہ ابھی درخت پر ایک پتا باقی ہے... پتا ذرا سا ہلا... دل نے کہا، ارے یہ تو چڑیا ہے... صاف ہیولا چڑیا کا ہے... چونچ، بدن اور ننھی سی دم۔

چڑیا ہلی... نہیں یہ تو پتا ہے۔ چڑیا وہ بھی اکیلی... بالکل تنہا اتنی دیر کیوں بیٹھے گی بھلا... دیکھوں کیا دوسرے درخت ہل رہے ہیں۔ ہاں ہلکے ہلکے ہل تو رہے ہیں۔ سردی بھی خاصی ہے۔ طے ہوگیا کہ وہ چڑیا جب ایک طرف دیکھنے لگتی ہے تو چڑیا لگتی ہے مگر جب رخ سامنے کرلیتی ہے تو صاف تکونا پتا سی ہوجاتی ہے۔ ہو کیا جاتی ہے ذرا اب دیکھو اصل میں پتا ہی ہے۔ ہاں صاف پتا ہے... پتا ہلا... پھر چڑیا بن گیا...

جی چاہا، کوٹ پہن کر، مفلر لپیٹ کر باہر نکلوں اور دیکھوں مگر فاصلہ خاصا ہے اور گھر کی اونچی دیوار بھی ہے اور پھر بیوقوفی کی بات بھی ہے جب صاف چڑیا نظر آرہی

Marfat.com

ہے... دو اور چڑیاں اڑتی ہوئی آئیں۔ ایک بالکل اس کے پاس بیٹھ گئی، دوسری الگ شاخ پر... ذرا دیر بیٹھی رہیں پھر دونوں باری باری اڑ گئیں۔ پتے جیسی چڑیا اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ وہ دونوں چڑیاں خاموش بغیر ملے جلے بیٹھی رہتیں تو پتے ہی لگتیں... مگر وہ اڑ گئیں کہ چڑیاں تھیں۔ یہ کیسے اڑے جب ہے ہی پتا... میں نے سوچا اور میرے ہونٹوں پر خواہ مخواہ مسکراہٹ آ گئی... یقیناً پتا ہے، تعجب یہ ہے کہ میں نے سوچا ہی کیوں کہ چڑیا ہے۔ سو فی صد پتا ہے۔ ہلکی ہلکی ہوا سے ذرا ذرا ہل بھی رہا ہے۔

اچھا چلیں، کوئی کام کریں سارا دن اس پتے یا چڑیا کی نذر تو نہیں ہوسکتا... باورچی خانے میں جا کر کام کرنا شروع کیا مگر دل اس پتے نما چڑیا یا چڑیا نما پتے میں پڑا رہا... تھوڑے تھوڑے وقفے سے جھانک کر دیکھ جاتی... اپنی جگہ موجود تھی یا تھا... یقیناً "تھا"... اتنی دیر چڑیا کبھی بیٹھی نہ رہے گی جیسے دل کو یقین ہوا... پھر خیال نے سر اٹھایا... شاید بہت دل گرفتہ ہو، بھوکی ہو، رستہ بھول گئی ہو، اڑ نہ پا رہی ہو، سردی میں پر جم گئے ہوں... ارے واہ خواہ مخواہ... اتنی چڑیوں کے پر نہ جمے تو ان بیگم کے کیسے جم گئے۔ اونھ، فضول کی باتیں۔ چلو اب کام کرو... سارے کام پڑے ہوئے ہیں۔

دو گھنٹے خوب جم کر کام کیا۔ پھر خیال آیا... دوڑ کر آئی۔ آن کر دیکھا، کوئی بھی نہ تھا... ہنسی آئی... آخر پتا چل گیا... چڑیا تھی، اڑ گئی... مگر یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ پتا ہی ہو... جہاں سارے درخت کے پتے ٹوٹ کر گر گئے وہاں یہ آخری پتا بھی دو گھنٹے میں ٹوٹ کر گر ہی سکتا ہے...!

Marfat.com

بونا

ایک دن کار کے کسی لمبے سفر پر پھر وہی بات چھڑ گئی، جو اکثر ان کے درمیان ہوتی رہتی تھی مگر اس کا انداز ہر دفعہ مختلف ہوتا تھا۔ شاید اسی بات میں گیتی کو مزہ آتا تھا۔ گیتی نے کہا، ''آخر تم مان کیوں نہیں لیتے کہ تمھیں نگہت سے افلاطونی عشق تھا۔''

''دیکھو، عشق صرف عشق ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔''

''تو اَن چھوئی محبت ہوئی نا، کیسی ہوتی ہے یہ اَن چھوئی محبت؟''

''چھوئی چیز میں کوئی نہ کوئی کثافت تو ہوگی۔ اَن چھوئی چیز کثافت سے پاک ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کھوٹ، کوئی میل نہیں ہوتا۔''

''تو اچھوت کہہ لو۔'' گیتی نے ہنس کر کہا۔

''نہیں اچھوت وہ ہے جسے چھونا اچھا نہ سمجھا جائے اور اَن چھوئی وہ ہے جسے چھوا نہ گیا ہو۔ اچھوت میں ناپاکی کا اظہار ہوتا ہے، اَن چھوئی میں پاکی کا۔''

''تو ہمارا عشق ناپاک ہے؟''

''نہیں، ہم میں میاں بیوی کی محبت ہے، چھوئی محبت۔''

''چھوئی موئی جیسی نا۔''

Marfat.com

''نہیں بھئی، چھوئی موئی تو چھوتے ہی مرجھا جاتی ہے۔ ہماری محبت چھونے سے کھل جاتی ہے، مگر وہ اَن چھوئی محبت یا عشق سے بالکل الگ ہے۔''

''کیا انسان دو قسم کی محبت کر سکتا ہے؟''

''ہاں، تم جیسا سمجھنے والا ساتھی مل جائے تو.... ورنہ اسے ایک محبت کا گلا گھونٹنا پڑتا ہے۔ کبھی چھوئی کا اور کبھی 'اَن چھوئی' کا۔''

''تو اب نگہت کو دیکھنے کو جی نہیں چاہتا؟''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ میرے سامنے رہتی ہے، دیکھتا رہتا ہوں۔''

''مگر اب تو وہ بہت بدل گئی ہوگی۔ اس کے چار بچے ہیں۔ موٹی اور بھدی ہوگئی ہوگی... میں چاہتی ہوں کہ تم اسے دیکھو۔ تمھارا عشق کافور ہو جائے گا۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔''

''کیوں؟''

''کیوں کہ میں اس چار بچوں کی ماں سے محبت نہیں کرتا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم صرف اس خیال سے چمٹے ہوئے ہو جو کبھی تھا۔ تمھیں نگہت سے محبت وحبت نہیں ہے۔''

''شاید یہی ہو... اس کو دیکھنے کی تڑپ نہیں ہے۔''

''مگر میں اس سے ملنا چاہتی ہوں اور اسے بتانا چاہتی ہوں کہ تم ابھی تک اس کے خیال سے عشق کرتے ہو۔''

''اسے بتانا ضروری نہیں ہے۔''

''کیوں؟ وہ خوش ہوگی، پھولی نہیں سمائے گی۔ اس بات سے اور بھی خوش ہوگی کہ شیراز کی بیوی یہ بات بتا رہی ہے۔ اس میں اس کی جیت ہے اور میری ہار۔''

''تمھاری ہار مجھے منظور نہیں۔''

Marfat.com

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تم میری بیوی ہو۔''

''عشق کے سامنے بھی تمھیں بیوی کی ہار منظور نہیں!؟''

''جس بیوی نے میرے عشق کا مان رکھا ہو اس کی ہار مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں۔''

''اپنی محبوبہ کے سامنے بھی تمھیں بیوی کی ہار منظور نہیں۔''

''نہیں، اس کے سامنے بھی نہیں۔''

''تم عجیب و غریب آدمی ہو۔''

''اور تم عجیب و غریب عورت ہو۔''

''کاش تم مجھ سے عشق کرتے۔''

''کرتا تو ہوں۔''

''نہیں، وہ نکہت والا عشق، میں تمھارا عشق بن کر تمھارے دل میں رہ کر دیکھتی کہ سدا کوئی کسی کے دل میں کیسے رہتا ہے، نظروں کے سامنے ہوئے بغیر۔''

''وہ اپنے بس میں نہیں گیتی... کچھ چیزیں اپنے بس میں نہیں ہوتیں، اس کے لیے تم مجھے معاف کر دینا۔''

''معاف نہ کرتی تو شادی بھی نہ کرتی۔''

''تھینک یو... یو آر گریٹ۔ میں نہ صرف تم سے محبت کرتا ہوں بلکہ تمھاری عزت کرتا ہوں... اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ یقین کرو گیتی! میاں بیوی اگر دل سے ایک دوسرے کی عزت کریں تو یہ بہت بڑی بات ہے، محبت سے بھی بڑی۔''

''اور عشق سے؟''

''عشق کو بیچ میں نہ لاؤ۔ عشق کو عزت کی ضرورت نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں... رہی محبت تو اس میں کثافت بھی ہو سکتی ہے، مگر ہر امتحان میں پوری بھی تو وہی اتری ہے۔ عشق تو بغیر امتحان کے گزر رہا ہے۔ تم اپنی محبت کو ہرگز کم نہ سمجھنا۔'' شیراز نے

Marfat.com

اس کی گردن میں باہیں ڈالیں اور پیار سے اس کی طرف دیکھا۔ کار بل کھانے لگی۔

''ذرا سنبھال کے۔'' گیتی نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھ کر کار کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر کار پہاڑ سے ٹکرا کر چکنا چور ہوگئی۔ گیتی کے زیادہ چوٹیں نہیں آئیں لیکن شیراز کی چوٹیں شدید تھیں۔ اسپتال تک پہنچتے پہنچتے وہ کومے میں چلا گیا۔

☆

گیتی کو شیراز کے عشق کے سارے معاملات کی خبر تھی۔ ابھی نویں جماعت میں پڑھتے تھے کہ عشقیہ نظمیں اور غزلیں کہنی شروع کیں۔ ایک دن جتن سے کسی کے ذریعے نگہت کو ایک نظم بجھوا دی۔ اس نے بھرے مجمعے میں پرزے پرزے کرکے پھینک دی اور جا کر ماں سے شکایت الگ کی۔ اسکول میں پڑھنے والی اس لڑکی کی بڑی واہ وا ہوئی اور شیراز میاں کا مذاق بنا... لیکن یہ کہاں باز آنے والے تھے۔ انھوں نے انگریزی میں ایک نظم ''ریجکشن'' لکھی اور ایک مقابلے میں پڑھی۔ پھر خود ہی اس کا ترجمہ کیا۔

مجھے رد کر دیا گیا
مگر میرے عشق کو نہیں
میرے عشق کو رد نہیں کیا جاسکتا
کیوں کہ میرا عشق میرا ہے کسی اور کا نہیں
کوئی میرے عشق کو کم زور کرے گا تو میں اسے ہرگز ایسا نہیں کرنے دوں گا
اگر کوئی اس پر حملہ کرے گا تو میں اس کی ڈھال بن جاؤں گا
اور کوئی اسے مارنا چاہے گا تو میں اپنی جان سے اس کی حفاظت کروں گا

رد کیے جانے کا چرچا تو ہو ہی رہا تھا، اس نظم کا بھی خوب چرچا ہوا۔

صاحب زادے نویں جماعت میں پڑھتے ہیں اور چلے ہیں عشق کرنے۔

آخر پرنسپل کے کہنے پر اس کے ایک استاد نے جو اس کے والد کے دوست بھی تھے، اسے سمجھانے ٹیچرز روم میں بلایا، ''دیکھو، ابھی شعر و شاعری اور عشق و عاشقی میں نہ پڑو، پڑھائی میں دل لگاؤ۔ عشق کرنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔''

Marfat.com

"سر، عشق کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔"

"افوہ، یہ عمر اور عشق کا یہ سودا... کے سال کے ہو صاحب زادے؟"

"سر، مجنوں بھی تو مکتب میں تھا جب تختی پر صرف لیلیٰ لیلیٰ لکھتا تھا۔"

ہاں، مگر لیلیٰ نے دس آدمیوں کے سامنے مجنوں کی بے عزتی نہیں کی۔ مجنوں کو مار پڑتی تھی تو لیلیٰ کے ہاتھ پر چوٹ کے نشان ابھر آتے تھے۔"

"اس کا کیا مطلب ہے سر؟"

"مطلب یہ ہے کہ مجنوں اور لیلیٰ کا عشق کامل تھا، تمھارا خام ہے، بچوں کا کھیل ہے، اس لیے وقت ضائع نہ کرو۔ سنا نہیں، کہتے ہیں، عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود۔"

"اس کا کیا مطلب ہے سر؟"

"اس کا مطلب ہے کہ عاشق سے پہلے عشق معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس بات کو تم ابھی نہیں سمجھو گے، بس اب جاؤ۔ تمھارے والد میرے دوست ہیں، ایسا نہ ہو کہ ان کے سامنے مجھے شرمندگی ہو۔"

"نہیں سر، ایسا نہیں ہوگا۔"

بات چھپی نہیں رہتی۔ چھپ کر دو ایک لڑکوں نے سن لی اور پھیلتی چلی گئی۔ ان کا نام مجنوں پڑ گیا... مجنوں صاحب نے باقاعدہ فارسی کی کلاسیں لینی شروع کر دیں۔ شاعری زور و شور سے ہونے لگی اور اس کم عمری میں کلامِ بلاغت نظام رسالوں اور اخباروں میں چھپنے لگا۔ انگریزی نظم کا ترجمہ بھی چھپا اور کئی نظمیں اور غزلیں بھی... سب کا تعلق اسی محبوبہ سے تھا جو انھیں رد کر چکی تھی۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ بظاہر وہ بے تعلق ہے لیکن دل ہی دل میں اپنی شہرت یا "رسوائی" سے خوش ہوتی ہے۔

شیراز نے اپنی غزلیں اور نظمیں نگہت تک پہنچانے کا پکا انتظام بھی کر لیا۔ اپنی کزن عنبر سے کہا کہ نگہت بہت اچھی لڑکی ہے، تم اس سے دوستی کر لو۔ وہ تم سے بڑی ہے اور بہت سمجھ دار ہے، تمھیں بہت کچھ سکھا سکتی ہے۔ عنبر اس عمر میں تھی جب لڑکیاں اپنی عمر

سے بڑے اور عاقل کزنوں سے بڑی مرعوب ہوتی ہیں اور ان کی ہر بات ماننا اپنا فرض جانتی ہیں۔

نگہت کو عنبر اچھی لگی، سادہ دل اور معصوم سی۔ وہ عنبر سے ملتی رہی اور یوں شیراز کو نگہت کے لیے لکھی نظمیں اور غزلیں پہنچانے کا موقع ملتا رہا۔ مگر شیراز نے پھر کبھی اسے کوئی خط نہیں لکھا اور عنبر کی زبانی یہ بات پھیلتی گئی کہ شیراز بھائی کہتے ہیں کہ وہ اب کسی لڑکی کو پیغام نہیں دیں گے۔ جو لڑکی ان سے شادی کرنا چاہے گی، وہ خود پیغام دے گی۔

پھر ایک دن عنبر کی چھوٹی بہن گیتی نے اپنی امی اور خالہ کو باتیں کرتے سنا اور اس پر یہ انکشاف ہوا کہ عنبر کی پیدائش پر خالہ نے شیراز کے لیے اس کو مانگ لیا تھا۔ گیتی کے لیے یہ اتنا بڑا انکشاف تھا کہ اسے رات کو مشکل سے نیند آئی اور صبح ہی صبح اس نے یہ خبر عنبر کو جا سنائی۔ عنبر نے ذرا بھی اثر نہیں لیا بلکہ بڑی سنجیدگی سے بولی، ”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ نگہت کو چاہتے ہیں اور میں انھیں اپنا بھائی سمجھتی ہوں۔“

جوش میں آن کر گیتی نے فوراً یہ اطلاع امی کو دی اور ڈانٹ کھائی کہ اس عمر میں لڑکیوں کو ان باتوں میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وقت آنے پر بزرگ جو مناسب سمجھیں گے، کریں گے۔

یہ سلسلہ یوں ہی چلتا رہا۔ بات تو پھیل ہی گئی تھی۔ شیراز کی امی اور ان کی بہن نے سوچا کہ جب لڑکا اور لڑکی دونوں راضی ہی نہیں تو بات کو ختم کر دینا ہی بہتر ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ دونوں شیراز کا رشتہ لے کر نگہت کے گھر جا پہنچیں، شیراز کو خبر بھی نہیں ہوئی۔ نگہت کی امی نے کہا، ”ابھی تو شیراز نے بی اے کیا ہے۔ تعلیم ختم کر کے برسرِ روزگار ہوتے ہوتے بہت عرصہ لگے گا۔ ہم اتنے دن انتظار نہیں کر سکتے... ویسے امریکا سے ایک لڑکا آیا ہوا ہے، ہم اس کے رشتے پر غور کر رہے ہیں۔

چند ہی دن بعد شادی طے ہوگئی۔ شادی سے کچھ دن پہلے جو مشاعرہ ہوا اس میں شیراز نے ایک ہندی انداز کی نظم پڑھی جس میں دلہن کی ڈولی کے جانے اور عاشق کی مایوسیوں کا الم انگیز تذکرہ تھا۔

Marfat.com

نگہت تو بیاہ کر امریکا چلی گئی مگر اس کے فراق میں جو شاعری شیراز نے کی، اس نے اس کو سچ مچ شاعر بنا دیا۔

شیراز سے جب بھی شادی کے لیے کہا جاتا، وہ ٹال جاتا۔ آخر ایک دن عنبر کی شادی بھی ہوگئی اور اس کی چھوٹی بہن گیتی کو جانے کیا سوجھی کہ بہن کے ذریعے اپنا پیغام شیراز کو بھجوایا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بچپن سے شیراز کو پسند کرتی ہے اور جس دن شیراز نے کہا تھا کہ جو لڑکی اس سے شادی کرنا چاہے گی وہ خود پیغام بھجوائے گی، اسی دن اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ کام وہ کرے گی۔ سو اس نے کر کے دکھا دیا اور شیراز سے اس کی شادی ہوگئی۔

گیتی سے تو کچھ بھی چھپا نہ تھا، چناں چہ شیراز بھی بے تکلفی سے اپنے عشق کی باتیں اس کے سامنے کیا کرتا تھا۔ اس نے گیتی کو بتایا کہ وہ ہر سال اپنے رد ہونے کی سال گرہ مناتا تھا، اور اس دن کوئی نظم یا غزل لکھ کر نگہت کو بھجواتا تھا۔ نگہت کی شادی کے بعد وہ اس سال گرہ والی نظم یا غزل کی کاپی دریا میں بہا دیتا ہے۔ گیتی نے اس سے کہا کہ اب سے وہ سال گرہ کے لیے لکھی گئی نظم یا غزل کی کاپی دریا میں بہانے کے بجائے اسے دے دیا کرے۔ شیراز اسے چھیڑتا کہ وہ کس قسم کی عورت ہے جو نگہت سے ذرا بھی نہیں جلتی۔ اور وہ کہتی کہ وہ اصلی عورت ہے، اتنی پاگل نہیں ہے کہ اس قسم کے افلاطونی عشق سے جلتی پھرے۔

بہت دن اسپتال میں رہنے کے بعد جب شیراز ٹھیک ہوکر گھر آیا تب ایک دن بڑی سنجیدگی سے گیتی نے اس سے کہا، ''شیراز، سچ پوچھو تو میں نے کبھی تمھارے عشق کو سنجیدگی سے لیا ہی نہیں تھا۔ بچپن کی ایک دھن جو پوری نہ ہوسکی اور تم اسے عشق سمجھ کر خوش ہوتے رہے اور میں بھی اس سے اس طرح لطف لیتی رہی جیسے کوئی بچہ اپنے بچپن کا کوئی کھلونا سنبھال کر رکھتا ہے۔ کبھی کبھی بڑوں کو دکھاتا ہے تو وہ بھی اس کا دل رکھنے کے لیے خوشی کا اظہار کردیتے ہیں۔ دل ہی دل میں خوش تھی کہ تم کسی غیر مرئی چیز کے عشق میں مبتلا ہو۔ تمھیں کسی کے وجود سے دلچسپی نہیں۔ مگر اب جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، اس

Marfat.com

کا یقین کیسے نہ کروں؟''

''کیا دیکھا؟''

''معجزہ۔''

''یعنی میں ٹھیک ہو گیا، جس کی تمھیں امید نہیں تھی۔''

''ہاں، یہ تو ہے ہی مگر اس سے بھی خاص بات کہ کیسے ٹھیک ہوئے۔''

''اس میں عشق کا کچھ ہاتھ نظر آتا ہے۔ کم از کم تمھاری باتوں سے تو یہی اندازہ ہو رہا ہے۔''

''سو فی صد... جب تم کومے میں تھے تو ڈاکٹر کہتے تھے کہ ان کا ہاتھ تھام کر ان سے باتیں کرو، ان کی پرانی باتیں یاد دلاؤ، ایسی باتیں جن سے وہ زندگی کی طرف لوٹیں... میں نے ہزار ہزار طریقے سے تمھیں بلایا، تمھارے پسندیدہ گانے سنائے، تمھیں بہت سی باتیں یاد دلائیں، مگر تم مردہ بنے پڑے رہے...''

''اب یہ زیادتی تو نہ کرو، بنا پڑا نہیں رہا، میں سچ مچ کومے میں تھا۔''

''ہاں، یہی تو بتا رہی ہوں کہ جب میں نے نگہت کا نام لے کر اس کے حوالے سے تمھیں پکارا تو تم میں جان پڑ گئی۔''

''دیکھو گیتی، میں نے کبھی اس سے انکار نہیں کیا... مگر اب بات کو الجھاؤ مت۔ کومے کی شعوری اور غیر شعوری الجھنیں ابھی امریکن ڈاکٹروں کی سمجھ سے بھی بالا ہیں۔ تم جان بوجھ کر کیوں خود کو ان میں الجھا رہی ہو؟''

''میں تو یہ کہہ رہی ہوں کہ اب مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ تمھیں واقعی نگہت سے عشق تھا اور ہے۔''

''تو اب تم کیا چاہتی ہو؟''

''جو اس بات کا منطقی نتیجہ ہونا چاہیے... یقین کرو کہ میرے لیے یہ فیصلہ بہت ہی کٹھن تھا اور ہے لیکن اس کے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔''

''کہنا کیا چاہتی ہو؟''

Marfat.com

''ایک معجزہ تو ہوگیا، اب دوسرا بھی ہو جائے... یعنی اس وقت میں نے تم سے جو کچھ کہا تھا وہ سچ مچ ہو جائے۔''

''مجھے نہیں معلوم تم نے کیا کہا تھا؟''

''کچھ یاد نہیں؟ کچھ تو خیال ہوگا!''

''کچھ یاد نہیں سوائے اس کے کہ تم بار بار کوئی نام لے رہی تھیں... اور پھر کسی نے کہا تھا، آنکھیں کھولو۔''

''ہاں میں تمھارا ہاتھ تھام کر بار بار کہہ رہی تھی، شیراز نگہت آئی تھی، وہ تمھیں بہت پوچھ رہی تھی، تمھیں بہت یاد کر رہی تھی، وہ تم سے بہت باتیں کرنا چاہتی تھی... اور پھر جانے مجھے کیا سوجھی کہ میں نے کہا، لو شیراز وہ نگہت پھر آگئی، اب وہ ہمیشہ تمھارے ساتھ رہے گی، اب تو آنکھیں کھول دو... اور تم نے آنکھیں کھول دیں۔''

''اچھا۔'' شیراز سوچ میں پڑ گیا...'' مجھے یہ سب یاد نہیں، تو اس کا منطقی نتیجہ تمھاری نظر میں کیا ہوا؟''

''یہی کہ تم اور نگہت مل جاؤ۔ میں نے ساری معلومات کرلی ہیں، چار سال ہوئے نگہت کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ وہ کینیڈا میں ہے، اس کا ٹیلی فون نمبر بھی مل گیا ہے... میں تو بہت دن تمھارے ساتھ رہ لی۔ اب میں چاہتی ہوں کہ تمھارا عشق بن جاؤں، اَن چھوئی محبت بن جاؤں اور نگہت چھوئی بن جائے جو اس کا حق ہے۔ اب اس میں جذباتیت نہیں، اسی لیے میں نے کہا کہ منطقی نتیجہ...''

''لگتا ہے کہ تم نے نگہت سے بھی بات کرلی ہے؟''

''تم کرو، میرے پاس نمبر ہے۔''

''میں کیوں کروں، سب کچھ تم کر رہی ہو۔ اور یہ کیوں بھول رہی ہو کہ ہماری شادی کا پیغام کس نے دیا تھا؟''

''وہ بچوں کی سی ضد اب بھی باقی ہے تو اس کا انتظام بھی ہو جائے گا۔ میں ابھی اس سے بات کرتی ہوں۔'' گیتی اٹھ کر چلی گئی۔

Marfat.com

''اتنی جلدی کیا ہے، پھر کبھی کر لینا۔''

''تم نہ جانے کس مٹی کے بنے ہو، میں تمھاری جگہ ہوتی تو ایک منٹ ضائع نہ کرتی، پھر یہ بھی تو سوچو کہ میرے ہی دل میں بے ایمانی آجائے۔ تم جیسے آدمی کو اتنی آسانی سے چھوڑ دینا آسان نہیں۔''

''تو تم جیسی عورت کو چھوڑ دینا کون سا آسان ہے؟'' شیراز نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔

''اچھا اب باتیں نہ بناؤ، مجھے جانے دو۔'' گیتی زبردستی اس سے ہاتھ چھڑا کر اندر کمرے میں بھاگ گئی۔ شیراز وہیں اسی پہلو بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد گیتی واپس آکر اس کے پاس بیٹھ گئی اور ایک طویل ٹھنڈا سانس بھر کر بولی، ''اب یہ بھی نہیں پوچھو گے کہ کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟''

''نگہت نے کہا، اگر مجھے شیراز کا خیال ہوتا تو میں شروع ہی میں اس سے شادی کر لیتی، اتنی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی۔ تم دونوں کا جوڑا مکمل ہے۔ اپنی خوشی کو اپنے ہاتھ سے برباد کرنے کا شوق کیوں ہے تمھیں؟ بیوقوفی کی باتیں مت کرو... اس کے بعد اس نے کہا، شیراز سے میرا سلام کہنا اور پھر ٹیلی فون رکھ دیا۔''

شیراز سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر بولا، ''ٹھیک ہی تو کہا اس نے۔ اسے میرا خیال ہوتا تو بہت پہلے سب کچھ ہو جاتا۔''

''مگر اب میرے دل میں عجیب ڈر سا بیٹھ گیا ہے۔''

''ڈرو مت، اب دوبارہ کومے میں نہیں جاؤں گا۔''

''مجھے لگتا ہے تم عمر بھر کومے میں رہے، صرف وہ وقت جاگتے گزرا جو تم نے خیال و خواب میں نگہت کے ساتھ گزارا۔ پہلے تم سے بات کرتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی تھی۔ اب محسوس ہو رہا ہے جیسے ہمارے درمیان کوئی پردہ آ گیا ہو۔''

''یہ ظلم نہ کرو میرے ساتھ... تم ہی تو ایک میری طرف دار تھیں، ورنہ سب ہی

Marfat.com

میرے عشق کے خلاف رہے۔ تم سے ہی تو سارا دکھ درد کہتا رہا عمر بھر۔"

"لیکن تب تمھاری محبت کی شدت کا احساس کہاں تھا، یہی سمجھتی تھی کہ اگر تمھیں واقعی کبھی عشق تھا بھی، تو اب ہوا اور کھاد نہ ملنے سے کبھی کا مر چکا ہے۔"

"عشق کا پودا کم زور ہو سکتا ہے لیکن بالکل مر جائے اس میں مجھے شک ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ یہ تمھارے اپنے ہاتھ میں ہے کہ جب تک چاہو اسے ہرا رکھو۔"

"نہیں، یہ میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔"

"تو تمھارے دماغ میں ہے۔"

"عشق دماغ میں نہیں دل میں ہوتا ہے۔"

"اگر میں اعتراض کرتی تو نشہ کب کا اتر گیا ہوتا۔"

"شاید... یہ بھی ممکن ہے کہ میں تم پر یہ ظاہر کرتا کہ نشہ اتر چکا ہے۔"

"مگر مجھے اب بھی یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن تمھارے دل سے نگہت کا خیال نکل جائے گا، اچھا ایک وعدہ کرو۔ جب تمھیں یقین ہو جائے کہ تمھارا عشق مر گیا ہے تو مجھے ضرور بتانا۔"

"تم کیا کرو گی؟ اس کا جنازہ دھوم دھام سے اٹھاؤ گی؟ جو چیز خود بہ خود چپکے سے مر جائے، اس کی دھوم دھام کیا کرنی۔"

"مگر میرے دل میں جو ایک بے کلی سی ہے، ایک مشکل تمھارے دل میں حصہ بانٹنے کا جو دکھ ہے وہ ختم ہو جائے تو میرے لیے بڑی بات نہیں؟ میری جیت نہیں؟"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے کہ اسے ہار جیت کا مسئلہ نہ بناؤ، مندر میں بہت سی مورتیاں رہتی ہیں، مگر لڑتی نہیں ہیں۔ سب ہی بھگوان کا اوتار ہیں، پجاری سے تو سب ہی بڑی ہیں، سب ہی اونچی ہیں، بس یہ سمجھ لو۔"

"چلو یہی سہی، شکر کرو کہ میں نے اپنے من مندر میں کئی دیوتا نہیں بٹھائے۔ ورنہ تم سے پوچھتی کہ تمھیں کیسا لگتا ہے؟"

''چلوتم ایک خدا کی بندی ہو... میں کئی اصنام کا پجاری ہوں، مگر میں بھی مجبور ہوں۔''

''اسی لیے تو چپ ہوں... اور پھر یہ روگ بھی خود پالا ہے، تم سے شکایت کیا کروں۔ شکایت تو تب کرتی کہ تم نے مجھے زبردستی اپنایا ہوتا یا مجھ سے کچھ چھپایا ہوتا۔''

''تمھارے لہجے میں دکھ ہے۔''

''دکھی تو ہوں۔ اتنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں۔''

''مگر سوچو تم کتنی مہان ہو، تمھارے سامنے میں کتنا چھوٹا ہوں... میں خود کو بونا لگتا ہوں کبھی کبھی... پھر یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتا ہوں کہ بونا بھی تو قدرت کی طرف سے ہوتا ہے، اس بے چارے کا کیا دوش؟''

Marfat.com

اُلّا کا حلال گوشت

اپریل کا ایک غلیظ دن جب برف کسی بے کس کی نعش کی طرح کئی دن سے بے حرمت پڑی تھی۔ سڑکوں اور پارکنگ پر دھیرے دھیرے پگھلنے والی برف نے سارے علاقے میلے کر رکھے تھے اور مینہ مرے پر سو دُرّے کی طرح جُدا برسے جا رہا تھا۔

''گھر میں گوشت بالکل نہیں ہے۔'' بہو نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ پڑوس میں کل ہی کسی نے بتایا تھا اب شکاگو میں ''ڈیوان'' جانے کی ضرورت نہیں، اپنے چھوٹے سے شہر میں لبِ سڑک بازار میں ایک دکان کسی پاکستانی نے حلال گوشت کی کھول لی ہے۔ دکان کا نام یاد نہ تھا مگر راستے کا اندازہ تھا۔ مل جائے گی، چلا جاتا ہوں۔ جنید صاحب نے سوچا۔ آج بہو کی چھٹی ہے، اس کی گاڑی موجود ہے۔ کل وہ کام پر چلی جائے گی تو اور مشکل ٹھہرے گی۔

دکان یا اسٹور چار چھ امریکن یا میکسی کن دکانوں کے درمیان تھی۔ بورڈ اتنا چھوٹا اور مایوس کن حد تک معمولی تھا کہ دو دفعہ سامنے سے گزر جانے کے باوجود نظر نہیں آیا۔ کسی سے پوچھ کر اندر گلیوں گلیوں لوٹے تو بارش ازسرِ نو شروع ہو چکی تھی۔ گاڑی کھڑی کر کے بھاگتے ہوئے گئے اور دکان کا پرانا سا چرچراتا ہوا دروازہ کھولا۔ کوئی صاحب سامنے کرسی

Marfat.com

پر بیٹھے قرآن مجید پڑھ رہے تھے۔ ایک نظر انھیں دیکھا مگر مطالعہ جاری رکھا۔ کوئی پانچ منٹ بعد قرآن مجید بند کیا، اسے بوسہ دیا، جُزدان میں لپیٹا، کاؤنٹر کے پیچھے گئے اور پوچھا۔

''کیا چاہیے؟''

''حلال گوشت۔'' اس چوکور چہرے والے کو کبھی پہلے بھی دیکھا ضرور ہے۔ جنید صاحب نے سوچا۔

''کتنا؟''

جنید صاحب نے بتایا لیکن دماغ کسی اور ہی الجھن میں تھا۔ اس شخص کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے !... الجھن بڑھتی جارہی تھی، دماغ چکر کھا رہا تھا۔ آخر اس آدمی کو کب اور کہاں دیکھا ہے!...

اُن صاحب نے برف بھری الماری کھولی اور اس میں سے جما ہوا گوشت نکالا۔

''یہ تو سیاہ ہو رہا ہے، بہت پرانا ہے...'' جنید صاحب نے پتھر جیسے گول پولی تھین کے تھیلے پر اُنگلی ماری۔

''پرانا!'' چوکور چہرے والے صاحب نے چشمے کے اوپر سے انھیں گھورا... ''ابھی پچھلے ہفتے گودام سے نکال کر لایا ہوں۔''

''کون سے گودام سے؟'' وہ حیران ہوئے۔

''نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے لایا ہوا گوشت جہاں بھرا جاتا ہے۔''

''نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا سے گوشت آتا ہے، ہوائی جہاز سے؟''

''پانی کے جہاز سے۔'' انھوں نے تصحیح کی۔

''پھر بھی تازہ ہوتا ہے؟''

''چھ ماہ تازہ رہنے کی گارنٹی ہوتی ہے۔''

''حلال؟'' ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''جی ہاں، حلال۔''انھوں نے ڈانٹا۔

جنید صاحب کا دماغ گھومے چلا جارہا تھا۔ کیسی عجیب کیفیت ہوتی ہے ذہن کی

Marfat.com

جب کسی آدمی کو پہچان کر بھی نہ پہچان پا رہا ہو، اس کا نام یاد نہ آ رہا ہو۔ اس سے وابستگی کی شناخت نہ ہو رہی ہو۔ اُلجھن سی اُلجھن... دل چاہتا ہے کسی طرح یہ مسئلہ حل ہو۔ جنید صاحب نے اِرد گرد دیکھا۔ شاید کوئی چیز پہچاننے میں معاون ہو۔ آٹھ نو سال کا ایک بچہ مُہر کی ایک ڈبیہ پر سے روشنائی لگا کر مُہر کو کاغذ پر مار کر ''حلال گوشت'' کی مہریں لگا رہا تھا۔ اسے اس کام میں اتنا مزہ آ رہا تھا کہ وہ کسی اور طرف دھیان بھی نہیں دے رہا تھا۔ اس سے کیا مدد ملتی سوائے اس کے کہ اس کا چہرہ بھی ان صاحب کی طرح قدرے چوکھونٹا تھا۔

''آپ کا نام؟'' جنید صاحب نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' انھوں نے آنکھیں نکالیں۔ ''آپ کو میری بات کا یقین نہیں، رپورٹ کریں گے آپ میری؟ جب آپ اندر داخل ہوئے تھے میں کیا کر رہا تھا، قرآن مجید پڑھ رہا تھا، کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''

''نہیں، نہیں، یہ بات نہیں ہے صاحب، آپ خواہ مخواہ برا مان رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، حالاں کہ میں پہلی مرتبہ آپ کو دیکھ رہا ہوں۔''

''دیکھا ہوگا... نماز میں، مسجد میں، عید میں یا بازار میں۔''

''نہیں جناب، ابھی نہیں، بہت پہلے کبھی... اسی لیے آپ کا نام پوچھا، ٹھہریے میں پہلے اپنا نام بتاتا ہوں، شاید آپ یہ پہیلی بوجھ سکیں۔ میرا نام جنید ہے۔ جنید شیخ...''

''اور آپ کے والد کا نام عبید۔''

''جی بالکل... آپ تو پہچان گئے۔'' جنید صاحب نے خوش ہو کر کہا، ''اب مجھے اپنی پہچان کرائیے...''

''نہیں۔'' وہ صاحب کھل سے گئے ''ابھی نہیں۔'' وہ بچوں کی طرح مچل گئے کہ ابھی کسی حالت میں نہیں بتائیں گے۔

''آپ مجھے اپنا پتا دیں... میں اپنی دُکان کا کام ختم کر کے آپ کے پاس

Marfat.com

آتا ہوں...''

''کم از کم نام تو بتایئے۔'' جنید صاحب نے کہا، ''میں یاد کرنے کی کوشش کروں۔ اُلجھن بھی ہے اور شرمندگی بھی کہ آپ مجھے پہچان گئے اور میں آپ کو نہ پہچان سکا...''

''کوئی بات نہیں، چند گھنٹے اور سہی۔''

''نہیں نام بتایئے...'' جنید صاحب نے اصرار کیا۔

''رحمت اللہ...'' انھوں نے کہا اور گوشت کی طرف متوجہ ہوئے۔

جنید صاحب کے ذہن میں جب بھی گھنٹی نہ بجی تو خجالت مٹانے کو وہ بھی گوشت تلوانے لگے۔

ایک مرغی، قیمے کا ٹھنڈا یخ پتھر اور بکرے کا گوشت لے کر انھوں نے بٹوا نکالا تو انھوں نے پیسے لینے سے نہ صرف انکار کیا بلکہ اس انکار پر بے حد اصرار کیا۔

''گھر آؤں گا تو لے لوں گا۔'' انھوں نے کہا اور جنید صاحب کی طرف ایک کاپی بڑھا دی کہ اس پر نام پتا لکھ دیں۔ جنید صاحب نے نام، پتا اور فون نمبر لکھ دیا اور گوشت کا تھیلا اٹھا کر باہر نکل آئے۔

بارش دھیمی ہو چلی تھی۔ اِکا دُکا بوندیں سر پر گرتیں اور جیسے ذہن میں کوئی کہتا، ''رحمت اللہ، رحمت اللہ۔'' اور ذہن کے پردے پر ایک چوکور چہرہ اُبھرتا، اتنا چوکور کہ ہزاروں لاکھوں میں کوئی ایک ہوتا ہوگا۔ بھولنا نہیں چاہیے تھا مگر بھول گئے اور یہ ایک خیال ذہن کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہا جس سے وہ پریشان رہے۔ نہ شناخت ہوتی نہ اسے بھولتے جیسے وہ چہرہ ان کے دماغ میں چپک کر رہ گیا ہو۔ ان حضرت کے بچپنے پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی۔ اسی وقت تفصیلی بات بتا دیتے تو ان کا کیا بگڑ جاتا۔ اصل غصہ تو خود پر ہی تھا کہ وہ صاحب نہ صرف انھیں پہچان گئے بلکہ والد کا نام بھی بتا دیا اور ایک وہ تھے کہ ابھی تک ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

سارا دن طبیعت الجھتی رہی۔ شام کو بیٹے نے بتایا کسی رحمت اللہ صاحب کا

فون تھا، وہ ہمارے گھر کے لیے نکل رہے تھے، پتا پوچھ رہے تھے، میں نے سمجھا دیا ہے۔

''اچھا کیا...'' جنید صاحب نے کہا۔

''کون صاحب ہیں، کیا ہمارے ساتھ کھانا کھائیں گے؟'' بہو نے پوچھا۔

''دیکھا جائے گا، انھوں نے گول مول سا جواب دیا۔''زیادہ دیر بیٹھے اور کھانے کا وقت ہوا تو کھالیں گے۔ کسی اہتمام کی ضرورت نہیں۔''

''جی اچھا...'' بہو گومگو میں چلی گئی۔''شاید وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کوئی دوست رشتے دار ہیں یا کوئی جان پہچان والے ہیں...'' اسے کیا بتاتے، دماغ میں برابر کھچڑی پک رہی تھی۔ یکایک ذہن کے کمپیوٹر نے کسی چاق چوبند سیکریٹری کی طرح مسئلے کا حل سامنے رکھ دیا... اسکرین پر یہ کہانی درج تھی...

۴۷ء سے پہلے کی بات ہے جب وہ ہندوستان کی ایک ریاست میں رہتے تھے۔ اپنی کالج کی ٹیم کے ساتھ کھیلنے کے لیے دِلّی گئے تھے اور مع کپتان اس ہوٹل میں ٹھہرے تھے جس کا نام انگریزی میں تھا مگر اردو میں شاہانہ ہوٹل کہا جاسکتا ہے۔ ٹیم کے سارے کھلاڑیوں سے پوچھا گیا کہ وہ کون سا کھانا پسند کریں گے انگریزی، ہندو یا مسلم... ہندوؤں نے ہندو کھانا کہا، وہ واحد مسلمان تھے۔ سارے کھانوں کا مزہ چکھے ہوئے تھے انھوں نے کہا۔ ناشتہ انگریزی، باقی دو وقت پکا مسلم کھانا۔

کھیل شروع ہونے میں دو ایک دن تھے۔ پہلا دن سیر کے لیے وقف ہوا۔ قطب مینار، لال قلعہ اور جامع مسجد کی سیر سے لوٹے تو بھوک سے بلبلا رہے تھے۔ وہ تنہا مسلمان تھے اس لیے بیرا دوڑ کر مسلم کھانا لے آیا۔ مُرغ پلاؤ، رائتہ، چٹنی اور میٹھا۔ ان کا کھانا دیکھ کر ہندو ساتھی اور تلملانے لگے۔ آخر بھگوان بھگوان کر کے ان کی باری آئی۔ آیا کیا دال! مگر وہ اسی پر ٹوٹ پڑے اور اس طرح ٹوٹے کہ انگلیاں چاٹنے لگے۔ کھاتے جائیں اور دال کی تعریف کرتے جائیں۔ جنید خان تو ڈٹ کر کھا چکے تھے دال کی اتنی تعریف سنی تو کھٹکے کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے یا کچھ اور مرچ مصالحہ ہے۔

سب سے پہلے تو انھوں نے اس چھوکرے بیرے کو بلایا جس کا چہرہ کیرم بورڈ

Marfat.com

کی طرح چوکھونٹا تھا۔

"کیا نام ہے تمھارا۔" انھوں نے پوچھا۔

لڑکے نے بڑی بڑی کالی آنکھوں سے انھیں شبہے سے دیکھا اور جھجکتا ہوا بولا،

"دین دیال۔"

شکل سے یوں بھی ہندو نہیں لگتا تھا اور دین دیال تو بالکل ہی نہیں لگ رہا تھا۔

"اچھا جاؤ۔" تھوڑی سی ٹپ دے کر اسے رخصت کیا۔ پھر خود ٹہلتے ٹہلتے اس کے پیچھے باورچی خانے کی طرف گئے اور دُور سے جھانکی لیتے رہے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ دین دیال ایک پتیلی نکال کر ڈونگے میں ڈالتا دوسری پتیلی سے گھی میں ڈوبا خوش بو دار شوربا نکال کر دال پر رکھی ہوئی چھلنی میں ڈالتا پھر دال کو خوب چمچے سے ہلاتا جلاتا اور کھانے کے کمرے میں لے جاتا۔ آخر جنید صاحب "مسلمان بچہ" تھے، خوش بو گوشت کی یوں سونگھ لی جیسے بلی دور سے چھیچھڑے کی بو سونگھ لیتی ہے۔

اب کی دین دیال خالی ڈونگا لے کر باورچی خانے کی طرف چلا تو راہ میں جنید صاحب نے گردن سے پکڑ لیا۔ عمر تو زیادہ نہ تھی مگر تگڑے تھے۔ جوانی اور کھلاڑی ہونے کی اکڑ بھی تھی۔ باپ ریلوے میں افسر تھے، اس کا بھی کچھ غرور تھا۔ کونے میں لے جا کر بولے، "سچ بتا دال میں کیا ملایا تھا؟"

دین دیال نوعمر تھا، بیرا تھا، ڈر گیا۔ تھر تھر کانپنے اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ انھوں نے اور اکڑ کر کہا، "سچ نہیں بولا تو ہڈیاں پسلیاں توڑ دوں گا..."

دین دیال نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ میری نوکری جائے گی اور جانے کیا کیا ہوگا۔

جنید صاحب نے کہا کہ تیری نوکری نہیں جائے گی اس کا وعدہ ہے البتہ سچ نہیں بتائے گا تو تیری جان جائے گی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے بتایا کہ میرا نام رحمت اللہ ہے۔ ہندو مسلمان دونوں کو کھانا کھلاتا ہوں۔ مسلمانوں کو ہندو نام سے پرہیز نہیں لیکن ہندو مسلمان کے ہاتھ کا پروسا نہیں کھاتے اس لیے کوئی پوچھتا ہے تو دین دیال بتا دیتا ہوں۔

Marfat.com

دال کے بے بدل مزے کا راز یہ ہے کہ گوشت کا شوربا بناتے ہیں۔ اسے اچھی طرح چھلنی میں چھان لیتے ہیں کہ کوئی ہڈی کا ریزہ یا بوٹی کا ریشہ نہ چلا جائے۔ اسے دال میں ملا کر کھلاتے ہیں۔ دال کا مزہ شوربے سے بنتا ہے، نمک، مرچ، ہلدی اور ہینگ سے نہیں بنتا حضور۔ یہ بات صرف دو لوگوں کو معلوم ہے ایک میں اور ایک ہوٹل کا مالک جو ہوٹل کا منیجر بھی ہے۔

جنید صاحب اس کہانی سے خاصے محظوظ ہوئے۔ نوجوانی کا زمانہ تھا، آگے پیچھے کی اتنی فکر نہ تھی۔ دین دیال سے پیٹ پر لات نہ مارنے کا وعدہ کر چکے تھے اس لیے بس یہ کیا کہ اپنے کپتان صاحب سے اکیلے میں کہا کہ دھرم تو آپکا بھرشٹ ہو چکا، اب کسی بہانے سے کسی اور ہوٹل کا رخ کیجیے۔ شور کیا تو ہوٹل کا مالک دشمن ہو جائے گا۔ پرائے شہر میں خدا جانے کیا گزرے، کہاں کورٹ کچہری کرتے پھریں گے۔ بات اُڑے گی، وطن پہنچے گی تو دنیا ہنسی اڑائے گی۔ پرائشچت کے لیے جانا پڑے گا، سو وہ الگ ڈنڈ پڑے گا۔ کپتان ہرنام جی یا پرنام جی (اب کہاں یاد رہا ہے) بات کو پا گئے۔ اپنے ساتھیوں کو لے کر دوسرے ہوٹل میں اُٹھ گئے۔

جنید صاحب کا خیال تھا کہ خود اسی ہوٹل میں رہیں گے۔ دو انڈوں کے ساتھ بھرپور ناشتا اور دونوں وقت مرغِ مسلم نگلتے رہیں گے لیکن زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ ہوٹل کا مالک ٹہلتا ٹہلتا آیا۔ موسم کی بات کی، کھیل کی بات کی۔ بعد ازاں کہنے لگا ساری ٹیم کا ایک جگہ رہنا ہی اچھا ہے۔ مانا دونوں ہوٹل نزدیک ہیں پھر بھی آپ کا تنہا یہاں رہنا مناسب نہیں، بوریا بستر باندھیے اور وہیں اُٹھ جائیے۔ جنید صاحب سمجھ گئے کہ ہم دردی میں نہیں کہہ رہا بات کچھ اور ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد دین دیال بھی آ پہنچا۔

''صاحب!'' مسکینی سے بولا، ''آپ کا سامان باندھ کر آپ کے ساتھ ہی چلا چلوں گا...''

''کیوں؟'' جنید صاحب حیران ہوئے۔

منیجر نے نکال دیا۔ شاید آپ کو اور مجھے باتیں کرتا دیکھ لیا یا ساری ٹیم کے ہوٹل

Marfat.com

چھوڑنے سے سمجھ گیا۔ رویا پیٹا تو مارنے کی دھمکی دی۔ تنخواہ مانگی تو بولا، ''بچو ابھی تو تنخواہ کاٹ رہا ہوں، اگر زبان کاٹ کر رکھ لیتا تو کیسی رہتی۔''

جنید صاحب کو احساس تھا کہ ان کی وجہ سے اس کی نوکری گئی۔ سوچا والد صاحب سے کہہ کہلوا کر ریلوے میں رکھوا دوں گا درجنوں گینگ مین بھرتی ہوتے رہتے ہیں۔ سو رحمت اللہ سامان باندھ کر ان کے ساتھ تانگے میں بیٹھ دوسرے ہوٹل میں آ گیا۔ خوب ساری ٹیم کی خدمت کی۔ بعد میں کھلا کہ فٹ بال کا شوقین تھا اور خود بھی اچھا خاصا کھیلتا تھا۔

جنید صاحب نے ریلوے میں ملازم رکھوا دیا تو ریلوے کی ٹیم میں شامل ہو گیا اور بعد میں نمبرون کھلاڑی مانا جاتا تھا۔ بس جنید صاحب کو اتنا ہی معلوم تھا۔ بٹوارہ ہوا تو وہ والدین کے ساتھ پاکستان چلے آئے اور پھر کبھی رحمت اللہ عرف دین دیال کو نہ دیکھا۔

''رحمت اللہ صاحب آئے ہیں۔'' ایک بچے نے اطلاع دی۔

''بلا لو...'' جنید صاحب نے کہا۔

رحمت اللہ اندر آئے تو جنید صاحب نے ہاتھ بڑھایا۔

''آپ کو ہمارا اتا پتا یاد آیا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی... تو تم دین دیال ہوٹل والے ہو...''

''اب تو رحمت اللہ گوشت والے ہیں۔'' انھوں نے فی البدیہہ کہا اور خوب ہنسے۔

''دال اور گوشت سے تمھارا پرانا تعلق ہے۔'' جنید صاحب ہنس کر بولے، ''اچھا یہ بتاؤ پھر دین دیال تو نہیں بنے...''

''نہیں صاحب، مگر ہمارے نام کے ساتھ کچھ نہ کچھ مذاق ہوتا ہی رہا۔ ایک مرتبہ فسادات میں پھنس گیا۔ لوگوں نے نام پوچھا، ذات پوچھی۔ خود کو عیسائی ظاہر کیا۔ اے ڈین نام بتایا تب چھٹکارا ملا۔ کراچی میں ایک ہوٹل اے دین کے نام سے کھولا تو لوگ بے دین ہوٹل کہنے لگے۔ امریکا آنے لگے تو فارم میں رحمت پہلا اور اُلا آخری نام ہو گیا۔

Marfat.com

اب سارے بچے ''اُلا'' کہلاتے ہیں۔ بے تکلف دوست اُلو بھی کہہ دیتے ہیں۔ یہاں کچھ تو نام کو مختصر کرنے کا شوق بھی ہے، کچھ تشدد کے ساتھ اُلا کہنا بھی مشکل ہے اس لیے اُولا سے اب تو فقط ''اُو'' رہ گیا ہے۔ جہاں کام کرتے ہیں مرد عورتیں سب ''اُو'' کہتے ہیں اور ان اُلوؤں کو کبھی خیال بھی نہیں آتا کہ رحمت اللہ سے خالی خولی ''اُو'' ہوگئے۔ وہ کیا شعر ہے صاحب، آپ نے سنا ہوگا۔ ''اُوئی کو اُوں کہنے لگے...''

جنید صاحب ہنسے۔ ذہن پر زور ڈالا۔ ہاں یاد آیا:

دلبرانِ لکھنؤ اُوئی کو اُوں کہنے لگے
بس گئے پنجاب میں روئی کو رُوں کہنے لگے
آپ کو تم، تم کو تو، اور تو کو توں کہنے لگے

رحمت اللہ خوب ہنسے۔ سنجیدہ ہوئے تو چاروں طرف دیکھا۔ پھر قدرے افسوس سے گویا ہوئے، ''آپ کے والد کے پاس ہندوستان میں کتنا بڑا بنگلہ تھا۔''

''ارے، میرے پاس پاکستان میں اس سے بھی بڑا مکان ہے، مگر بیٹے کو امریکا راس آگیا ہے۔ ہمارے والد نے ہندوستان میں قسمت آزمائی کی ایک ریاست میں جا کر، ہم نے پاکستان میں، اب ہمارا بیٹا امریکا میں کر رہا ہے۔ ہمارے دادا کی جائیداد والدین کو راس نہ آئی، ہماری جائیداد ہمارے بچوں کی قسمت میں نہیں، کیا کیا جائے۔''

''آپ یہاں خوش ہیں؟''

''ہاں، خوش ہی ہیں، بس ایک بات ہے...'' جنید صاحب نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''یہاں دفن ہونے کو جی نہیں چاہتا...''

''اجی آپ کی ابھی کون سی عمر ہے۔ بچوں، پوتوں اور نواسوں کے ساتھ رہیے، پھر دیکھا جائے گا... میں آپ کے پاس ایک عرض لے کر حاضر ہوا تھا۔''

''کہو... کیا بات ہے؟'' جنید صاحب نے پوچھا۔

''میں اب اپنی بزنس شروع کر رہا ہوں، چاہتا ہوں آپ اس میں حصے دار

Marfat.com

بن جائیں۔''

''کیسی بزنس؟'' جنید صاحب نے پوچھا۔

''آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں جب بھیڑ بکری کی تعداد زیادہ ہوجاتی ہے تو انھیں شوٹ کر دیتے ہیں۔ جان نکلنے سے پہلے انھیں ذبح کر کے دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ میں بھی یہی بزنس کرنے کا سوچ رہا ہوں یعنی خود ہم یہ کام کریں بجائے دوسروں کا منگوایا ہوا گوشت بیچنے کے...''

''نہیں بھئی شکریہ، میں یہ کام نہیں کرسکتا۔'' جنید صاحب نے کہا۔

''کیوں نہیں؟''

''مجھ میں وہ چیز نہیں ہے جسے تجارتی حس کہتے ہیں۔''

''آپ کو کسی بات کی پریشانی نہیں ہوگی، نہ آپ کی کوئی ذمہ داری ہوگی۔ جی چاہے تو کبھی کبھار دکان پر آجایئے گا۔ یہ بھی نہیں تو نہ سہی۔''

''پھر مجھے حصے دار بنانے کا فائدہ؟''

''فائدہ نہیں صاحب، محسن کا احسان اتارنا بھی ضروری ہے۔ آپ اور آپ کے والد میرے کام آئے تھے میں آپ کے کام آنا چاہتا ہوں...''

''بھئی آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جا کر بکرے ذبح کر کے بیچنا میرے بس کا نہیں ہے۔''

''اچھا تو کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے، یہیں کاروبار کریں گے، میں نے دیکھ لیا ہے۔''

''کیا دیکھ لیا ہے؟''

''جب آپ صبح دکان میں آئے تھے تو میں کیا کر رہا تھا، قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ نہیں؟''

''ہاں۔''

''ایک عرب بھائی نے بتایا تھا کہ وہ گوشت کھانا حرام ہے جس پر غیر اللّٰہ کا نام

لیا گیا ہو۔میں نے کہا، میں خود تسلی کروں گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ یوں کریں گے کہ گوشت ہم یہیں سے خریدیں گے۔ عام گوشت جس پر کسی کا نام نہ لیا گیا ہو۔ بہت سی مہریں میں نے بنوالی ہیں۔ اللہ کا نام لیتے جائیں گے ٹھپّا لگاتے جائیں گے...کیا خیال ہے؟''

انھوں نے اپنی جیب سے ایک مُہر نکالی، ایک ڈبا نکالا۔ مہر کو ڈبّے کی روشنائی پر رکھ کر انھوں نے مُہر اپنی چوڑی کلائی پر رکھ کر دبائی۔ اس پر نہایت واضح الفاظ میں اردو اور انگریزی میں اُبھر آیا:

اُلاّ کا حلال گوشت...

Marfat.com

گلی گنونتا

''ہائے۔''

''ہائے۔''

''آنٹی، آیئے نا، کہاں جارہی ہیں آپ؟''

''میں ذرا ڈاکٹر کے پاس...''

نہیں میرے پاس بیٹھیے۔ ماں نے کہا تھا، آپ آئیں گی میرے پاس بیٹھنے کے لیے۔''

''میں؟... میں تو تمھاری امی کو جانتی بھی نہیں۔''

''مگر میری ماں تو آپ کو جانتی ہیں اور میں بھی۔ آپ روز شام کو واک کے لیے جاتی ہیں اور تین گھر چھوڑ کر رہتی ہیں۔''

''اچھا میرا نام بتاؤ؟''

''پہلے آپ بتایئے۔''

''سیتا،'' میں نے چھیڑنے کو غلط نام بتایا۔

''ہاں، ماں نے یہی کہا تھا کہ سیتا آنٹی آن کر تمھارے پاس بیٹھیں گی۔''

Marfat.com

''ماں کہاں ہیں؟''

''پاپا کو لینے اسٹیشن گئی ہیں۔''

''تو تم ان کے ساتھ کیوں نہیں چلے گئے؟''

''میں سو رہا تھا۔''

''تو پھر تمھاری ماں نے تمھیں کیسے بتایا کہ میں تمھارے پاس آ کر بیٹھوں گی؟''

''میں سوتے میں بھی سن لیتا ہوں۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔''

''آیئے، بیٹھے نا۔''

''ماں باہر سے تالا لگا کر گئی ہوں گی، تم نے اندر سے کھول لیا۔''

''ہاں۔''

''اور اب تمھیں ڈر لگ رہا ہے۔''

''نہیں تو... بالکل بھی نہیں۔''

''تو تم اندر جا کر دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤ، ماں تھوڑی دیر میں آجائیں گی۔''

''نہیں ماں نے کہا تھا باہر سیڑھیوں پر بیٹھے رہنا۔ آنٹی آن کر وہیں بیٹھ جائیں گی۔''

''تم نے گھر کا دروازہ بند کر دیا ہے۔''

''ہاں۔''

''چابی کہاں ہے؟''

''ماں نے کہا تھا یہ مت بتانا کسی کو۔''

''تمھاری عمر کیا ہے؟''

''تقریباً پانچ سال۔ آیئے بیٹھیے آنٹی۔''

''اچھا، ایک شرط پر، تم مجھے نظمیں سناؤ گے!''

''ضرور آپ بیٹھیں تو۔''

Marfat.com

میں ہاتھ سے سوکھے پتے جھاڑ کر سیمنٹ کی سیڑھی پر اس کے برابر بیٹھ گئی۔

''کون سی پوئم؟''

''بابا بلیک شپ۔''

''یہ تو مجھے یاد نہیں۔''

''ٹوئنکل ٹوئنکل لٹل اسٹار۔''

''یہ بھی یاد نہیں۔''

میں سمجھ گئی وہ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہے جیسے بھی ہو، اس کی نگاہیں سامنے سڑک پر مڑنے والی ہر کار کو بے تابی سے دیکھ رہی تھیں۔

''اچھا تو جو پوئم یاد ہو وہ جلدی سے سنا دو ورنہ میں چلتی ہوں۔ میں اٹھنے لگی۔''

''سناتا ہوں بیٹھیے۔''

''میں بیٹھ گئی۔''

''پہلے یہ بتائیے آنٹی آپ کو کاغذ کا جہاز بنانا آتا ہے؟''

''نہیں۔''

''کشتی؟''

''نہیں۔''

''بٹوہ؟''

''نہیں۔''

''مجھے یہ سب بنانے آتے ہیں، دکھاؤں آپ کو؟''

سامنے گھاس پر سے ایک مڑا تڑا کاغذ اٹھا کر اسے صاف کرنے لگا۔

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''رومی۔''

''رومی نظم سنا رہے ہو یا میں چلوں؟''

Marfat.com

''سوچ رہا ہوں۔'' کاغذ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کون سی نظم سناؤں؟''

''بس سوچنے کے لیے پانچ سیکنڈ ہیں اور اب چار۔'' تین وہ بابا بلیک شپ، ہیویو اینی ول... ایک کے بعد ایک وہ ساری نظمیں سناتا چلا گیا جن کے بارے میں کہہ رہا تھا کہ یاد نہیں۔ سامنے سڑک پر ایک کار رکی۔ وہ لپک کر گیا۔ اس کے ماں باپ اترے۔ رومی ماں کا ہاتھ پکڑ کر لایا اور میرا تعارف کرایا:

''ماں سیتا آنٹی بہت اچھی ہیں، اتنی دیر میرے پاس بیٹھی رہیں۔ انھیں چائے پلائیں نا۔'' رومی اپنے باپ کا ہاتھ پکڑ کر اندر بھاگ گیا۔

ماریے بوم

یونی ورسٹی کی عمارتوں کے درمیان ایک پرانے چرچ کے بیس منٹ میں پندرہ لوگ جمع تھے۔ ڈاکٹر گرائن بوم کا انتظار تھا۔ نورا حسبِ معمول بہت اتھارٹی سے بول رہی تھیں۔ میں پہلی مرتبہ آئی تھی اور امریکا میں اس بوسیدہ چرچ میں یہ ادبی میٹنگ دیکھ کر خاصی مایوس ہو رہی تھی۔ چرچ ایئر کنڈیشنڈ نہ تھا۔ زیرِ زمین ہونے کی وجہ سے خنکی تھی اور اوپر سے ہوا، کچھ زینے سے اور کچھ کھڑکیوں سے اندر آ رہی تھی۔

جگہ جگہ رنگ اُتری میزیں پڑی تھیں۔ چند پر کاغذات بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ نوٹس بورڈ پر ایسی ہی چند مفلوک الحال میٹنگوں کی تاریخیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں کافی میکر اور پاس ہی ٹوکری میں کتھئی رنگ کے نیپکن میں چند ڈونٹ رکھے تھے۔ چرچ میں اگلے اتوار کو کوئی خیراتی میلا ہونے والا تھا۔ اس کے لیے بھورے رنگ کے دبیز کاغذوں کے تھیلے ایک کونے میں دھرے تھے۔

"Here he comes" کے نعرے پر مُڑ کر دیکھا تو ایک پستہ قد گنجے سے امریکن مسکراتے ہوئے اندر آئے۔ اُن کے ساتھ ایک خاتون بھی تھیں۔ خاتون امریکن لباس میں تھیں، گوری بھی تھیں مگر امریکن نہیں لگتی تھیں۔ اس بات کا تجزیہ کر رہی تھی کہ نورا

Marfat.com

نے ان سے میرا تعارف کروایا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے، ایک میں ہی اجنبی تھی۔

''ڈاکٹر گرائن بوم... بیگم ماریے بوم... ماریے ایران کی رہنے والی ہیں... نور جہاں، پاکستانی رائٹر...''

دونوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ماریے نے بطورِ خاص میرا ہاتھ دبایا اور بڑے خلوص سے قدرے سرگوشی میں پوچھا،''ہاؤ آر یو...''

''آئی ایم فائن... تھینک یو۔'' طوطے کی طرح رٹا ہوا فقرہ میں نے دُہرایا۔

''گڈ'' کہہ کر وہ بڑی مٹھاس سے مسکرائیں اور دھیرے سے کہا،''ہمیں دیر ہوگئی... میٹنگ کے بعد بات کریں گے۔''

نورا نے فوراً ہی میٹنگ کا ڈول ڈالا۔ وہ اپنے زیرِ تصنیف ناول کے اقتباس کئی ہفتوں سے سُنا رہی تھیں۔ وہ بطورِ خاص ڈاکٹر بوم کی رائے سے استفادہ کر رہی تھیں۔ اگر ایڈیٹنگ کے لیے ناول ان کو دیتیں تو پیسے لیتے، وہ بھی بہت زیادہ۔ اب ادبی تنقید کے بہانے ان کی رائے مل جاتی تھی جن سے وہ فائدہ اُٹھاتی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی بعض لوگ کام کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ بے چاری ناول دسیوں ناشروں کو بھیج چکی تھیں مگر ہر جگہ سے ایک آنچ کی کسر کے ریمارک کے ساتھ واپس آجاتا تھا۔ اس کے باوجود وہ خود کو ''رائٹر'' ہی کہتی تھیں۔ یہاں جو لکھتا ہو وہ مصنّف ہے جو چھپ چکا ہو وہ پبلشڈ رائٹر ہے اور اس کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہے۔

سب ایک میز کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ پروفیسر بوم درمیان میں تھے، اُن کے ایک طرف نورا تھیں، دوسرے پہلو میں ماریے تھیں۔ نورا نے ناول کا باب پڑھنا شروع کیا۔ ناول گزشتہ سے پیوستہ تھا، کئی ہفتوں سے پڑھا جارہا تھا اس لیے میں اس کی کہانی سے نا آشنا اور کرداروں سے نامانوس تھی۔ نورا کو پڑھنے کا سلیقہ تھا۔ آواز کے زیر و بم اور مکالموں میں گالم گلوچ کی حد تک صاف گوئی نے میری توجہ اس طرف رکھی۔ ناول میں کچھ نئی تکنیک ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ابواب میں مونولاک تھے جن میں مکالمے بھی در آئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد توجہ بھٹکنے لگی۔ سامنے کھڑکی بھر گھاس کا قطعہ میرے سامنے تھا جس زمیں الی نوائے ریاست کا خاص پرند کارڈینل اپنے بھورے رنگ اور نارنجی شیڈڈ پروں کے ساتھ نارنجی کلغی سجائے مغرور اور مسرور اِتراتا پھر رہا تھا۔ درختوں پر سے چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں... یہ سب دیکھتے ہوئے میں ماریے بوم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ امریکن نہیں لگ رہی تھیں کیوں کہ وہ امریکن نہیں ہیں۔ ان کا رنگ صاف ہے لیکن امریکنوں کی سی سفیدی نہیں۔ بال بھورے ہیں لیکن مصنوعی سے نہیں لگتے۔ امریکنوں کے بالوں میں عموماً اتنا گھن بھی نہیں ہوتا۔ ماریے کے بالوں میں اتنا گھن تھا کہ سر ہلانے پر سارے بال یوں جنبش کرتے جیسے سر میں اُگے ہوئے نہ ہوں بلکہ الگ سے رکھے ہوں۔ وِگ بھی نہیں تھی مگر کہیں کہیں سے رنگے ہوئے تھے کیوں کہ ان میں گہرے اور ہلکے شیڈ تھے جیسے گھنے درختوں کے جنگلوں میں ہوتے ہیں۔ آنکھیں بالوں سے زیادہ مشرقی تھیں۔ ان میں سیاہی کے علاوہ گہرائی بھی تھی... چہرے کے نقوش کا تیکھا پن بردباری سے مل کر بتا رہا تھا جیسے انھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے۔

'سردوگرم زمانہ چشیدہ۔' فارسی کے یہ الفاظ ذہن میں آئے تو میں مسکرا دی۔ اس رعایتِ لفظی پر کہ فارسی محاورے کو بطورِ خاص ایرانی خاتون سے نسبت تھی۔ اسی وقت ماریے بھی اپنے سفید ہموار دانت نکال کر مسکرائیں۔ وہ بھی شاید ناول کے ابواب سے زیادہ میری شخصیت میں اُلجھی ہوئی تھیں۔

ناول مونو لاگ کی بھول بھلیوں سے نکل کر بچپن کے فلیش بیک میں جا پہنچا تھا۔ بیٹا اپنی ماں کی اپنے باپ سے بے وفائیاں دیکھتا رہا تھا۔ ان باتوں کا اس کی شخصیت پر کیا اثر ہوا تھا، اب بڑے ہونے کے بعد وہ ان پر سے پردہ ہٹا رہا تھا۔ ان باریک پسِ پردہ حرکتوں پر سے پردہ ہٹاتے ہوئے بھی نورا کی آواز اسی طرح دبنگ تھی۔ وہی رفتار تھی اور اہی اُتار چڑھاؤ۔

ڈاکٹر بوم سر جھکائے غور سے سُن رہے تھے۔ بظاہر سب ہی دلچسپی سے سُن تھے، کچھ آنکھیں کھول کر، کچھ آنکھیں بند کر کے۔ نائیجیریا کا ایک نو آموز مصنف

چپکے چپکے اپنے سامنے رکھے کاغذ پر کچھ لکھتا جا رہا تھا۔ میں دُزدیدہ نگاہوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، جس ناول میں شروع سے ہی دلچسپی نہیں تھی، اب زبان کا چٹخارہ بھی بدمزہ کر رہا تھا۔ باری باری سب اُٹھ کر کافی لا چکے تھے۔ میں نے سوچا اسی بہانے میں بھی ٹانگیں سیدھی کرلوں۔ میں کافی میکر کے پاس گئی۔ کافی بنائی اور ایک کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا۔

ایک ہوٹل کی دومنزلہ عمارت کی کھڑکیوں کی روشنیاں بالکل ٹرین سے مشابہ تھیں، یاد آیا۔ بچپن میں ٹرین گھر کے سامنے سے گزرتی تھی تو ہم کس ذوق وشوق سے دیکھا کرتے تھے۔ سارے ڈبوں کے دروازے کُھلے ہوتے تھے اور اکثر ان چوکھٹوں میں انسانی سائے کھڑے نظر آتے تھے۔ روشنیوں کے چوکھٹے کھٹاکھٹ کی آواز کے ساتھ نگاہوں کے سامنے سے گزرے چلے جاتے تھے۔ اس ٹرین اور اس روشنی اور دروازوں میں کھڑے ہیولوں کے ساتھ ایک خاص جذبہ دل میں اُبھرتا تھا۔ یہ ہیولے کہیں پہنچنے کے منتظر ہیں اور کوئی بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا ہے ... اتنے سال بعد اس ٹرین جیسی عمارت میں چوکھٹوں میں جڑی روشنیاں اسی پرانے تصور کو زندہ کر رہی تھیں اور وہ تصور اسی جذبے کو اُبھار رہا تھا جو مدت ہوئی دل میں تھا۔ انسان بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل میں زندہ رہتا ہے۔ شاید نورا یہی بات اپنے طویل ناول میں کہنا چاہ رہی تھیں۔

خدا خدا کر کے ابواب ختم ہوئے اور تنقید شروع ہوئی۔ میں اپنی کافی کی پیالی لے کر اپنی جگہ آن بیٹھی۔ ایک جوان لڑکے نے ناول کے بارے میں چند باتیں کہیں جسے سب نے اور بطورِ خاص نورا نے بُری طرح نظر انداز کیا۔ ایک بڑی بی نے کچھ ملی جلی تعریف وتنقید کی۔ نورا نے اس کا بھی اثر نہ لیا۔ آخر میں پروفیسر بوم بولے۔ اس پر نورا جلدی جلدی کاغذ پر نوٹس لینے لگیں۔

نورا کا کام ختم ہوگا تو یقیناً یہ میٹنگیں بھی بند ہو جائیں گی... میں نے دل میں سوچا۔ نورا نے مجھے بھی ایک عدد نفری بڑھانے کے لیے استعمال کیا تھا، اسے میری تنقید سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی اس لیے میں کچھ نہ بولی بلکہ دل ہی دل میں سوچنے لگی کہ میٹنگ

Marfat.com

مزید طویل ہوئی تو چپکے سے بھاگ نکلوں گی۔ نورابی لے کر آئی تھیں کہیں بُرا نہ مانیں، کار بھی نہیں ہے بس میں جانا ہوگا۔ بس تو خیر ہر سڑک کے نکڑ پر مل جاتی ہے اور ہے بھی بہت آرام دہ لیکن لمحہ بھر پہلے گزر کر جا چکی ہو تو پورے آدھ گھنٹے انتظار کرنا ہوگا۔ شاید بس کے اوقات کا پرچہ کہیں نوٹس بورڈ پر لگا ہو، یہ سوچ کر چُپ چاپ اُٹھی اور نوٹس بورڈ کے پاس جا پہنچی۔

"السلام علیکم۔" آواز پر چونک کر دیکھا تو ماریے کھڑی تھیں۔ "میٹنگ ختم ہونے سے پہلے میں نے سوچا آپ سے چند باتیں کرلوں۔" انھوں نے اردو میں کہا۔

میں حیران تو ہوئی مگر خوش اخلاقی سے کہا، "ضرور، میں خود آپ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"مجھے معلوم تھا آپ حیران ہو رہی ہوں گی کہ میں نے اپنا نام ماریہ سے ماریے کرلیا اور ایرانی بن گئی۔ بات یہ ہے کہ میں خود کو ایرانی ہی بتاتی ہوں کہ کم از کم پاکستان کے لوگ مجھے نام سے نہ پہچانیں۔ ہمارے ملک کے لوگوں کو خدا جانے کیا کُرید ہوتی ہے، فون بک میں نام دیکھ کر فون کرتے ہیں۔ جب میں خود کو ایرانی بتاتی ہوں تو ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ میں ابا امی کے ساتھ مختلف ممالک میں رہی ہوں۔ سب سے زیادہ ایران میں رہنا ہوا اس لیے میں فارسی خوب بولتی ہوں۔"

"آپ ہم وطنوں سے کیوں ملنا نہیں چاہتیں؟" کے الفاظ میرے منھ میں تھے کہ انھوں نے بات کا سرا پھر جوڑ دیا۔

"آپ پہلی آشنا خاتون ہیں جن سے یوں اچانک ملاقات ہوگئی۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ میرے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہیں گی، پھر بھی..." ان کے چہرے پر حیا کی جو سُرخی آئی اس نے مجھے اُلجھا دیا۔ مجھے یہ خاتون ذرا بھی یاد نہیں تھیں، اس لیے خاموش رہنے ہی میں مصلحت جانی۔

"ہم لکھنے والوں کو عادت ہوتی ہے کہ تحریر کا ہر پرزہ کہیں نہ کہیں سنبھال کر رکھتے ہیں، ہیں نا؟" ماریے نے کہا۔

Marfat.com

''ہاں، اگر اس پر کوئی کام کی بات لکھی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''اگر میرا وہ افسانہ جو میں نے آپ کو پڑھنے کے لیے دیا تھا، اب تک آپ کے پاس ہو تو اسے ضائع کر دیں۔ اصل میں مجھے اچانک اسی دن گلگت سے واپس آنا پڑا۔''

یکایک مجھے یاد آیا کہ ان صاحبہ سے گلگت میں ملاقات ہوئی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں انھوں نے اپنی ساری داستان مع اپنے ''عارضے'' کے مجھے سُنا دی تھی اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں لکھتی ہوں، اپنا ایک افسانہ مجھے پڑھنے کو دیا تھا۔ افسانہ نہایت گھٹیا تھا۔ دوسرے دن جب میں وہ افسانہ لوٹانے گئی تو معلوم ہوا کہ محترمہ جا چکی ہیں۔

''وہ تو میں نے جب ہی ضائع کر دیا تھا۔'' میں نے کہا، ''اگر آپ گلگت اور افسانے کا ذکر نہ کرتیں تو میں قیامت تک بھی آپ کو نہ پہچانتی... زندگی میں ایک ہی مرتبہ تو آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں آپ کا نام اور آپ کی صورت واقعی بھول چکی تھی۔''

''اوہ... اچھا...'' وہ کھسیانی ہنسی ہنسیں۔ ''میں سمجھی شاید آپ کو یاد ہے، جس طرح آپ نے میری طرف دیکھا۔ ایک اور بھی بات تھی۔ کراچی کا ہمارا چوکی دار بے چارہ ساری ڈاک اور آنے والوں کے کارڈ سنبھال کر رکھتا ہے اور آنے والوں میں کسی کے ہاتھ بھیج دیتا ہے۔ ایسے ہی کاٹھ کباڑ میں ایک پرچے پر آپ کا نام بھی لکھا ہوا تھا، شاید آپ ہمارے گھر بھی تشریف لے گئی تھیں۔'' انھوں نے کہا۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا، ''سچی بات یہ ہے کہ ہم لکھنے والوں کو تھوڑی سی کُرید تو ہوتی ہی ہے۔ گلگت میں آپ نے اپنے گھر کا پتا دیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ وہ ہمارے گھر سے زیادہ دُور نہ تھا۔ افسانہ لوٹانے کے بہانے میں وہاں پہنچی تو خاک اُڑ رہی تھی۔ چوکی دار نے بتایا کہ آپ سب لوگ کئی سال کے لیے امریکا چلے گئے ہیں اس یے آپ کے گھر سے واپس آتے ہی میں نے وہ افسانہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ اس طرح کی خود بیتی کو گھر میں رکھنا مناسب بھی نہیں تھا...'' میں مسکرائی مگر ماریے سنجیدہ تھیں۔

''اب آپ کو یاد آ ہی گیا ہے تو اُمید ہے آپ خیال رکھیں گی۔ میری اور میرے

Marfat.com

والدین کی عزت کا بھی سوال ہے۔'' انھوں نے دبے ہوئے لہجے میں کہا اور نگاہیں نیچی رکھیں۔

''اب مجھے یہ بھی یاد آگیا ہے کہ آپ کو اس وقت یہ بات بہت پسند تھی کہ امریکا میں ہر بات کی آزادی ہے۔ وہاں کسی بات کو چھپانے کی ضرورت نہیں ہوتی اور آدمی دُہری زندگی نہیں گزارتا۔''

''اس بات کو جانے دو بھنو...'' انھوں نے میرا ہاتھ دبایا، ''یہ ان امریکنوں کے ہی دل گُردے ہیں جو جلسے جلوسوں میں کھلے عام ایسے مطالبے کرتے ہیں اور ایسی شادیوں کو قانونی حیثیت دینے کی باتیں کرتے ہیں۔ ہماری دادیاں نانیاں چھوڑ امّیاں بھی یہ باتیں سُن لیں تو تڑ سے گر جائیں...''

میٹنگ کے لوگ تتّر بتّر ہو رہے تھے۔ بہت سے جا بھی چکے تھے مگر نورا نے اب تک ڈاکٹر بوم کو گھیر رکھا تھا۔ میں نے زینے کے اُوپر جھانک کر دیکھا، رات کب کی اُتر چکی تھی۔ سڑک کی روشنیاں کہیں نارنجی کہیں چاندنی کی طرح دودھیا تھیں۔ پاس کی اپارٹمنٹ بلڈنگ میں گول دودھیا فانوس لٹکا ہوا تھا۔ اچانک نظر پڑی تو پورے چاند کا گمان گزرا مگر فوراً ہی نظر کا فریب کھل گیا۔

''آپ یونی ورسٹی میں جاب کر رہی ہیں؟'' ماریے نے اچانک پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا، ''میں تو ایک دوست سے ملنے آئی تھی، نورا یہاں لے آئیں۔ کل صبح واپس نیویارک جا رہی ہوں...''

''اوہ... تو میں بلاوجہ ہی گھبرا گئی۔'' ماریے نے آنکھ ماری۔

''بالکل بلاوجہ...'' میں پھر کھسیانی ہنسی ہنس دی۔

''آپ نے 'وِن فری' اور 'ڈانا ہیو' کے پروگراموں میں دیکھا کہ کیسے لوگ صاف صاف باتیں کرتے ہیں؟''

''ہاں دیکھا...'' میں نے کہا۔

''آپ کو ایک بات بتاؤں؟'' انھوں نے رازدارانہ انداز میں کہا... ''یہاں آکر

Marfat.com

یہ پتا چلا کہ میں بطورِ خاص 'ویسی' نہیں ہوں۔ بات یہ تھی کہ والدین کی مرضی سے کی ہوئی میری شادی بُری طرح ناکام ہوئی۔ شوہر سے طلاق ہوگئی تو مجھے سارے جہاں کے مردوں اور اپنے والدین پر بے حد غصہ تھا۔ اُن دنوں ایک خاتون نے مجھے بڑا دلاسا دیا اور میں اُن کے اثر میں آگئی۔ وہ کہا کرتی تھیں، ہمارے ہاں کے مرد بڑ بہت ہانکتے ہیں مگر عورت دوسری عورت کی عزّت کو اپنی عزّت سمجھتی ہے... خیر جو کچھ بھی ہو، ان سب باتوں نے مجھے ذہنی طور پر بیمار کر دیا تھا اور ڈاکٹر کے کہنے پر میں تبدیلِ آب و ہوا کے لیے گلگت گئی تھی۔ پھر یہاں چلی آئی کہ یہاں ہر کسی کو اپنے کام سے کام ہے، کوئی کسی کو نہیں پوچھتا تو گرائن سے میری ملاقات ہوئی۔ اس شخص سے ملنے کے بعد میرے دل سے مردوں کی نفرت نکل گئی۔ اب میں بقول امریکنوں کے 'سیدھی' ہوں۔ ہم نے شادی کرلی ہے اور اب تو میرے بچے بھی ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب آخر کار نورا سے پیچھا چھڑا کر بیوی کی طرف بڑھے۔ مجھ سے رخصتی مصافحہ کیا۔ ماریے نے ایرانی انداز میں میری گردن پر بوسہ دیا۔

''سردوگرم زمانہ چشیدہ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''بلے بلے...'' ماریے نے اپنے سفید ہموار دانت نکالے۔ پھر ہاتھ ہلاتی بائی بائی کرتی زینے پر چڑھ کر باہر نکل گئیں اور میں نورا کے انتظار میں چرچ کے اندھے زینے پر کھڑی رہ گئی۔

Marfat.com

نیاگرا فالز

امی بچوں کا ویو ماسٹر آنکھوں سے لگائے بڑے انہماک سے کچھ دیکھ رہی تھیں۔

''امی!'' میں نے کہا، انھوں نے چونک کر دیکھا اور نہ جانے کیوں ان کا چہرہ گلنار ہوگیا۔

''نیاگرا فالز دیکھ رہی تھی... '' انھوں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا، ''بہت خوب صورت ہے۔''

''اس ویک اینڈ پر لے چلیں گے آپ کو نیاگرا فالز دکھانے۔ اب کے صرف ہماری فیملی ہوگی تو آپ کو ایک ایک چیز دکھائیں گے اور خوب مزے کریں گے۔'' میں نے کہا۔

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ نیاگرا فالز دیکھنے میں ایسی کیا برائی تھی کہ وہ شرم سے سرخ ہوگئی تھیں، شاید اس لیے کہ وہ سمجھتی تھیں بچوں کی طرح ویو ماسٹر میں جھانکنا بڑوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔ میں نے ویو ماسٹر اٹھالیا اور اس میں دیکھ کر بتاتا رہا کہ یہ جو رین بو پل نظر آرہا ہے اس کے آس پاس کبھی ایک، کبھی دو اور کبھی کبھار تین قوسِ قزح دکھائی دیتی ہیں۔ یہ فالز کا وہ حصہ ہے جو امریکا سے نظر آتا ہے اور یہ کینیڈا سے... یہ وہ ڈیک ہے کہ جہاں برساتیاں اور ربر کے جوتے پہن کر جاتے ہیں اور آبشار کی ایسی تیز

Marfat.com

پھواریں پڑتی ہیں کہ سب بھیگا چوہا بن جاتے ہیں۔ بچے سب سے زیادہ اس جگہ لطف لیتے ہیں مگر میرا خیال ہے کہ آپ، میڈ آف دی مسٹ یعنی کشتی کے سفر کو سب سے زیادہ پسند کریں گی۔ کشتی میں سے جب اوپر کی طرف دیکھتے ہیں تب نیاگرا فالز کی خوب صورتی اور اصل جسامت کا اندازہ ہوتا ہے۔''

''کیا یہ جگہ بھی دیکھ سکتے ہیں جہاں ٹرام دیوار کی طرح سیدھی چڑھائی پر چڑھ رہی ہے؟''

''کیوں نہیں، یہ حصہ کینیڈا کی طرف ہے، ٹرام پر بھی بیٹھیں گے اور اس زرد ایلی ویٹر پر چڑھ کر گھومتے مینار سے نظارہ بھی کریں گے۔'' اس گفتگو کے دوران ویو ماسٹر میرے اور امی کے ہاتھوں میں باری باری رہا۔ اب ان کے چہرے پر خوشی کی سرخی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ انھیں خوب صورت نظارے مبہوط کر دیتے ہیں۔ ان کی بدقسمتی اور حالات کی ستم ظریفی کہ زندگی میں بہت ہی کم ایسے مواقع ملے کہ وہ فطرت کے حسین مناظر سے لطف اٹھا سکیں۔

امی شادی سے پہلے پینٹنگ بھی کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں انھوں نے مجھے بتایا تھا کہ جس زمانے میں وہ پینٹنگ کرتی تھیں انھیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی ایک تیسری آنکھ بھی ہے جو ان کو سارا منظر کسی اور زاویے سے دکھاتی ہے۔ چیزوں کی گہرائی، گیرائی اور جزویات پر ایک دم نظر پڑتی تھی۔ رنگوں کے شیڈ اور دھوپ چھاؤں کے عکس بہت ہی واضح ہوتے تھے۔ ابو ان کے اس بے کار کام کو پسند نہیں کرتے تھے اس لیے مدت ہوئی انھوں نے پینٹنگ ترک کر دی تھی۔ ان کے کہنے کے مطابق کچھ عرصے بعد ان کی تیسری آنکھ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی تھی مگر مجھے یوں لگتا تھا کہ کسی بھی خوب صورت منظر میں وہ آج بھی ہم سب سے بہت زیادہ دیکھتی ہیں اور یہ کہ ان کی تیسری آنکھ اگر کھلی ہوئی نہیں ہے تو نیم وا ضرور ہے۔ وہ خوب صورت مناظر کا لطف بھی سب سے زیادہ لیتی تھیں اور اگر وہ منھ سے کچھ بھی نہ کہتیں تو آنکھوں کی چمک اور چہرے کی کیفیت فوراً چغلی کھاتی تھی۔

Marfat.com

جہاں میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہوں وہ جگہ نیاگرافالز سے زیادہ دور نہیں ہے مگر امی اور ابو کبھی کبھار ہی میرے پاس آتے ہیں۔ جتنی مرتبہ بھی وہ دونوں آئے میں نے انھیں یہ عظیم آبشار دکھانے کی کوشش کی کہ میں خود کئی مرتبہ دیکھنے کے بعد بھی اب تک اس سے مسحور ہوتا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ آئیں تو خاندان کے اور بہت سے لوگ ساتھ تھے۔ان میں سے کچھ لوگ یہ فالز دیکھ چکے تھے کچھ کو دلچسپی نہیں تھی، چند ایسے تھے جو کسی جگہ کی سیر کے لیے رات بھر چل کر پہنچیں تو پانچ منٹ بعد کہتے، ''بس چلو، دیکھ لیا۔' امی بولیں' اس دفعہ رہنے دو، اگلی مرتبہ اچھی طرح دیکھیں گے۔'' کچھ اور لوگ جنھیں دلچسپی نہیں تھی یا جو پہلے نیاگرا فالز دیکھ چکے تھے وہ بھی گھر پر ٹھہر گئے۔ چار پانچ گاڑیاں نیاگرا کے لیے چلیں۔ آدھے راستے پر سب گاڑیاں کسی کام سے رکیں تو میں نے دیکھا کہ ایک کار سے ابو اترے چلے آرہے ہیں۔ ''ارے ابو آپ آگئے؟''

''ہاں، کیوں، تمھاری امی نہیں آئیں، انھیں تو بہت ارمان تھا اسے دیکھنے کا۔''

''ارمان'' کے لفظ پر میں کھٹکا، مگر سب کے سامنے کیا کہتا۔ میں نے کہا'' کچھ لوگ گھر پر رہنا چاہتے تھے اس لیے امی نہیں آئیں، غزالہ کو بھیج دیا۔''

سب نے حسبِ توفیق نیاگرا گاؤں، آبشار اور آس پاس کی جگہیں دیکھیں۔ بہت سے مہمان وہیں سے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ میں ابو کو لے کر واپس چلا آیا۔ جب امی نے ابو سے نیاگرا فالز کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا،''اچھا ہوا تم نہیں گئیں۔ وہاں دیکھنے کو تھا ہی کیا۔ ایک پرنالہ سا گر رہا تھا اور بس... میں لمحہ بھر کے لیے خاموش رہا۔

مگر یہ بات میرے دل سے نکلتی نہ تھی کہ ابو کیوں اس بات کی مستقل مخالفت کر رہے ہیں کہ امی نیاگرا فالز دیکھیں۔ جب اسکول میں پڑھتا تھا تب کی باتیں ذہن میں آئیں کہ امی کہیں تنہا جاتیں تو ابو سخت بے چین رہتے۔ بار بار ٹیلی فون کرواتے، ''پوچھو، پہنچیں یا نہیں'' ... واپسی کے وقت بھی یہی سلسلہ رہتا۔ بار بار دروازے تک جاتے اور حساب لگاتے کہ کتنی دیر میں انھیں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہ بات بھی کرتے کہ شہر کے ٹیکسی

Marfat.com

اور رکشا ڈرائیور قابلِ اعتبار نہیں ہیں اور بہت خراب ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ انھیں امی کی خیریت کی بے حد فکر رہتی مگر جب وہ خیریت سے پہنچ جاتیں تو ان سے لڑائی ضرور ہوتی۔ بہت زمانے تک میں یہ بات نہ سمجھ پایا۔ عمر کے ساتھ میں نے اور کئی باتیں نوٹ کیں کہ ابو امی کا میکے جانا سخت ناپسند کرتے ہیں خصوصاً ان گھروں میں جہاں شادی سے پہلے زیادہ ربط ضبط تھا... مگر نیاگرا فالز تو امی کا میکا نہیں تھا، اس سے کبھی ربط ضبط بھی نہ تھا...

دوسری مرتبہ نیاگرا فالز کے لیے نکل رہے تھے تو امی بولیں، ''تم نے ہیلی کاپٹر سے بھی نیاگرا کی سیر کی ہے؟''

''جی، بہت اچھا لگتا ہے۔ جھیل ایری لبالب بھری ہوئی، ایک جھولا جو دوسری جگہ نیاگرا دریا کے اوپر سے گزرتا ہے، اس جگہ کو کہتے ہیں... بھنور، منجدھار یا گرداب یا جو کچھ بھی آپ سمجھیں۔ یہاں پانی تیزی سے گھومتا رہتا ہے اور جو چیز اس کے بیچ میں چلی جائے وہ دنوں چکر کھاتی رہتی ہے پھر یہاں سے دور دور کے مناظر اتنے خوب صورت ہیں کہ بیان سے باہر ... آپ بھی دیکھیے گا۔''

امی خوش تو ہوگئیں مگر اپنے خاص انداز میں لجا کر بولیں ''لوگ کہیں گے بڑی بی بڑی البیلی ہیں۔''

''امریکا میں یہی تو اچھی بات ہے کہ کوئی کسی کو کچھ کہتا وہتا نہیں، ایک سے ایک البیلی اور من چلی بڑی بیاں یہاں پڑی ہیں۔ وہ آپ نے ٹی وی کا پروگرام دیکھا تھا نا جس میں پچاس سے اوپر عمر کی خواتین میوزک پر ورزش، بلکہ ڈانس کر رہی تھیں۔''

''ارے بھئی یہاں کی عورتیں تو پاگل ہیں، پہاڑ کی چوٹی سر کرنے والی ایک ٹیم میں دیکھا کہ ساٹھ سال سے زائد عمر کی ایک عورت جو دیوار جیسی چڑھائیوں پر رسیوں کی مدد سے چڑھ رہی ہے، ہانپ رہی ہے، کانپ رہی ہے۔ لگ رہا ہے کہ اس کے لیے ناممکن ہے مگر اس کے ساتھی ہیں کہ ہمت بڑھا رہے ہیں، اسی طرح سے مر مر کے اس نے دریا پار کیا مگر کرلیا۔

''پھر ان کی ٹیم جیتی؟'' میں نے پوچھا۔

Marfat.com

''نہیں، جیتی ویتی تو خاک بھی نہیں۔ میں تو یہی کہوں گی کہ بڑی بی مرتے مرتے بچیں، بیمار بھی ہوئیں، ٹانگ بھی ٹوٹی مگر اتنا ضرور ہوا کہ سارے کیمرے بڑی بی پر فوکس رہے اور جیتنے والوں کی خوب ناقدری ہوئی۔''

''تو سوچ لیجیے کہ آپ کی عمر کی کتنی خواتین ہوں گی جو ہیلی کاپٹر کی سیر کو آئی ہوں گی۔''

امی خاموش ہوگئیں، شاید کچھ اطمینان ہوا ہو۔

اس مرتبہ نیاگرا کے پاس پہنچ کر جہاں دریا چٹانوں پر ابلتا ہوا جارہا تھا اور سورج کی کرنوں سے اس پر ایک سفید چادر سی بچھی ہوئی تھی، ہماری کار کا حادثہ ہوگیا۔ میں گاڑی چلا رہا تھا، غلطی میری نہیں تھی، مگر گاڑی بالکل ٹوٹ گئی۔ امی حادثے اور بعد کی پولیس اور انشورنس کی کارروائیوں سے اتنی ہل گئیں کہ پھر اگلی مرتبہ پر ٹال گئیں۔ اب اس مرتبہ میں نے فیصلہ کیا کہ امی کو نیاگرا فالز ضرور دکھاؤں گا۔ ویوماسٹر میں فالز کے سین دیکھنے کے بعد وہ سچ مچ کے فالز دیکھنے کو خود بھی بے چین تھیں۔

اب کے جب امی ابو اور صرف میری فیملی ساتھ ہوگی، میرا خیال تھا کہ ہم دل بھر کے گھومیں پھریں گے اور ہر ہر جگہ دیکھیں گے، مگر ہوا یہ کہ ابو نے مخالفت شروع کردی، کہتے رہے کہ وہ جگہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ وہاں دوبارہ جایا جائے۔

''آپ نے تو دیکھ لیا، اب مجھے کیوں نہیں دیکھنے دیتے؟'' امی نے کہا۔

''ارے بے کار کا ایک نالہ سا ہے اس کا کیا دیکھنا، یہ جو اپنے عامر کے گھر کے پاس آبشار ہے، اس سے بڑا ہے۔''

امی کو یقین نہیں آیا، نہ آسکتا تھا۔ مدد کے لیے میری طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے کہا، ''ابو کی آنکھیں کم زور ہیں، ہوسکتا ہے آبشار کی پھوار میں چشمہ اور دھندلا گیا ہو اور انھیں ایسا ہی نظر آیا ہو۔ آپ فکر نہ کیجیے آپ کو ضرور پسند آئے گا۔ ابو نہیں جانا چاہیں گے تو انھیں ہوٹل میں آرام کرنے دیں گے۔''

''نہیں، انھیں بھی لے چلنا،'' امی نے سرگوشی میں کہا، ''ورنہ وہ جلد واپس آنے

Marfat.com

کے لیے ضد کریں گے اور میں آدھی رات کو آبشار پر پڑنے والی روشنیاں بھی دیکھنا چاہتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے وہاں پہنچیں تو سہی، میں انھیں لے چلوں گا۔''

راستے بھر ابو نیاگرا فالز کی برائی کرتے رہے، اس کے بعد اس بات کی کہ امریکا میں غلط پروپیگنڈا کر کے لوگوں کو رِجھاتے ہیں اور اپنے ملک کی وہ چیزیں دکھاتے ہیں جو سرے سے دیکھنے کے قابل نہیں ہیں اور ہم جیسے بیوقوف لوگ ان کے جھانسے میں آکر اپنا وقت برباد کرتے اور روپیہ گنوا سکتے ہیں۔

میں دبے دبے الفاظ میں امریکا کی حمایت میں بولتا رہا۔ یکایک میری بیوی غزالہ پیچھے سے چلائی، ''گاڑی روکیے، امی کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔''

امی نے سینے پر بوجھ اور گھٹن کی شکایت کی۔ بیوی نے کہا، ان کی قمیص پسینے میں تر ہے۔ میں سمجھ گیا معاملہ سنجیدہ ہے اور ہم فالز پر جانے کے بجائے سیدھے نیاگرا گاؤں کے اسپتال چلے گئے۔ امی کی طبیعت سنبھل تو گئی مگر انھیں چیک اپ کے لیے اسپتال میں رہنا پڑا۔ انھیں اسپتال چھوڑ کر ہوٹل آئے تو بچے فالز پر جانے کی ضد کرنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ ابو نہیں جائیں گے مگر وہ فوراً تیار ہوگئے۔ بڑی دل جمی اور تفصیل سے دیکھا اور اس کے بارے میں سوالات پوچھتے رہے۔ بچے آدھی رات تک ٹھہر کر آبشار پر رنگ برنگی روشنیوں کی بہار دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے کہا، ''ابو ہوٹل زیادہ دور نہیں ہے، میں آپ کو ہوٹل چھوڑ کر واپس آجاتا ہوں۔''

''کیوں؟'' انھوں نے حیرت سے کہا، ''ہم بھی یہیں ٹھہریں گے۔''

سب رات گئے لوٹے۔ ابو برابر ہمارے ساتھ رہے۔ صبح ڈاکٹر نے کہا کہ امی کو دل کا دورہ پڑا تھا، وہ خطرہ ٹل گیا ہے مگر اب دل کی سرجری ہوگی۔ ڈاکٹروں نے انھیں ہمارے شہر تک جانے کی اجازت دے دی اور میں انھیں ایمبولینس میں اپنے شہر لے آیا۔ سرجری کے بعد وہ اپنے گھر جانے لگیں تو میں نے ایک مرتبہ پھر انھیں نیاگرا دکھانا چاہا۔ ابو نے کہا سرجری کی کمزوری باقی ہے، تھکاوٹ ان کے لیے مضر ہوگی۔ بات کسی حد تک

معقول تھی اور ایسی حالت میں امی ساری چیزیں اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ وہ دل میں کوئی حسرت لے کر جائیں یہ مجھے بھی منظور نہ تھا، چناں چہ اس دفعہ میں نے کہا، ''خیر اگلی مرتبہ سہی...'' امی کچھ نہ بولیں، ان کے چہرے پر دُکھ کی ایک لہرسی آئی اور گزر گئی۔

غزالہ کو بھی اس بات پر بہت حیرت تھی کہ ابو کیوں نہیں چاہتے کہ امی نیاگرا فالز دیکھیں۔ چوتھی مرتبہ وہ آئیں تو غزالہ نے کہا، ''اب آپ یوں کیجیے کہ امی کو تنہا لے جایئے، میں کسی بہانے ابو کو روک لوں گی، ہیلی کاپٹر پر بھی بٹھایئے اور خوب مزے کروایئے۔ میں نہیں ہوں گی تو وہ زیادہ انجوائے کریں گی۔''

''اس میں کیا شک ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا، ''تمھارے سامنے ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ بہو کیا کہے گی۔''

جب میں نے امی سے نیاگرا فالز کی بات کی تو انھوں نے بڑی قطعیت سے کہا، ''چھوڑو جانے دو، تم ہزاروں مرتبہ دیکھ چکے ہو، تمھارے ابو دو مرتبہ دیکھ چکے ہیں اور مجھے بھی اب بالکل شوق نہیں رہا۔''

تب یکایک مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی کہ ابو کی نظر میں ان کا اور نیاگرا فالز کا مقابلہ تھا۔ وہ ملین سال بوڑھا سہی، مگر خوب صورت تھا اور امی اس کے دیدار کو ترس رہی تھیں۔ وہ رقیبِ رُو سیاہ تھا جس کو نیچا دکھانا ضروری تھا۔ انھوں نے نہ صرف اسے نیچا دکھا دیا تھا بلکہ امی کے اس سخت جان دل کو بھی ہمیشہ کے لیے مار دیا تھا جو ہارٹ اٹیک اور کھلی سرجری کے حملوں سے بھی بچ گیا تھا۔

Marfat.com

تقاضا کوئی دن اور

اس نیم سرکاری ادارے کی عام سی عمارت کے آگے میں ایک حقیر چیونٹی سے بھی حقیر بنا کس مپرسی کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔

اس عظیم ادارے کی عمارت نہ ایسی خوب صورت تھی کہ آدمی کے دل میں احساس جمال گھر کر لے نہ ایسی بردبار اور شائستہ کہ احساسِ جلال گھیر لے مگر عظمت کا تعلق آدمیوں اور اداروں کی شکل وصورت سے نہیں ان کی شخصیت سے ہوتا ہے اور شخصیت مجموعہ ہے کلچر کی طرح ان بے شمار چیزوں کا جن میں سے کچھ کا نام لیا جاسکتا ہے اور کچھ کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔

دروازے پر چوکی دار موجود تھا اور اندر جانے والوں کو ''استقبالیہ'' کا راستہ بتا رہا تھا۔ ''استقبالیہ'' وہ جگہ نہیں ہے جہاں آپ کا استقبال ہوتا ہے بلکہ وہ جگہ ہے جہاں ''منکر نکیر'' آپ سے سوال جواب کر کے اندر داخل ہونے کا پرمٹ دیتے ہیں۔ استقبالیہ میں جو صاحب ڈیوٹی پر تھے وہ ابھی 'باتھ روم' گئے تھے۔ چناں چہ چوکی دار نے اپنا مخصوص حق استعمال کرتے ہوئے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چند قدم پر ان ہی کی جیسی وردی میں ان کے ایک ہم جنس نے مجھے آ پکڑا:

Marfat.com

''آپ کو کس سے ملنا ہے؟''

''کسی بھی صاحب سے۔''

''کسی بھی صاحب تو میٹنگ میں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ نام بتایئے۔''

''جو صاحب میٹنگ میں نہیں ہوں گے ان سے مل لوں گا۔''

''سارے بڑے صاحبان میٹنگ میں ہیں۔''

''دفتروں میں کوئی تو ہوگا؟''

''صرف جونیئر صاحبان ہیں۔ کیا آپ پہلے کبھی یہاں نہیں آئے؟''

''مدّت بعد آیا ہوں۔''

''تبھی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آپ کو یہ تک نہیں معلوم کہ روز اس وقت میٹنگ ہوتی ہے۔''

''روز! کب سے کب تک؟''

''جب سب افسران جمع ہو جاتے ہیں تب سے جب تک کینٹین والا چائے بھیجتا ہے تب تک۔''

''کیا چائے اندر جا چکی ہے؟''

''نہیں ابھی نہیں گئی۔''

''تو میں کسی جونیئر سے مل لوں۔''

''آپ کی مرضی... مگر یہ ان سے ملنے کا وقت نہیں ہے۔''

''کیوں؟''

''اس وقت وہ دوستوں سے ملاقات کرتے ہیں یا دوست لڑکیوں کو ٹیلی فون کرتے ہیں۔''

Marfat.com

''مگر بھئی مجھے تو صرف ایک چیک وصول کرنا ہے۔''

''اوہو تو پہلے بتایا ہوتا، سیدھی سی بات ہے اکاؤنٹ برانچ میں لیے چلتا ہوں، کام بن جائے تو کچھ چائے پانی کے لیے اس فقیر کو نذر کر دیجیے گا۔''

''کیا کہا، اب یہ سلسلہ یہاں بھی شروع ہو گیا۔''

''جی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ چیز میں نے انٹروڈیوس کی ہے۔ یہاں لوگ نئی نئی باتیں انٹروڈیوس کرتے رہتے ہیں جو بعد میں روایت بن جاتی ہے۔ میں نے سوچا میں بھی کوئی کام شروع کر جاؤں جو بعد میں بھائی بندوں کے کام آئے۔ دیکھیے جناب کوئی نئی بات تو ہے نہیں، ہر جگہ ہوتا ہے اور تو اور ہر عید پر ڈاکیے، نام کے چوکی دار اور گٹر صاف کرنے والے گھر سے آ آ کر پیسے لے جاتے ہیں تو اگر یہاں چیک وصول کرنے والا اپنی خوشی سے ہم خدمت گاروں کا کچھ دے جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ویسے آپ کا جی نہ چاہے تو نہ سہی، خدمت ہمارا فرض ہے۔''

اکاؤنٹ برانچ میں میرا چیک تیار نہیں تھا۔

''آپ کا پروگرام کس تاریخ کو ہوا تھا؟'' پوچھا گیا۔

''مجھے معلوم نہیں کیوں کہ مجھے اطلاع نہیں دی گئی تھی۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے۔ ریکارڈنگ کے وقت مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے پروگرام کی اطلاع دی جائے گی جو نہیں دی گئی۔''

''کانٹریکٹ پر کیا تاریخ درج تھی؟''

''کوئی تاریخ درج نہیں تھی، سادہ کانٹریکٹ پر مجھ سے دستخط کروائے گئے تھے۔''

''ریکارڈنگ کس دن ہوئی تھی؟''

''تین مہینے پہلے کی کوئی تاریخ تھی اور میں نے اسے یاد رکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔''

''بہت مشکل ہے آپ کو مہینہ بھی یاد نہیں۔''

Marfat.com

''حساب لگا لیجیے تین مہینے پہلے کون سا مہینہ تھا۔''

میرے خضر نے انگلیوں پر جلدی جلدی حساب لگا کر مہینہ بتایا۔

''تاریخ تو آپ کو معلوم ہونی چاہیے۔'' ایک اور میز سے ایک اور صاحب نے جرح کی۔

''جب کوئی یہاں سے بتائے گا نہیں تو آپ ہی بتائیے تاریخ کیسے معلوم ہوگی؟''

''مگر آپ کو یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ آپ کا پروگرام ہو گیا۔'' تیسری میز سے تیسرے صاحب نے مجھے گھیرا۔

''غلطی سے، یا اتفاق سے،'' کسی صاحب نے بر سبیلِ تذکرہ ایک دن کہا۔

''اوہو... پھر تو بڑا مشکل ہے، نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ یہ تو پچھلے سال کا قصہ ہو گیا۔''

''صاحب دیکھ لیجیے، رجسٹر آپ کے پاس ہیں، بے چارے شریف آدمی ہیں اور ویسے بھی آج کل آپ کے پاس کوئی کام نہیں ہے۔'' میرے خضر نے میری سفارش کی۔

''یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ ہمارے پاس کوئی کام نہیں ہے؟'' تیکھے لہجے میں پوچھا گیا۔

''صاحب میں ادارے کی دائی ہوں، مجھ سے کیا بات چھپی ہے۔''

ایک صاحب نے اپنا رجسٹر دیکھا۔''اس نام کا کوئی چیک نہیں... فلاں صاحب ذرا دیکھیے ان کا کوئی کنٹریکٹ ہے؟''

میرا نام پتا، پروگرام کا نام پتا پوچھنے کے بعد فلاں صاحب نے بتایا کہ اس نام کا کوئی کنٹریکٹ کبھی ان تک نہیں پہنچا۔

ہم دونوں کمرے سے باہر نکل آئے۔

''آپ کینٹین میں چل کر ایک پیالی چائے پییں، اتنی دیر میں میٹنگ ختم ہو جائے گی۔''

''نہیں میں اتنی دیر میں کسی جونیر سے مل لیتا ہوں۔''

Marfat.com

''آپ کی مرضی، میں نے بتایا تھا کہ اس وقت وہ مصروف ہوتے ہیں۔''

''تو وہ خالی کس وقت ہوتے ہیں؟''

''صاحب، اس ادارے میں کبھی کوئی خالی نہیں ہوتا... میں بھی سو کام چھوڑ کے آپ کے ساتھ پھر رہا ہوں۔''

''تو آپ چلے جائیے، اپنا کام کیجیے۔''

''چلیے، میں آپ کو کسی صاحب کے کمرے تک چھوڑ آؤں۔''

ایک کمرے کے باہر سے ہی معلوم ہو گیا کہ صاحب ٹیلی فون پر کسی سے راز و نیاز میں مصروف ہیں۔ وہاں سے بچا کر وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گیا جہاں سے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔ میں اندر داخل ہوا۔ کمرے میں جتنے لوگ بیٹھے تھے سب پر یکایک اوس سی پڑ گئی۔ میں نے اپنا نام بتایا۔ ایک صاحب جو مجھے واجبی سا جانتے تھے، اٹھے اور سب سے میرا تعارف کروایا اور سب کا تعارف مجھ سے کروایا۔ ابنِ بطوطہ، جامِ جہاں نما، سکندر فارابی، خضرِ سبز پوش، غزل نظم آبادی، نظم غزل آبادی وغیرہ وغیرہ۔

باری باری سب سے ہاتھ ملا کر جیسے ہی میں بیٹھا سب مجھے بھول گئے اور باتوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑ دیا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ قہقہے عروج پر تھے کہ حسبِ عادت ٹیلی فون نے مداخلت کی۔ ابنِ بطوطہ نزدیک ترین تھے۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا۔

''کون صاحب؟... دیکھیے میں پوچھ رہا ہوں کہ آپ کون بول رہے ہیں... نہیں بتاتے تو میں فون رکھتا ہوں... جی! کن صاحب سے... ابن بطوطہ!... ابھی تشریف نہیں لائے... خضر سبز پوش میٹنگ میں ہیں۔ غزل نظم آبادی کا یہ نمبر نہیں ہے۔ نظم غزل آبادی آج کل چھٹی پر ہیں...'' اور کھٹ سے انھوں نے ٹیلی فون رکھ دیا۔ اس کے بعد بھی فون نے کئی مرتبہ مداخلت کی اور ہر دفعہ یہ پوچھنے کے بعد کہ کون صاحب بول رہے ہیں فون فوراً رکھ دیا گیا۔

میں اُٹھ آیا... کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ ایک دیوار کے سائے میں وہ خضر صورت پھر موجود تھے۔

Marfat.com

''کچھ کامیابی ہوئی؟'' انھوں نے پوچھا۔

''نہیں...'' میں نے کہا۔

''اصل میں سارا جھگڑا یہ ہے کہ آپ کو دن اور تاریخ یاد نہیں۔'' وہ پھر میرے ساتھ ہو لیے۔

''ہاں اصل جھگڑا یہی ہے۔'' میں نے کہا۔ سیڑھیاں اترتے ذرا میرا پاؤں رپٹا۔ میں گرتے گرتے سنبھل گیا، پھر بھی ہلکی سی خراش آگئی۔ وہ خضر صورت بہت پریشان ہو کر بولے، ''اس کا اچھی طرح علاج کروائیے گا۔''

''معمولی چوٹ ہے۔'' میں نے کہا۔

''چوٹ تو معمولی ہے مگر یہاں کی ہوا بہت خراب ہے۔ میرے والد صاحب بھی چند دن اس ادارے میں رہے تھے۔ ایک دن گر گئے ہلکی سی خراش آئی مگر وہ پھر نہیں پنپے، سارے جسم میں زہر پھیل گیا۔''

''کیا یہاں کی ہوا زہریلی ہے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''جس کو راس آجائے اس کے لیے امرت ہے۔''

''شاید تمھیں راس آگئی ہے۔''

''جی ہاں... چالیس سال سے یہاں ہوں اور میرے بیٹے کو بھی دیکھ لیجیے گا انشا اللہ یہیں سے ریٹائر ہوگا۔''

''تمھیں یہ جگہ بہت پسند ہے؟''

''صاحب جگہ بُری نہیں ہے... پڑھے لکھے لوگ ہیں، لڑتے بھی ہیں تو تمیز سے۔ آپ جناب سے... گلا بھی کاٹتے ہیں تو سلیقے سے... جگہ بُری نہیں ہے۔ آپ کا تجربہ غلط رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اس ادارے کے لیے کوئی غلط خیال لے کر جائیں۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا کروں گا... آپ یوں کیجیے کہ مجھے اپنا فون نمبر دے دیجیے۔''

''میرے ہاں فون نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''دفتر میں؟''

''دفتر میں بھی نہیں ہے۔''

''اوہو، تو سارا قصہ یہ ہے۔'' انھوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''شاید آپ نے یہاں کسی کو بتا دیا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ٹیلی فون نمبر نہیں ہے۔''

''ظاہر ہے۔''

''یہ غلطی آپ نے کب کی؟''

''جب پروگرام ریکارڈ ہوا تھا۔''

''افوہ... تبھی... آپ نے تو غضب کر دیا... آپ سے ٹیلی فون نمبر پوچھا گیا ہوگا۔''

''ہاں پوچھا گیا تھا۔''

''پھر آپ نے کیا کہہ دیا؟''

''میں نے کہا میرے پاس ٹیلی فون نہیں ہے۔''

''ہائے ہائے... آج کوئی اس شہر میں ایسا ہے جس کے پاس فون نمبر نہ ہو۔'' اس نے کہا۔

''ہزاروں لاکھوں لوگ ہیں۔'' میں نے کہا، ''جن کے پاس فون نہیں ہے۔''

''اوہو صاحب میں ٹیلی فون کی بات نہیں کر رہا، نمبر کی بات کر رہا ہوں۔ دیکھیے اوّل تو ہر دفتر میں کوئی نہ کوئی نمبر ہوتا ہے اور کچھ نہیں تو باس (boss) کا سہی۔ دفتر میں نہ ہو تو پڑوس میں، محلّے میں کہیں نہ کہیں نمبر ہوتا ہے۔ اگر نہ بھی ہو صاحب نمبر بنانے میں کیا دیر لگتی ہے، انھیں کون سا آپ کو فون کرنا ہے۔''

''فون نہیں کرنا تو نمبر کیوں پوچھتے ہیں؟''

''جناب آپ شکل سے بھی بھولے لگتے ہیں اور ہیں بھی بھولے۔ بات یہ ہے کہ فون نمبر آپ کا رُتبہ معلوم کرنے کے لیے پوچھا جاتا ہے۔ اگر آپ کے دفتر کے دو فون نمبر ہیں اور گھر پر بھی فون ہے تو اس کا مطلب ہے روپیہ آپ کو ملنا چاہیے، آپ کو ضرورت ہوگی، ویسے بھی آپ کی امانت ہے آپ تک پہنچنی چاہیے۔ اگر آپ کے پاس ایک فون ہے تب بھی خیر جب آپ آئیں گے تو تھوڑی ردّ و کد کے بعد چیک مل جائے گا لیکن اگر آپ

Marfat.com

کے پاس سرے سے فون نہیں ہے تو پھر معاف کیجیے آپ ان پیسوں کا کیا کیجیے گا، اچھا ہے ادارے میں پڑے رہیں۔ کسی کے کام آئیں گے اور پھر جیسا کہ میں آپ کو بتا رہا ہوں ایسے لوگ تو شاذ و نادر ہوتے ہیں جن کا ٹیلی فون نمبر نہ ہو۔''

''میں نہیں مانتا کہ اس شہر میں ہر ایک کے پاس ٹیلی فون ہے۔''

''ہر ایک کے پاس فون نہیں ہے، ہر ایک کے پاس کھانے اور پہننے کو بھی نہیں ہوتا مگر یوں ہر ایک کے سامنے آدمی منہ پھاڑ کر تو نہیں کہہ دیتا۔ مجھے دیکھیے، کہنے کو تو میرے پاس بھی فون نہیں ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ خط لکھنے کی عادت تک چھوٹ گئی ہے۔ اپنے گھر جب بات کرنی ہوتی ہے گھر کے پاس دکان ہے پیغام دے دیتا ہوں کوئی بچہ وچہ آجاتا ہے۔''

''تو پھر اب کوئی امید ہے؟''

''مشکل ہے، بہت مشکل ہے، مگر ناامیدی کفر ہے... آپ یوں کیجیے کہ کسی دن کہیں سے ٹیلی فون کر کے اپنا کوئی نمبر انھیں بتا دیجیے اور پھر درخواست کیجیے کہ آپ کا چیک مل جائے، شاید دیکھیے... امید پر دنیا قائم ہے۔''

''اچھا بھئی شکریہ۔''

''صاحب، بُرا نہ مانیں تو ایک بات کہوں۔''

''ضرور کہو۔''

''ان اداروں میں اس طرح نہیں آنا چاہیے جس طرح آپ آئے ہیں۔ یہاں اکڑ کر آنا چاہیے۔ چوکی دار سے کہیے بڑے صاحب نے بلایا ہے، پندرہ منٹ سے وہ آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور سیدھے ان کے دفتر کی طرف جائیے بعد میں آپ اِدھر اُدھر مُڑ بھی سکتے ہیں۔ ایک بات اور بھی یاد رکھیے...''

''وہ کیا؟''

''یہاں کے سب چھوٹے بڑے افسروں کے نام یاد رکھیے۔ ہمیشہ پوچھیے فلاں ہے، صاحب واحب نہ لگائیے اور ایک بات اور...''

Marfat.com

''وہ بھی کہہ دو۔''

''آتے رہا کیجیے۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ آتے رہا کیجیے۔''

''چاہے کوئی کام نہ ہو...!؟''

''ارے صاحب کام تو آنے جانے سے نکلتا ہے، پروگرام بھی اسی طرح نکلتے ہیں، کانٹریکٹ بھی اسی طرح نکلتے ہیں اور چیک بھی اسی طرح نکلتے ہیں۔ اس وقت یہاں جتنی پبلک نظر آرہی ہے اگر ان میں سے ایک بھی کسی کام سے آیا ہو تو سو جوتے مار لیجیے۔ آپ کبھی شکل نہ دکھائیں اوپر سے کہہ دیں کہ فون نمبر نہیں ہے۔ تیسرے بڑے صاحبان کے پاس جانے کے بجائے ایسے جونیر افسروں کے پاس جائیں جو آپ کو جانتے نہ ہوں تو کام کیسے نکل سکتا ہے۔''

''مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تاریخ...''

''اجی تاریخ کو ماریے گولی... یہاں لوگوں کو سنہ یاد نہیں ہیں۔ آپ بھی کیا بات کرتے ہیں۔''

''تو پھر۔''

''بس میری باتیں یاد رکھیے انشا اللہ بیڑا پار ہوگا۔ جگہ بُری نہیں ہے آپ کا تجربہ اور معاف کیجیے آپ کا طریقہ غلط ہے، مجھے تو تعجب اس بات پر ہے کہ یہ ایک پروگرام بھی آپ کو کیسے ملا... اچھا خدا حافظ۔''

اس نیم سرکاری ادارے کی عام سی عمارت کے آگے میں ایک حقیر چیونٹی سے بھی حقیر بنا کس مپرسی کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ عظیم ادارے کا وہ عظیم شخص لپاک جھپاک عمارت میں کہیں غائب ہوگیا۔

Marfat.com

نوراں جی کا گاؤں

شہروں کی فضاؤں سے بہت دُور ایک گاؤں آباد تھا، جو نوراں جی کا گاؤں کہلاتا تھا۔ اِس کے نام کی وجہِ تسمیہ کے بارے میں کوئی کچھ کہتا تھا کوئی کچھ۔ بعض کا خیال تھا کہ یہ نام نور نامی ایک بزرگ کی یادگار ہے جو پاس والی پہاڑی کے دامن میں رہا کرتے تھے اور جنھوں نے حالتِ جلال میں اِس گاؤں کے تین خاندانوں کو بددعا دی تھی۔ مگر بعض لوگ یہ کہتے تھے کہ اِس گاؤں میں نوراں نام کی ایک لڑکی گزری ہے جو بڑی حسین و جمیل تھی۔ جب اس نے قریب کی ندی میں گر کر خودکشی کر لی تو لوگ گاؤں کو ''نوراں والا گاؤں'' کہنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ 'نوراں جی کا گاؤں' بن گیا اور یہ نام کچھ ایسا مقبول ہوا کہ اب لوگ اس گاؤں کے اصلی نام کو بھول چکے تھے۔

سرما کا اختتام اور گرمیوں کا آغاز تھا۔ گاؤں کے باشندے فصل کٹائی کی مصروفیات سے فارغ ہو کر آرام یا کھیل تماشوں کی طرف رجوع ہو رہے تھے۔ ایک بڑے سے برگد کے پیڑ تلے نوجوان نجو بیٹھا گنگنا رہا تھا۔ رحمو اس کے قریب کھڑا ہوا دھیمی آواز میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یکایک اُس نے اپنی آواز کو بلند کرتے ہوئے نجو سے پوچھا، ''کیوں، ہے منظور؟'' اس کی آنکھوں میں مکاری کی چمک تھی۔

Marfat.com

نجو نے گنگنانا بند کر کے رحمو پر ایک نظر ڈالی اور بے پروائی سے بولا، ''چل رہنے بھی دے۔ جو مولا کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔''

''پھر وہی۔'' رحمو نے کہا، ''میں صاف صاف جواب چاہتا ہوں۔ تو مجھے صاف صاف جواب دے نا۔''

''تو چاہتا کیا ہے؟'' نجو نے اپنی زخمی ٹانگ کو احتیاط سے زمین پر پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

''معاملہ اِدھر ہو جائے یا اُدھر ہو جائے۔'' رحمو مسکرایا۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''صاف کہہ۔ مطلب کیا ہے تیرا؟'' نجو نے اپنی لاٹھی زمین پر ٹیکی۔ ''تو مِیداں کے پیچھے آخر کب سے پڑا ہوا ہے؟''

''یہ بات چھوڑ۔'' رحمو جواب میں بولا، ''گاؤں کا کون سا نوجوان ہے جو مِیداں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہے۔ مگر مقابلہ تو میرا اور تیرا ہی ہوگا۔''

''کیا مقابلے مقابلے کی رٹ لگا رکھی ہے۔'' نجو نے بڑبڑاتے ہوئے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔

''رٹ کیسی، میں تو دوٹوک فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔'' رحمو نے اپنی آواز میں رعب پیدا کرنے کی کوشش کی، ''بول کیا کہتا ہے؟''

''اگر یہ بات ہے...'' نجو بولا، ''تو آ بہادروں کی طرح فیصلہ کرلیں۔ ایک تلوار تو لے ایک میں لیے لیتا ہوں۔ منٹوں میں فیصلہ ہو جائے گا۔''

رحمو نے کہا، ''اجی وہ تلواروں کا زمانہ اب نہیں ہے۔''

''تو پھر اور کس طرح فیصلہ کرنا چاہتا ہے تو؟'' نجو نے پوچھا۔

رحمو کچھ کہنے ہی کو تھا کہ نجو نے پھر کہا، ''جا کر پوچھ آ مِیداں کے باپ ہی سے۔''

رحمو کے تن بدن میں جیسے آگ لگ گئی۔ تلملا کر بولا، ''کہے تو خود مِیداں سے

Marfat.com

پوچھ آؤں۔''

''تیری مرضی۔'' نجو منہ پھیر کر مسکرایا۔ ''جا پوچھ آ۔''

''اچھا اب مذاق چھوڑ۔'' رحمو کہنے لگا، ''صاف صاف بات کر۔''

نجو نے بے پروائی سے کہا، ''تو نے پہر بھر سے میری جان کھا رکھی ہے۔ مطلب تو بیان کر کہ تو آخر چاہتا کیا ہے؟''

رحمو بولا، ''وہی جو پہلے کہہ چکا ہوں۔ اب کے سوموار کو گاؤں کے باہر میدان میں جو گھڑ دوڑ ہوگی اس میں میرا تیرا فیصلہ ہو جائے۔ جو جیت جائے مِیداں اُسی کی۔ بول منظور ہے تجھے؟''

نجو ہنس پڑا۔ ''جا جا بھلے آدمی اپنا کام کر۔ بڑا آیا وہاں سے گھڑ دوڑ میں مقابلہ کرنے والا۔''

''ہوں!'' رحمو نے آنکھوں کے گوشے دبا کر نجو کی طرف دیکھا، ''مقابلے کا نام آیا تو لگا بھاگنے۔ ہے نا بزدل۔'' وہ نجو کو مشتعل کرنے کی فکر میں تھا۔

''پہلے کبھی میری تیری دوڑ ہوئی تو نہیں شاید۔'' نجو نے طنز کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تجھے تو میں گھڑ دوڑ میں بارہا ہرا چکا ہوں۔

رحمو بولا، ''ہوئی تو ہے۔ مگر کبھی اس طرح کا مقابلہ نہیں ہوا۔ لے اب بہادروں کی طرح شرط لگا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔

''تو مجھے غصے میں لانا چاہتا ہے۔'' نجو نے کہا، ''مگر بیوقوف میرے تیرے درمیان مِیداں کے بارے میں کوئی دوٹوک فیصلہ ہو بھی جائے تو اِس سے کیا ہوگا۔ مِیداں کا باپ ابھی زندہ بیٹھا ہے۔ فیصلہ تو اُسی کے کیے ہوگا۔''

رحمو چلّا کر بولا، ''پھر وہی بات ! لے اب سن !! مِیداں کے باپ کی مرضی بھی یہی ہے کہ ہم دونوں اِس بارے میں آپس میں فیصلہ کرلیں۔ چودھری دینا سے بات چلی تھی۔ اُس نے کہا رحمو اور نجو آپس میں جس طرح چاہیں نمٹ لیں۔ اُن کا جو فیصلہ ہوگا وہ مجھے بھی منظور ہوگا۔'' وہ مسکرایا۔

Marfat.com

نجو بولا، ''اور تو نے سوچا یہ موقع اچھا ہے۔ نجو کی ٹانگ میں چوٹ لگی ہے۔ گھڑ دوڑ میں اُسے بڑی آسانی سے ہرا کر میدان جیت لوں گا۔ کیوں؟''

رحمو کے چہرے پر پہلے تو گھبراہٹ کے آثار نمودار ہوئے مگر پھر وہ سنبھل کر بولا، ''دیکھا اب چوٹ کا بہانہ کرنے لگا۔ میں نے بزدل کہہ دیا تو آگ لگ گئی۔ اب یہ بزدلی نہیں تو اور کیا ہے، دل گردے کے آدمی کہیں چوٹوں ووٹوں کی پروا کیا کرتے ہیں۔ ویسے ہر کوئی جتنے چاہے بہانے کرلے۔''

''اچھا!'' نجو جیسے گرما گیا۔ ''آنے دے سوموار۔''

''تو بات پکی رہی۔'' رحمو اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا اور اُٹھتے ہوئے بولا، ''مار ہاتھ پہ ہاتھ۔''

نجو نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مار دیا۔

رحمو زیرِلب مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اُس کا دل خوشی سے بلیوں اُچھل رہا تھا۔

☆

گھڑ دوڑ شروع ہو چکی تھی...

اب نجو اور رحمو کی باری تھی۔ نجو کو لوگوں نے سمجھایا کہ ٹانگ میں چوٹ آئی ہوئی ہے وہ اِس حالت میں گھڑ دوڑ میں حصہ نہ لے مگر اُس نے سنی اَن سنی کردی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ آج وہ شانِ بے نیازی، جو اس کا امتیازی وصف ہے، غائب ہے بلکہ چہرے پر پریشانی ہے۔ آج اس نے حسبِ عادت دوستوں سے ہنس ہنس کر باتیں بھی نہیں کیں۔ اُس نے اِن سے آنکھ تک نہیں ملائی۔ سامنے کی طرف دور درختوں کے جھنڈ پر نظریں جمائے رہا۔

جھنڈی ہلائی گئی۔ گھوڑوں کے ایڑ لگی۔ نجو اور رحمو ہوا ہوگئے۔ تماشائیوں کی نظریں بھی اُن کے پیچھے پیچھے دوڑیں۔

دونوں کے گھوڑے اس طرح ساتھ ساتھ جارہے تھے جیسے وہ ایک ہی گاڑی میں جتے ہوئے ہیں۔ نجو کو ٹانگ کی چوٹ کی وجہ سے بڑی سخت تکلیف محسوس ہو رہی تھی

مگر تصور میں مِیداں سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ ہر قیمت پر رحمو سے پہلے مِیداں تک پہنچنا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ رحمو سے آگے نکل گیا لیکن اب اُس کی ٹانگ میں ناقابلِ برداشت درد ہونے لگا اور پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ٹانگ ٹوٹ گرے گی مگر اُس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ تھی۔ تصور میں مِیداں جو سامنے کھڑی نظر آ رہی تھی۔

تکلیف ناقابلِ برداشت ہوئی جا رہی تھی۔ مگر وہ اب بھی انتہائی تیزی سے دوڑتا چلا گیا۔ اُس نے اُس تختی کی شست باندھی جسے نیزے سے چھیدنا تھا۔

شور کی آواز اُس کے کانوں میں آئی...

اُس نے خود کو گرتا ہوا محسوس کیا...

جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ درد کی شدّت سے چیخ اٹھا۔

''کیا ہوا نجو!'' شمشیر پہلوان نے کہا جو اس کی ٹانگ کی مالش کر رہا تھا، ''ذرا حوصلے سے کام لے۔ جوان آدمی ہو کے رو دیا۔''

نجو خاموشی سے درد کی ٹیسیں ضبط کر کے کچھ سوچنے لگا۔ شمشیر اپنے کام میں لگا رہا۔ پھر بولا، ''ہار جیت ہوا ہی کرتی ہے۔ معمولی بات ہے۔ ایک تو ہار گیا تو کیا ہوگیا۔''

نجو کو درد سے زیادہ اس خیال سے تکلیف ہو رہی تھی کہ رحمو جیت گیا۔ اِس سے پہلے کبھی رحمو اُس سے گھڑ دوڑ میں سبقت نہ لے جا سکا تھا۔ آج بھی نجو کو یہی یقین تھا کہ میں جیتوں گا لیکن قسمت! یوں رحمو سے ہارنے کا بھی نجو کو ملال تھا مگر اس ہار جیت پر کسی اور بات کا انحصار بھی تو تھا۔ نجو سوچنے لگا۔ کیا گاؤں والوں کو ہم دونوں کی شرط کا علم ہو چکا ہے؟ کیا مِیداں اور اس کے باپ کو بھی معلوم ہو چکا ہے کہ ہم نے اِس مقابلے کی ہار جیت پر کس بات کا فیصلہ اٹھا رکھا تھا؟ اور اگر انھیں معلوم ہو گیا ہے تو کیا مِیداں کے باپ نے اپنی بیٹی کی شادی رحمو کے ساتھ کرنے کا اعلان کر دیا ہے؟

دفعتاً باہر سے مِیداں کے باپ کی آواز سنائی دی۔ وہ نجو کے باپ سے پوچھ رہا تھا، ''کہو بھئی، لڑکے کا کیا حال ہے؟''

نجو کے باپ نے جواب میں اُس سے کچھ کہا جسے نجو نہ سن سکا۔ مِیداں کا باپ

Marfat.com

اندر آیا اور شمشیر سے پوچھنے لگا، ''کہو بھئی، ٹھیک ہوگئی نجو کی ٹانگ؟''

''ہاں جی۔'' شمشیر نے جواب دیا۔ ''دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔''

جب کچھ دیر بعد شمشیر اپنا کام ختم کر کے چلا گیا تو مِیداں کے باپ نے نجو سے کہا، ''تو کچھ ملال نہ کرنا بیٹا۔ اللّٰہ کی مرضی یہی تھی۔''

نجو خاموش رہا۔

میداں کا باپ اٹھ کر جاتے ہوئے بولا، ''اچھا اب چلتا ہوں۔ تجھے دیکھنے چلا آیا تھا۔ رحمو شادی کے لیے جلدی کر رہا ہے مگر میں تیری ٹانگ اچھی ہونے تک مِیداں کی شادی نہیں کروں گا۔''

نجو کی ٹانگ میں تو درد ہو ہی رہا تھا مگر اب اُسے اِس سے کہیں زیادہ درد اپنے سینے کی گہرائیوں میں محسوس ہونے لگا۔

دوسرے دن صبح گاؤں بھر میں چرچا ہو رہا تھا کہ نجو غائب ہو گیا۔ کئی دن تک یہ سانحہ موضوعِ بحث بنا رہا۔ پنگھٹ پر لڑکیاں، گھروں میں عورتیں، کھیتوں میں مرد اور لڑکے، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی نجو ہی کے متعلق باتیں کرتے۔

کچھ دن بعد رحمو کے باپ نے اپنے لڑکے کا پیغام مِیداں کے لیے دیا جسے مِیداں کے باپ نے منظور کر لیا۔ اب گاؤں میں رحمو اور مِیداں کی شادی کے چرچے ہونے لگے۔ جس طرح ہر نئی خبر پرانی خبروں پر چھا جاتی ہے اِسی طرح اِس شادی کی خبر نے نجو کی اچانک گم شدگی کی خبر کو لوگوں کے ذہنوں سے محو کر دیا۔ عورتوں کے لیے یوں بھی شادی بیاہ سے زیادہ دلچسپ بات اور کوئی نہیں ہوتی، انھیں دل پسند موضوع ہاتھ آ گیا۔ ہر وقت اِسی کے ذکر اذکار رہنے لگے لیکن لڑکیاں بالیاں جب کبھی مِیداں کو چھیڑتیں تو وہ مسکرانے اور شرمانے کی بجائے زمین کو گھورنے لگتی اور پھر ایک دن ہمت کر کے اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ میں تو رحمو سے شادی نہیں کروں گی۔ یہ بات باپ تک پہنچی تو وہ بیٹی کو ڈانٹنے لگا مگر جب مِیداں رونے لگی تو بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔

اس کے دوسرے ہی دن مِیداں نے اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھ رحمو کو ندی پر

Marfat.com

ملنے کا سندیسا بھجوایا۔ رحمو خوشی سے پھولا نہ سمایا، بن سنور کر ندی کنارے پہنچا اور ایک درخت کے سائے میں بیٹھ کر ایک گیت گنگنانے لگا۔

میداں آئی۔ رحمو جلدی سے سنبھل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب پہنچ کر بولا، ''رانی جی اپنے غلام کو کیوں یاد فرمایا ہے؟''

مِیداں نے شرما کر گھونگھٹ نکال لیا اور آہستہ سے بولی۔ ''یوں ہی!''

کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مِیداں شرما شرما کر جھجک جھجک کر باتیں کرتی رہی پھر اُس نے پوچھا، ''وہ نجو بے غیرت کہاں غائب ہو گیا؟''

رحمو کا منھ، پہلے تو حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا، پھر اُس کے زبان سے نکلا... ''نجو؟''

''ہاں۔'' مِیداں بولی، ''اُس نے سارے گاؤں میں اُڑا رکھی تھی کہ میں...'' اور فقرہ نا تمام چھوڑ کر خاموش ہوگئی۔

''ہاں ہاں وہ سب سے کہا کرتا تھا کہ مِیداں تو مجھ سے ہی بیاہ کرے گی اور...'' رحمو نے بے پر کی اُڑائی۔

مِیداں نے سر ہلا کر انکار کیا۔

رحمو کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ ''بڑا فریبی تھا۔ بھاگ نکلا نا جب یاروں سے مقابلہ ہوا۔''

''کہاں بھاگ گیا وہ؟'' مِیداں نے سوکھا سا منھ بنا کر سوال کیا۔

''گیا ہوگا کہیں، ہمیں کیا۔'' رحمو اس موضوع کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

''پھر کبھی تو نہیں آئے گا؟'' مِیداں کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ارے اب اُس کا بھوت بھی نہیں آئے گا اِس گاؤں میں۔'' رحمو نے جوش میں آ کر بھید کھولنا شروع کر دیا۔ ''میں نے بھی وہ چال چلی ہے کہ یاد کرے گا جنم بھر۔''

''کیا چال؟'' مِیداں نے بڑی بے پروائی سے پوچھا۔

رحمو فخر و غرور سے ہنسا۔ ''اُس کے چوٹ لگ گئی تھی نا ٹانگ میں۔ گر پڑا تھا

Marfat.com

کوٹھا بنانے میں۔ اب تم سے کیا چھپانا، وہ بھی میری ہی چال تھی۔ لمبا قصہ ہے اِس کو چھوڑو۔ پھر میں نے اُس سے کہا کہ جو گھڑ دوڑ میں جیت جائے مِیداں اُسی کی۔ وہ راضی ہوگیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اُسے اپنی شہ سواری پر بڑا گھمنڈ ہے۔ اس لیے ترنگ میں آکر شرط لگانے پر راضی ہو جائے گا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اُس کا حال تم نے سن ہی لیا ہوگا۔ وہ راستے ہی میں گر پڑا۔ میں نے بازی جیت لی۔ اُسی دن رات سے وہ غائب ہے۔''

''ہوں۔'' مِیداں بولی، ''اب کیا منہ لے کر آئے گا یہاں؟''

''اُوں ہُوں۔'' رحمو بولا، ''قیامت تک بھی نہیں آسکتا۔ تم اُسے بے غیرت کہتی ہو۔ میں کہوں گا کہ اور چاہے کچھ ہو مگر نجو ہے بہادر اور غیرت دار۔'' اور مِیداں کے دل کش چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

مِیداں نے پلکوں پر اٹکے ہوئے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے گھونگھٹ اور لمبا کرلیا اور پھر جلدی واپس ہوگئی۔

دوسرے دن جب بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں، مِیداں کے گھر میں کہرام مچ گیا۔ مِیداں گھر سے غائب تھی۔

سارے گاؤں میں بے چینی پھیل گئی۔

شام کو گاؤں سے دو کوس پرے ندی میں مِیداں کی لاش تیرتی ملی۔

اُسی دن رحمو گھر سے گیا تو پھر واپس نہ آیا۔

☆

اِس واقعے کو پچیس سال گزر چکے تھے۔ گاؤں کی زندگی اب بھی وہی تھی۔ وہی سادہ دل اور سادہ مزاج دہقان، وہی گاؤں کے پاس سے ہو کر گزرتی ہوئی ندی، جس کی لہروں سے اہلِ دیہہ کی بہت سی مسرت آمیز اور غم انگیز یادیں وابستہ تھیں، وہی ندی کے کنارے کے سرسبز و شاداب درخت، وہی چاندنی راتوں میں بچوں کا کھیلنا کودنا، وہی لڑکیوں بالیوں کا پنگھٹ پر اکٹھے ہو کر پانی بھرنا، چہلیں کرنا اور گیت گانا، وہی گاؤں کے نوجوانوں کا سینے نکال نکال کر چلنا، وہی ہر مرتبہ فصل کی کٹائی کے بعد کھیل کود اور گھڑ دوڑ

Marfat.com

اور ان میں وہی پہلے سے ہنگامے۔

آج گاؤں کے باہر میدان میں بالکل ویسی ہی ایک گھڑ دوڑ ہو رہی تھی جیسی نجو اور رحمو میں پچیس برس پہلے ہوئی تھی۔

برگد کے درخت تلے دو نوجوان مقابلے کی گھوڑ دوڑ شروع کرنے کے لیے چاق چوبند کھڑے نظر آ رہے تھے۔

کچھ فاصلے پر ایک بوڑھا آدمی کھڑا تھا اور ایسی نظروں سے اِن دونوں کو گھور رہا تھا جن سے بے چینی عیاں تھی۔

وہ اجنبی معلوم ہوتا تھا کیوں کہ گو وہ خاصی دیر سے یہاں کھڑا تھا لیکن نہ تو اس نے گاؤں کے کسی آدمی سے بات کی نہ گاؤں کے باشندوں میں سے کوئی اس کی طرف متوجہ ہوا۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس بوڑھے کو گھڑ دوڑ سے کوئی دلچسپی ہے نہ تماشائیوں سے بلکہ وہ محض ان دونوں نوجوانوں کے بارے میں کوئی خاص قسم کی بے چینی محسوس کر رہا ہے اور یہ بے چینی اسے مجبور کر رہی ہے کہ ان کو گھورتا رہے۔

پھر اس بوڑھے آدمی نے ان کی طرف سے اپنی نظریں ہٹالیں اور گاؤں کی راہ لی۔ یوں تو وہ بستی کی طرف نظریں اُٹھائے چل رہا تھا، لیکن اصل میں وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ اسے کچھ یاد آ رہا تھا... کوئی پرانا واقعہ، کوئی ایسا واقعہ جس نے اس کے دل کو بے چین اور بے قرار کر کے اس کے سینے میں ہلچل ڈال دی تھی۔ وہ چند قدم گاؤں کی طرف بڑھتا پھر رک جاتا اور پلٹ کر گھڑ دوڑ کے میدان کی طرف دیکھنے لگتا۔

وہ دونوں نوجوان، جنھیں بوڑھا گھورتا ہوا گیا تھا، اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ بوڑھے نے گاؤں کی طرف بڑھتے ہوئے انھیں گھوڑوں پر بیٹھتے دیکھا تو ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حالت کچھ ایسی تھی کہ جیسے وہ تو آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ اس کے چہرے پر اضطراب کے جو نمایاں آثار نظر آ رہے تھے ان سے یہ صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل بڑے زور زور سے دھڑک رہا ہے۔

Marfat.com

دور ایک جھنڈی فضا میں لہرائی۔ بوڑھے نے گھوڑوں کی ٹاپوں کی اُس آواز پر کان لگا دیے جو ہوا پر تیرتی ہوئی اس تک آ رہی تھی۔

دوڑ لگانے والے جوانوں میں سے ایک کے سر پر سبز پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ وہ دوسرے جوان سے آگے تھا۔ دوڑ لگاتے میں اس کے کپڑے تیز ہوا سے پھریروں کی طرح اڑ رہے تھے۔ بوڑھے نے دیکھا کہ اس نوجوان کی ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ وہ سوچ میں تو پہلے ہی پڑا ہوا تھا اب یہ سوچ اور بھی گہری ہوگئی لیکن اب اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی کھیلنے لگی۔ اس کے چہرے پر اضطراب کے جو آثار تھے، اب وہ اس مسکراہٹ میں جیسے گم ہوگئے۔

دونوں سوار بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔ بوڑھے نے دیکھا کہ سبز پگڑی والا نوجوان جس کی ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی اب بھی دُوسرے جوان سے آگے تھا۔

بوڑھا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ جیسے اپنی دل کے کانپ اٹھنے سے لرز گیا۔ اس نے خود سے کہا، ''ارے !!!'' اس کے اس شدید اظہار حیرت کی وجہ شاید یہ تھی کہ سبز پگڑی والا زخمی ٹانگ کا نوجوان مقابل سے پیچھے رہا جارہا تھا۔

رفتہ رفتہ اِن دونوں سواروں کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا گیا۔ دوسرا جوان سبز پگڑی والے جوان سے کافی آگے نکل چکا تھا۔ اب وہ بوڑھے کے بہت قریب آگیا تھا۔ سبز پگڑی والا جوان کافی دور تھا۔ بوڑھے نے بے قرار ہو کر خود سے کہا، ''وہ پیچھے رہ گیا ہے۔''

دفعتاً دوسرے جوان کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بوڑھے کے بہت قریب آگئی۔ بوڑھے نے سوار کی طرف دیکھا اور چشمِ زدن میں خود کو اُس کے گھوڑے کے آگے ڈال دیا۔ گھوڑا اِس ٹکر سے بدک کر پیچھے ہٹا اور رُک گیا۔

اِتنے میں سبز پگڑی والا جوان تیزی سے قریب آگیا اور دوسرے جوان کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ اُس کے بازی جیت لینے پر تحسین و آفرین کا شور ہونے لگا۔ مگر اچانک

Marfat.com

یہ شور لوگوں کی چیخ پکار اور ابتری میں تبدیل ہو گیا۔ وہ چیختے چلاتے اس اجنبی بوڑھے کو دیکھنے کے لیے دوڑ رہے تھے جس نے پوری رفتار پر دوڑتے ہوئے گھوڑے کے آگے آ کر خود کو نذرِ اجل کر دیا تھا۔

گھوڑ دوڑ کے سارے تماشائیوں کا بوڑھے کی لاش پر مجمع ہو گیا۔ بوڑھے کے کپڑے خون میں لت پت تھے۔

گاؤں کے بوڑھے چودھری کو بلا کر لایا گیا۔ اُس نے بوڑھے کی لاش پر آ کر اُس کا چہرہ دیکھا تو دفعتاً چیخ اٹھا، ''نجو۔'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں برسنے لگیں۔ یہ وہ لازوال موتی تھے جو انسانیت کا احترام نجو کی لاش پر نچھاور کر رہا تھا۔

☆

ایک ہفتے بعد گاؤں کی حسین ترین لڑکی کی شادی گاؤں کے سب سے خوب صورت اور دلیر نوجوان حمید کے ساتھ ہوئی۔ اُس شام بوڑھے چودھری نے سب کو نجو کی داستان سنائی۔

Marfat.com

سچ ہے... سچ ہے

بشریٰ کارپوریٹ آفس سے ٹریننگ کے بعد نکلی تو ہاتھ دے کر ٹیکسی روکی۔ اندر عمارت میں بس کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن وہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ایک خاتون جو کار سے آئی تھیں، نصیحت کرنے لگیں... ''یونین اسٹیشن زیادہ دور نہیں، ٹیکسی لے لو مشکل سے تین چار ڈالر لگیں گے۔ بس لمبا چکّر کاٹ کر جاتی ہے۔ اکثر خالی ہوتی ہے۔ علاقہ تو خراب ہے ہی اور ڈرائیور... کالا پیلا تو میں نہ کہوں گی کہ امریکا میں ہر بات کی آزادی ہے صرف رنگوں کے نام لینے کی آزادی نہیں ہے لیکن بہرحال حد سے زیادہ خردماغ، جاہل، جان سے بیزار... یوں لگتا ہے کہ شکاگو دریا کے پل کے ہر ستون سے بس کو ٹکرانے کا ارادہ کر کے چلا ہے۔''

کالے پیلے رنگوں کا ڈر تو اتنا نہ تھا مگر وقت خراب کرنے سے گھبراتی تھی۔ گھر میں دیر سے آنے پر زیادہ پوچھ گچھ ہو تو آدمی گھبرانے ہی لگتا ہے۔ ٹیکسی رکی تو ڈرائیور اپنی طرف کا لگا... ہندوستانی یا پاکستانی... نہیں، بالکل پاکستانی۔ بڑا بھلا مانس، بالکل دیکھا ہوا سا... ارے آپ اکیلے... ہاں سمجھ گیا۔ پینٹنگ کے لیے اسٹڈی ہو رہی ہوگی... سیئرز ٹاور سے چوطرفہ کیا نظارہ ہے بھائی... ایک طرف اپنا ایکوریم... دوسری طرف عمارتیں ہی

Marfat.com

عمارتیں... تیسری طرف کیا ہے بھائی...؟''

''جھیل ہی ہے...'' بشریٰ نے کہا۔

''ہاں جھیل اور عمارتوں کے تو الگ الگ ہیں۔لوگ نقشہ دیکھ کر دیکھتے پھرتے ہیں اور آپ جیسے آرٹسٹ پل بھر میں سارا منظر کاغذ پر اتار لیتے ہیں... بڑا ہنر ہے بھائی، بہت بڑا... اور کیا قیمتیں ہیں یہاں پینٹنگوں کی... ایک چھوٹی موٹی پینٹنگ ہزار ڈالر میں مزے سے بک جائے گی۔''

بشریٰ کھسیانی ہنسی ہنس دی، ''بھائی آپ ابھی تک ویسی ہی باتیں کرتے ہیں۔''

''ارے تو کیا اپنی باتیں بھی بھول جاؤں۔''

''آپ کس طرف جا رہے ہیں مجھے یونین اسٹیشن جانا ہے۔''

''ابھی تو آپ میرے گھر جا رہی ہیں۔ یہ میرا دھندا نہیں ہے۔ ایک دوست کا بیٹا ٹیکسی چلاتا ہے۔ وہ بیمار ہو گیا تو میں نے کہا کہ ایک دن میں چلا لیتا ہوں، بے چارے کے سو ڈالر کا نقصان کیوں ہو؟''

''تو چلایئے، بے چارے کا نقصان میرے کھاتے میں تو نہ ڈالیے۔''

''آپ بھی باتیں اسی طرح کی کرتی ہیں بھابھی... آپ کو یونین اسٹیشن چھوڑ دوں اور گھر نہ لے جاؤں تو ربیعہ مجھے کھا جائے گی۔ جب آپ کی پینٹنگ بک جائے سو پچاس اس بے چارے لڑکے کے لیے نکال دیجیے گا۔ اس کا نقصان پورا ہو جائے گا۔''

''ضرور... مگر میرے میاں انتظار کر رہے ہوں گے۔ جاب پر ہوں تو بھی فون کر کے پوچھتے ہیں کہ خیریت سے واپس آ گئیں۔''

''ان کو فون کر کے وہیں بلا لیں گے... مگر آپ کے شوہر جاب کیا کرتے ہیں، وہ تو بہت اچھے گزیٹڈ افسر تھے۔''

''یوں ہی وقت گزاری کے لیے ایک اسپتال چلے جاتے ہیں۔ والنٹیئرز کام کرتے ہیں، مگر میرے منہ سے job ہی نکل جاتا ہے۔'' بشریٰ نے بات بنائی۔

''اچھا ہے، اچھا ہے... اچھا وقت گزر جاتا ہوگا... وقت گزاری بھی بڑا مسئلہ ہے

Marfat.com

امریکا میں...''

پھر ڈیوان(Devon) کی گلیوں میں گھومتے پھرتے کہیں ان کا گھر آ گیا۔ ایسا ہی اپارٹمنٹ تھا جیسا کہ شہروں میں اوسط درجے کے اپارٹمنٹ ہوتے ہیں۔ متوسط درجے کا فرنیچر... متوسط درجے کی صفائی جو کہ شہر، خاص طور پر شکاگو شہر کا خاصا ہے۔ متوسط قسم کی چائے اور اس کے ساتھ ناشتے کی چند چیزیں...

مروۃ نے بشریٰ کے شوہر کو فون کیا۔ اب تک گھر نہیں پہنچے تھے۔ مشین پر پیغام چھوڑ دیا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ بشریٰ کو ذرا دیر ہو جائے گی۔ ربیعہ کھانے کے لیے اصرار کرتی رہی لیکن بشریٰ راضی نہ ہوئی اور مروۃ اسے یونین اسٹیشن چھوڑ گئے۔ ٹیکسی سے اترتے وقت اس نے پوچھا، ''آپ کیا کرتے ہیں مروۃ بھائی...؟''

''ہم... بس کچھ کر ہی لیتے ہیں، عزت کی روٹی کھا لیتے ہیں۔''

''اچھا، بہت بہت شکریہ...'' وہ پرس کھول کر پیسے نکالنے لگی۔

''ارے کیا غضب کرتی ہیں آپ... آپ سے پیسے لوں گا؟''

''اس بچے کے لیے جس کی ٹیکسی ہے۔''

''نہ... نہ... اس کو چاہے اپنی جیب سے دے دوں گا، مگر بہن ، بھاوج سے لوں۔ یہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔''

''امریکا میں سب ہوتا ہے۔''

''نہ امریکا میں... نہ کہیں اور دنیا میں... جو ہمارے ہاں نہیں ہوتا وہ کہیں نہیں ہوگا انھوں نے قطعیت سے کہا۔''

بشریٰ کو معلوم تھا... مروۃ بھائی ہرگز نہیں مانیں گے... اصرار کرنا بے کار ہے... رخصت ہو کر یونین اسٹیشن کی طرف بڑھی۔

یونین اسٹیشن میں ہمیشہ کی طرح ہلچل... آر جار... بہت سے لوگ بنچوں پر سامان دھرے اخبار پڑھ رہے ہیں مگر ان کے چہروں پر سفر کی ہلچل لکھی ہے۔ ٹی وی اسکرین پر ٹرین کے اوقات پلیٹ فارم نمبر چلے آ رہے ہیں۔ پرانی، آرام دہ اور رعب دار عمارت سفر

کی ساری ہلچل کو بردباری سے سہ رہی ہے۔ مسافروں کو دھیرج کا سبق دے رہی ہے لیکن سبق لینے والا کوئی نہیں... لوگ زندگی کے مختلف دروازوں کی طرح کسی طرف سے آرہے ہیں، کسی دروازے سے باہر نکل رہے ہیں۔ کوئی دروازہ کسی سڑک پر کھلتا ہے کوئی کسی پر... چلتی پٹری سے اوپر چلے جاؤ تو وہاں سے نئی گزرگاہیں نظر آتی ہیں۔ مغرب کی طرف کچھ اور راستے ہیں۔ مشرق کی سمت کچھ اور راہیں ہیں۔ بشریٰ ٹکٹ گھر کی طرف آئی۔ قطار میں لگ کر ٹکٹ لیا اور اپنے پلیٹ فارم سے نزدیک ترین بنچ پر بیٹھ گئی۔ ایک صاف ستھری خاتون لمبے پھول دار ریشمی ڈریس میں بیٹھی تھیں۔ انداز میں طنطنہ نہ تھا مگر تمکنت تھی۔ خود بھی خوب صورت تھیں اور نیلی جین تنگ اسٹریچ پتلونوں اور بے ڈھنگی ٹی شرٹوں کے اس ہنگامے میں ان کا لباس بہت ہی باوقار لگ رہا تھا۔ بشریٰ کا دل چاہا کہ اس خوب صورت خاتون سے کوئی بات کرے۔

''آپ کہاں جارہی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کہیں نہیں۔ میں مشی گن سے ٹرین سے پہنچی ہوں۔ شوہر کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ کار لے کر آئیں گے۔''

''وہ پہنچے نہیں، شاید ٹرین کا وقت انھیں معلوم نہیں تھا۔'' بشریٰ نے اظہارِ خیال کیا۔

''معلوم تھا...'' خاتون نے دھیرج سے کہا، ''شاید ٹریفک زیادہ ہو یا کسی اور وجہ سے دیر ہوگئی ہو۔''

بشریٰ کو خاتون کی اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ سفر کے بعد ہر ایک کو گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی ہے۔ شوہر کو وقت کا علم ہو اور پھر بھی نہ پہنچے تو شکایت ہوتی ہے خواہ زیرِلب...

''آپ کو گھر پہنچنے کی جلدی نہیں ویسے سفر میں تھکی تو ہوں گی...'' بشریٰ نے کہا۔

''جلدی کس بات کی۔ آخر گھر ہی جانا ہے... اور سفر میں آدمی تھکتا ضرور ہے مگر خوش بھی ہوتا ہے ورنہ سفر کرے ہی کیوں...''

Marfat.com

بشریٰ خفیف سی ہوگئی... ''مجھے کوئی وقت پر لینے نہ آئے تو بڑی بے چینی ہوتی ہے۔'' اس نے اعترافِ جرم میں بہتری جانی... ''شوہر تو شوہر میری سہیلی نہ پہنچے تو فوراً شکایت شروع کر دیتی ہوں۔''

''ہونھ...'' اس حسین عورت نے ترحم بھری محبت سے اس کی صاف گوئی کی پذیرائی کی... ''میں سمجھتی ہوں کہ کوئی وجہ ہی ہوگی جو نہ آئے اور پھر یہاں بھی تو بیٹھی ہی ہوں، کار میں بیٹھو، گھر میں بیٹھو یا یہاں بیٹھے رہو ایک ہی بات ہے۔''

''واہ کیا سچی بات کہی ہے...'' بشریٰ نے دل ہی دل میں تعریف کی... ''عورت ہے، فلاسفر ہے یا سکون کا مجسمہ ہے...'' اسے خود سے شرم سی آنے لگی۔ وہ تو اب تک سیکڑوں چکر مختلف دروازوں کے لگا چکی ہوتی۔ فون کرتی سو الگ اور میاں کو دیکھتے ہی تڑتڑ برسنے لگتی۔ اسے چاہیے کہ اس عورت سے سبق سیکھے۔ واقعی گھر سے نکلے تو کتنے سبق سیکھتا ہے انسان۔ ایک سبق مروۃ بھائی نے دیا جو اپنے دوست کے بچے کے لیے اپنی ملازمت کا نقصان کر کے اس کے سو ڈالر کا نقصان پورا کر رہے ہیں۔ دوسری یہ خاتون ہیں جو شوہر کے نہ آنے پر اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھی ہیں۔ ہجوم میں دلچسپی بھی نہیں لے رہیں۔ مطالعہ بھی نہیں کر رہیں مگر کلائی کی گھڑی پر نظر بھی نہیں ہے۔ یہ تاثر نہیں کہ یہاں بیٹھنا اچھا لگ رہا ہے مگر بس دھیرج ہے کہ یوں ہے تو یوں ہی سہی... اور یہی تو بڑی بات ہے جو اس کے اندر ساری عمر پیدا نہ ہو سکی۔ ایک بار پھر احساسِ کمتری نے گلے میں باہیں ڈالیں۔ وہ اسے جھٹک بھی نہ سکی۔ کس برتے پر جھٹکتی۔

یکایک کچھ ہلچل سی مچی۔ کچھ لوگ کھانسے، پھر کچھ اور لوگ کھانستے چلے گئے۔ یکایک بشریٰ کو بھی کھانسی آئی۔ روکنے کے باوجود نہ روک سکی۔ کھانسی سے اس کی دوستی نہ تھی۔ اسے عجیب سا لگا۔ پھر محسوس ہوا، فضا میں ایک دھانس سی ہے جیسے مرچیں تلنے سے باورچی خانے میں پھیل جاتی ہے۔ ایک لڑکا تیز تیز سا چلتا ہوا آیا اور یہ کہتا ہوا گزر گیا، ''ایک شخص نے اسٹیشن کے اندر مرچوں کا چھڑکاؤ کیا ہے۔''

اس کی بات کسی نے سنی، کسی نے نہ سنی۔ کچھ لوگ اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ کچھ

Marfat.com

کھانستے رہے۔ وہ دوبارہ اٹھ کر ٹکٹ گھر کی طرف چلی آئی۔ اس نے دیکھا کہ ایک پولیس والے نے ایک سیاہ فام شخص کے ہتھکڑیاں لگائیں اور دھکیلتا ہوا باہر کی طرف لے گیا۔ وہ واپس آئی۔ خوب صورت خاتون اسی طرح بیٹھی تھیں۔ کھانسی کا ہلکا سا ٹھکا انھیں بھی لگ رہا تھا۔

''آپ نے سنا۔ یہاں کسی نے مرچیں چھڑک دی ہیں۔ دوسری طرف دھانس کم ہے۔ اس طرف نہ چلیں۔'' بشریٰ نے کہا۔

''نہیں میں ٹھیک ہوں۔'' انھوں نے کہا اور اسی انداز سے بیٹھی رہیں۔

بشریٰ حسبِ عادت ذہن ہی ذہن میں پٹڑی سے اتر چکی تھی۔ خدا معلوم کیا چھڑکا ہو... کچھ اور بلا نہ ہو... گھڑی میں دیکھا ابھی گاڑی میں خاصا وقت تھا۔ اگر سانس کے ذریعے کوئی چیز جسم میں گئی ہے تو اس کا مداوا ہونا چاہیے۔ کیوں نہ عمارت سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سانس لیا جائے... وہ چلتی سیڑھیوں سے اوپر آئی۔ پھر عمارت سے باہر نکل آئی... شکاگو شہر کا دل یہیں تھا۔ ساری بڑی مشہور عمارتیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ نہایت شفاف دھوپ، چہل پہل، کیاریوں میں پھول بھی تھے۔ عورتیں بچوں کو گاڑیوں میں لیے کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ چند منٹ دھوپ اور تازہ ہوا میں سانس لے کر وہ پھر اندر چلی آئی۔ دور سے دیکھا کہ خاتون کے پاس اس کی جگہ بھر چکی ہے۔ وہاں ایک مرد بیٹھا تھا۔ وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑی ہوگئی... خوب صورت عورت کی شعلہ چاٹتی آواز سنائی دے رہی تھی... ''میں ہر دروازے پر گئی... سڑک تک گئی... گھر فون کیا۔ آخر تھک ہار کر یہاں بیٹھ گئی... تم کہاں تھے... تمھیں معلوم تھا میری گاڑی ٹھیک بارہ بجے پہنچ جائے گی۔ ایک عورت میرے پاس بیٹھی پوچھتی رہی... آپ کو اپنے شوہر پر غصہ نہیں، میں نے تمھارا بھرم رکھا۔ اس سے کہتی رہی... نہیں بالکل نہیں۔''

''تو تھوڑی دیر اور بھرم رکھ لو...'' شوہر نے آہستہ سے کہا... ''بس کار تک...''

''نہیں، اب میں برداشت نہیں کر سکتی، مجھے خوب معلوم ہے تم کہاں تھے... اس چڑیل کے پاس... اب حد ہو چکی ہے۔ مجھے آج... آج ہی طلاق چاہیے...''

Marfat.com

''اچھا اچھا... ڈارلنگ... یہاں سے تو نکلو خدا کے لیے لوگ سن رہے ہیں، آئی ایم سوری...'' شوہر نے بیوی کا بیگ اٹھایا اور باہر کی طرف چل دیا۔ خاتون بکتی جھکتی ساتھ چل دی۔ اس کے چہرے کی خشونت نے اس کی ساری خوب صورتی کو کھا لیا تھا۔ اب وہ مرد دھیرج کا مجسمہ تھا۔

بشریٰ پھر بنچ پر بیٹھ گئی تو چند منٹ بعد ایک لڑکی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ وہ شلوار قمیص میں تھی... ''باجی آپ کے پاس بیٹھ جاؤں...'' اس نے کہا۔

''ضرور...''

وہ بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی بشریٰ سے تابڑ توڑ سوال کر ڈالے۔ اس کے بعد بغیر پوچھے اپنے بارے میں بتانے لگی۔ اس کی شادی کو چند ماہ ہوئے تھے اور وہ امریکن شہری شوہر کے ساتھ شکاگو آ گئی تھی۔ اس کا شوہر امریکن شہری تو تھا مگر انجینئر نہیں تھا جو پاکستان میں اس نے بتایا تھا۔ وہ کسی فیکٹری میں ہاتھ سے پرزے جوڑنے کا کام کرتا تھا اور اصرار کرتا تھا کہ وہ انجینئر ہے۔ گھنٹے کے حساب سے نامعقول سا معاوضہ تھا۔ یہ بات لڑکی نے اپنے والدین سے چھپا لی تھی... ''کیا فائدہ جی بتانے کا... انھیں افسوس ہی ہوگا... ہر خط میں یہی لکھتی ہوں کہ میں بہت خوش ہوں، یوں بڑا سا گھر ہے۔ بڑی سی کار ہے، یوں سیریں کرتے ہیں۔ جب کہ جی ہمارے پاس گھر ہے نہ کار ہے نہ اتنے دن میں ہم نے کہیں سیر کی... آج پہلی مرتبہ ٹرین میں جانے کے لیے نکلی ہوں تو گھبرا رہی تھی۔ آپ کو دیکھ کر تسلی ہوئی۔ میرا اسٹیشن آئے تو مجھے ذرا پہلے سے بتا دیں...''

''کہاں جا رہی ہو...؟'' بشریٰ نے پوچھا۔

''ان کے ایک دوست کی بیوی ہے وہ یہاں پہلے سے ہے۔ وہ بھی اکیلی رہتی ہے۔ اس نے کہا، تم میرے گھر آؤ، اکٹھے بازار چلیں گے، پکچر دیکھیں گے۔ ان مردوں کے تو نہ آنے کا وقت ہے نہ جانے کا... رات کو دو تین بجے اٹھ کر جاتے ہیں۔ دوپہر میں آتے ہی پڑ کر سو جاتے ہیں اور پھر رات کو جانے کی فکر میں پڑے رہتے ہیں۔ ایسے کیسے زندگی گزرے گی... کبھی اپنے خاوند سے شکایت کرتی ہوں تو وہ ڈانٹ دیتے ہیں کہ شکر نہیں

کرتیں کہ امریکا میں بیٹھی ہو، دنیا ترستی ہے امریکا آنے کے لیے، عزت کی روٹی کھا رہی ہو اور کیا چاہیے؟''

اعلان ہوا کہ گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی ہے۔ وہ لڑکی بشریٰ کے ساتھ ہی بیٹھی اور راستے بھر اپنا دکھڑا روتی رہی۔ بشریٰ کے اسٹیشن سے ایک اسٹیشن پہلے اس کا اسٹیشن آیا اور وہ اُتر گئی... اس کی دوست جو اسے لینے آئی تھی بہت پُر اعتماد، جہاں دیدہ اور فیشن ایبل تھی۔ چند منٹ میں بشریٰ نے اس کے بارے میں یہی فیصلہ کیا...

بشریٰ کی ٹریننگ ابھی باقی تھی۔ تیسرے چوتھے دن کارپوریٹ بلڈنگ سے نکل رہی تھی تو پھر اس نے مروۃ بھائی کو اسی ٹیکسی میں دیکھا۔ بس اسٹینڈ کے پاس سے وہ کسی مسافر کو بٹھا رہے تھے... بشریٰ جلدی سے آڑ میں ہوگئی... وہ چلے گئے تو آ کر بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوگئی۔ روز روز ٹیکسی کا کرایہ دینا اس کے لیے مشکل تھا۔

ایک دن کیش رجسٹر پر کام کرتے مروۃ بھائی نے اسے پکڑ لیا... ''اچھا تصویریں بناتے بناتے آپ یہ کام کرنے لگیں...'' وہ سخت حیران تھے۔

''جناب، تصویر سال میں ایک بکتی ہے۔ پھر آپ کو معلوم ہے، یہاں کتنا سخت مقابلہ ہے۔ آرٹ پروموشن کے لیے پیسا چاہیے اور ایجنٹ کے بغیر یہاں کوئی تصویر نہیں بکتی۔ بھلا بتایے، اتنے پیسے کہاں سے لاؤں... میں بھی آپ کی طرح بس عزت کی روٹی...''

''سچ ہے... سچ ہے...'' وہ منہ میں بڑبڑائے اور دیر تک بڑبڑاتے رہے... ''سچ ہے...''

سوکھتی جھیلیں اور قحط

جھیل میں ڈوب جانے والا گاؤں دوبارہ نکل آیا تھا۔ اس گاؤں کے باسی آن کر دیکھتے تو شاید پہچان لیتے کہ ان کے گھر کی کون سی دیوار کتنی ڈھئی ہے۔ ڈیم کی تعمیر کے وقت جب انھیں گاؤں خالی کرنے کو کہا گیا تھا تو سب گاؤں والوں نے اس بستی کو چھوڑنے سے انکار کردیا تھا مگر آخری نوٹس کے وقت کہ اگر گاؤں خالی نہ ہوا تو مکانات کے ساتھ وہ بھی ڈوبیں گے، انھیں اپنے گھر خالی کرتے ہی بنی تھی۔ مگر اب جھیل کا پانی کم ہونے پر آپس کی دشمنیوں میں مار کر جھیل میں ڈبو دینے والوں کی ہڈیاں اور ڈیم بنا کر چھوڑی ہوئی مشینوں کے ڈھانچے سب ابھر آئے تھے۔

اور اسی ایک جھیل پر کیا منحصر ہے۔ ہر مصنوعی جھیل کا پانی اسی طرح سوکھ رہا تھا کیوں کہ یہ جھیلیں قدرتی نہیں تھیں، دریاؤں پر بند باندھ کر بنائی گئی تھیں تاکہ دور کی بنجر زمینوں کو سیراب کرسکیں۔ جس وقت یہ جھیلیں لبالب بھرے پیالے کی طرح تھیں تو پہاڑ اپنا عکس ان میں دیکھتے تھے اور ان پر اُگا ہوا سبزہ اس جھیل کو انگوٹھی میں جڑا زمرد بنا دیتا تھا۔ نیلے آسمان کے سائے میں ٹھنڈی ہوا ہلکورے لیتی تھی اور اس کے سامنے جھیل میں ننھی ننھی لہریں اٹھتی تھیں۔ دور سے آنے والے سیاح اس کھوئے ہوئے گاؤں کی تلاش کرتے تھے

Marfat.com

جس کے بارے میں جھیل میں ڈوب جانے کی خبر پڑھی یا سنی تھی مگر اس وقت ڈوبے گاؤں کا کوئی نشان نظر نہیں آتا تھا۔ ان سیاحوں کے ساتھ کوئی مقامی راہبر ہوتا تو بتاتا کہ کسی دن جب پانی حد سے زیادہ ساکن ہو تو گاؤں کی ڈوبی ہوئی مسجد کا ایک مینار دکھائی دیتا ہے مگر اب جھیل خشک ہونے پر تو مسجد کے میناروں کا ملبہ اور مسجد کا گنبد جو اب تک ثابت تھا انڈے کے الٹے رکھے ہوئے چھلکے کی طرح رکھا صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ کچے پکے مکانوں کی آدھی پون دیواریں بھی نظر آ رہی تھیں اور یہ گاؤں عجب عبرت انگیز نقشہ پیش کر رہا تھا۔ دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ان گھروں میں کام کرنے والی عورتیں، ان کھیتوں میں ہل چلاتے مرد اور گلیوں میں کھیلتے بچے بھی اس میں غرق ہو چکے ہیں۔

جب یہ جھیلیں بھری ہوئی تھیں اس وقت مختلف اوقات میں مختلف تعداد میں ڈیم کے دروازے کھولے جاتے تھے اور ان دروازوں سے پھسلتا، بپھرتا پانی شروع میں بادلوں کی سی گرج کے ساتھ نیچے گرتا، پھر اسی گرنے کے بل پر کالی گھٹا کی طرح، دھویں کی طرح اور سیاہ سرنگ سا بن کر اٹھتا اور خوب اوپر جا کر ہنستے، ناچتے کودتے بچے کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اس وقت اس کا رنگ اجلا سفید ہو جاتا، بالکل سچے موتیوں کی طرح۔ دھوم دھڑکے سے نہر کے دہانے پر گرتا اور اپنے اندر کے جوش کو دھیرے دھیرے دباتا نہر میں نکلا چلا جاتا۔ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا کسی دانی بوڑھے کی طرح سبھاؤ میں دھیرج آتی جاتی، ذرا اور آگے نکل کر اپنے پاؤں قطعی ڈھیلے چھوڑ دیتا جس جگہ جاتا ویسا ہی رنگ، ویسی ہی شکل، ویسی ہی سج دھج اختیار کر لیتا۔ اُس وقت ان نہروں کا منبع یہ جھیل تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ پانی ایک دن سوکھ بھی سکتا ہے۔

مگر اب یوں ہوا تھا کہ جھیل کا منبع سوکھ گیا تھا۔ جس منبعے سے دریا نکلتا تھا، وہاں برف جمی کی جمی رہ گئی تھی۔ اس کو پگھلنے کی تحریک نہیں ملتی تھی کہ پانی بنے اور اپنے سفر پر رواں ہو۔ اگر کبھی تھوڑی سی برف پگھلتی تو راہ میں پڑے گلیشیر اسے گھونٹ گھونٹ جاتے۔ پیالہ لبریز نہ ہو تو چھلکے گا کیسے؟ تشنہ لب زمینیں کیسے سیراب ہوں گی؟ زمین کو کھانے پینے کو نہ ملا تو وہ اپنے بچوں کو کیا دے گی۔ وہی ماں دودھ پلا سکتی ہے جس کی

چھاتی میں دودھ اترتا ہے۔ جب ماں خود ہی بھوکی ہو تو بچے کا پیٹ کیسے بھرے۔

تو پھر کیا ہو...!؟ ساری جھیلیں خشک ہوگئیں، ساری زمینیں پیاسی رہ گئیں تو انسان دانے دانے کو ترس جائیں گے، جانور بھوکے مر جائیں گے، ابھی وقت ہے، کچھ کرلیں... کیا کرلیں؟... منبع کو کسی طرح اتنی گرمی پہنچائیں کہ وہ پگھلے، دریا چلے، جھیل میں پانی بھرے، دروازوں سے پانی گرے، زمینیں سیراب ہوں۔

گرمی کیسے پہنچائیں، ناممکن!

تو پھر پہلے کی طرح کنویں کھودنا شروع کریں۔ آج کی زمین پیاسی سہی لیکن نیچے کی دھرتی نے تو صدیوں کا پانی پی رکھا ہے۔ بیس تیس ہاتھ پر نہیں تو سو پچاس ہاتھ پر پانی ضرور ملے گا۔ کنویں کی تہ میں تارہ سا پانی، ٹھنڈا اور میٹھا، تھوڑی تھوڑی دور پر کھودے گئے یہ کنویں کھیتوں کو سیراب کریں گے۔ ان کے کنارے سایہ دار درخت ہوں گے جن پر چڑیاں چہچہاتی ہوں گی۔ آس پاس پھونس کے چھپر ہوں گے، جانور، مرغیاں اور بچے ہوں گے۔

ہزاروں سال پہلے یہ کنویں ہی تو تھے جنھوں نے اس زمین کو جنت نشاں بنایا تھا۔ دھوپ میں دمکتی، سنہری خوشوں پر بیٹھی چڑیاں باہر سے آنے والوں کو سونے کی چڑیاں نظر آتی تھیں... یہ بھی تو دیکھیے کہ کسی کنویں میں کوئی گاؤں غرقاب نہیں ہوا، کوئی مسجد، کوئی مزار، کوئی کلیسا اس کی خوراک نہیں بنا۔ کنویں میں سیلاب نہیں آتا۔ جب جھانکو ہزار رنگ پانی پُراسراریت سے ہلتا جلتا دکھائی دیتا ہے۔ جب بھی نکالو ٹھنڈا اور میٹھا۔ نہ وہ بجلی گھر سے نکل کر آتا ہے، نہ دھوپ کی تمازت سے تمتماتا ہے۔ سیدھا سبھاؤ چرخی سے اوپر آتا ہے۔ ٹین سے چھلکتا پانی واپس اپنے منبع میں گرتا ہے۔ چھن چھن، ٹناٹن ٹناٹن۔ چھلکتے پانی، چرخی اور ٹین کے ٹکرانے کی ملی جلی راگنی جیسے کئی ساز ایک ساتھ بج رہے ہوں یا کوئی سچا فن کار مٹی کے پیالوں میں بھرے پانی میں چھپی راگنیوں سے جل ترنگ بجا رہا ہو۔

پرندے پکی نالی کے کنارے بیٹھے ٹھنڈے میٹھے پانی کا انتظار کرتے ہیں۔ چونچ آسمان کی طرف کرکے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے پانی پیتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں، ان

Marfat.com

کھیتوں کی طرف جہاں خوشے لدے ہوں۔ جھولتی شاخوں پر جھولتے خوشوں سے چن کر دانے کھاتے ہیں تو دور سے دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ سونے کی چڑیاں، سونے کے خوشوں سے سونے کے دانے نکال رہی ہیں۔ ایک جگہ سے چند دانے کھا کر دو چڑیاں کسی اور جھنڈ کی راہ لیتی ہیں جہاں ایک اور کنواں ہوتا ہے جس کے کنارے لگے درختوں کی چھاؤں میں سادہ لوح دیہاتی بیٹھے سادہ سادہ سی باتیں کرتے ہیں جن میں سوکھی جھیلوں اور ڈوبے گاؤں کا تذکرہ نہیں ہوتا۔ ہاں کبھی کبھی کسی گزرے ہوئے قحط کی باتیں ضرور کرتے ہیں جب ان کے کھیت اور گایوں کی چھاتیاں سوکھ گئی تھیں۔ ان کے پرکھے آنے والے قحطوں کے خواب دُبلی ہوتی گایوں اور خشک تھنوں میں دیکھ لیتے تھے۔ جس طرح ان کی زندگی سادہ تھی، ان کے خواب بھی سیدھے سادے تھے۔

قحط کی وجہ سے نقلِ مکانی بھی کرتے تو پھر نئے کنویں کھود لیتے۔ بیس تیس ہاتھ پر نہیں تو سو پچاس ہاتھ پر پانی نکل آتا جو کنویں کی تہ میں تارہ کی طرح چمک رہا ہوتا اور طرح طرح کے رنگ دکھا رہا ہوتا۔ ان کے لیے کوئی ایسا منبع نہ تھا جو جم گیا ہو۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ پانی ہو یا دانہ ان کو اپنی ہی زمین سے ملے گا، خواہ وہ دو ہاتھ پر ہو یا دو سو ہاتھ پر۔

ایک کنواں سوکھ جائے تو دوسرا کنواں کھودا جاسکتا ہے۔ جھیل سوکھ جائے تو آدمی منبعے کی طرف دیکھتا رہ جاتا ہے۔ اتنی دیر میں قحط کا عفریت گردن پر آن بیٹھا ہے۔ بڑے منبعے، بڑے جھیلوں کے بخشے ہوئے قحط بھی بڑے ہوتے ہیں۔ جن راحتوں کے منبعے بڑے اور دور ہوں، ان کی تکلیفوں اور عذابوں کے ثمر بھی سمندروں کی طرح ہوتے ہیں۔

Marfat.com

میں کون؟

کسی دھماکے سے اچانک آنکھ کھلی۔ میں پریشان ہوگیا۔ پہلا خیال یہی آیا کہ یہ کیسا دھماکا تھا۔ دنیا میں طرح طرح کے دھماکے ہو رہے ہیں۔ ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۰ء کا دھماکا جس نے بہ قول امریکنوں کے دنیا کو بدل کے رکھ دیا تھا۔ پھر افغانستان کے پہاڑوں اور غاروں میں ہونے والے دھماکے، خلا میں سفر کرنے والی گاڑی کا دھماکا، ہوائی جہازوں کے حادثوں کے دھماکے اور اپنے شہر میں آئے دن پھٹنے والے بموں کے دھماکے تو ہیں ہی۔

چھت پر قدموں کے دھماکوں اور شوروشر سے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی خطرناک دھماکے نہیں شاید بسنت کا ہنگامہ ہے۔ آج کل بہار اور بسنت کی آمد بھی گیتوں، جھولوں اور پکوانوں سے نہیں دھماکوں سے منائی جاتی ہے۔ شاید لوگ خوشی میں ہوائی فائر کر رہے ہیں یا شاید عید کا چاند نظر آ گیا ہے اس کی خوشی میں بندوقیں داغی جا رہی ہیں مگر پھر شبہے نے گھیر لیا۔ ہوسکتا ہے فائرنگ ہی ہو۔

کمرے کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ روشنی کی رمق بھی نہیں تھی۔ عادت یہ پڑ گئی تھی کہ دن میں سوؤں یا رات کو موٹے گہرے رنگ کے پردے کھینچ کر سوتا تھا۔ خدا معلوم دن ہے یا رات۔ دھماکوں کے لیے رات دن کی قید نہیں رہی۔ سر کا بھاری پن بتا رہا

Marfat.com

تھا کہ شراب کے خمار کا وقت ہے۔ شراب کسی وقت بھی پیو اس کا خمار تو ہوتا ہی ہے۔ تو میں نے شراب کب پی تھی، کس کے ساتھ پی تھی... کسی ساتھی کا نام یاد نہ آیا تو سوچا، اپنا نام یاد آجائے تو دوسرے نام بھی یاد آجائیں گے مگر... جتنا ذہن پر زور دیتا تھا، اپنا نام بھی دور ہوتا چلا جاتا تھا۔ بہت غور کرنے پر بھی اپنا نام یاد نہ آیا تو میں بدحواس سا ہوگیا... آخر میں کون ہوں؟...

اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اپنے لباس کو دیکھا، بستر پر نظر ڈالی۔ کوئی اشارہ، کوئی کلید نہیں ملی۔ اٹھ کر میز تک گیا۔ وہاں بے شمار کاغذات پھیلے ہوئے تھے، رسالے بکھرے ہوئے تھے اور کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ رسالوں میں مختلف نام تھے، کتابوں پر ان کے لکھنے والوں کے نام تھے مگر کاغذات پر کوئی نام نہ تھا۔

دماغ پر زور دیا، آخر میں کوئی تو ہوں گا!

''ضرور ہو گے، مگر بتاؤ کون ہو؟'' دماغ بجائے معاملہ سلجھانے کے اسے اور الجھا رہا تھا۔ شراب کے خمار نے مزہ کرکرا کر رکھا تھا۔ اس پر یہ الجھن کہ میں کون ہوں؟

اٹھ کر پردے کھولے، دن تھا۔ آسمان کو دیکھا، ہلکے نیلے آسمان پر سفید بادلوں کے بیچ چیلیں اور پتنگیں اڑ رہی تھیں مگر آسمان کی چیلوں اور پتنگوں نے، درختوں نے، چڑیوں اور سفید بادلوں میں سے کسی نے نہیں بتایا کہ میں کون ہوں۔

گھبرا کر لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا، تیز روشنی آنکھوں کو بری لگی۔ پھر بھی میں باورچی خانے تک گیا، شاید کوئی پتا نشان ملے۔ چند رسالے وہاں بھی بکھرے ہوئے تھے۔ تازہ اخبار لپٹا ہوا پڑا تھا۔ میرے علاوہ گھر میں صرف ایک نوکر ہوتا تھا، اس وقت وہ بھی گھر میں نہیں تھا۔ اگر ہوتا بھی تو میں اس سے کیا پوچھتا۔ بتا میرا نام کیا ہے، میں کون ہوں؟... وہ ہنستا اور سارے محلے میں پھونک دیتا۔

یکایک ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی... واہ کیا وقت پر بجی ہے، اب فون کرنے والا تو میرا نام لے گا ہی... جلدی سے فون اٹھایا۔

''کون صاحب بول رہے ہیں؟'' سوال ہوا۔

Marfat.com

''آپ کو کن صاحب سے بات کرنی ہے؟''

''پہلے آپ بتاؤ کہ آپ کون ہو؟''

''پہلے آپ بتائیے کہ آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''

''شیطان سے۔'' جواب ملا اور فون بند ہوگیا۔

یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ کیوں نہ میں خود کسی کو فون کروں۔ شاید کوئی میری آواز پہچان کر میرا نام لے اور یادداشت میں سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔ فون کرنے بیٹھا تو کوئی نمبر یاد آیا نہ کسی کا نام۔

یوں ہی ایک نمبر گھمادیا۔ ''ہیلو۔''

''آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟'' ایک عورت نے پوچھا۔

''آپ سے۔'' میرے منہ سے نکل گیا۔

''دُر پھٹے منہ... اور کوئی کام نہیں تھا؟'' اور فون بند ہوگیا۔

الجھن بڑھنے لگی۔ آخر میری فون کی نوٹ بک کہاں گئی؟ کسی چاہنے والے کو فون کروں تو شاید مسئلہ حل ہوجائے۔ فون کی نوٹ بک ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا مگر وہ ملی نہیں۔ آخر شک میں پڑ گیا کہ وہ تھی بھی یا نہیں...!

یکا یک خیال آیا۔ غسل خانے میں جا کر اپنی شکل دیکھوں گا تو یقیناً، یاد آجائے گا کہ میں کون ہوں؟ پرامید ہوکر غسل خانے میں گیا۔ آئینے پر نظر ڈالی۔ کوئی عجیب سی شخصیت سوجی آنکھوں، لال لال دیدوں والی نظر آئی جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ میں اس شخص کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ شاید کبھی دیکھا ہو مگر پہچان میں ذرا بھی نہیں آرہا تھا۔ یہ میں نہیں ہوسکتا۔ اگر میں ہوں تو میری اصل صورت نہیں ہے۔ اگر میں اپنی جون میں ہوتا تو خود کو ضرور پہچان لیتا۔ مایوسی بھی اطمینان بخش تھی کہ چلو غنیمت ہے کہ یہ بندر شکل میری اصل صورت نہیں ہے۔ مگر وہ سوال اپنی جگہ موجود تھا کہ میں کون ہوں؟

گھر سے باہر نکل کر دیکھوں شاید کوئی پہچان لے۔ جوتوں کو غور سے دیکھا۔ اپنے جوتے، اپنے کپڑے، اپنی چیزیں ہی تو اپنی پہچان ہوتی ہیں مگر آج نہ لباس، نہ

Marfat.com

جوتے، نہ اپنی چیزیں، کوئی میری پہچان نہیں تھی۔ سخت پریشانی کا سامنا تھا۔ باہر نکلا... دور دور تک گلی میں کوئی نہیں تھا... پھر ایک بچہ ''سلام چاچا جی'' کہتا ہوا گزر گیا۔

مگر میں فقط چاچا جی تو نہیں ہوسکتا۔

ایک سائیکل والا ''سلام صاحب'' کہتا ہوا چلا گیا۔

صاحب! کیا معنی... یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔

ایک عورت گلی میں گزرتی نظر آئی۔

''ذرا بات سنیے۔'' میں پکارا۔

وہ ٹھٹکی... ''جی!'' وہ خوش نہیں تھی۔

''آپ مجھے جانتی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...'' اور بھی ناخوش دکھائی دی۔

''بھلا بتائیے میں کون ہوں؟''

''آپ ایک شرابی کبابی، ہمارے بچوں کے لیے بہت بری مثال ہیں... آپ چاہتے تھے کہ میں کہوں کہ آپ بڑے مصنف ہیں اور آپ پھولے نہ سمائیں مگر جی میں کہتی ہوں کہ جو اچھا آدمی نہیں وہ کچھ بھی نہیں، ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ اس محلے سے دفع ہوجائیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم رکھتی آگے بڑھ گئی۔ یہ کون تھی... یہ بھی یاد نہ آیا۔ محلے میں رہتی ہے، مجھے مصنف کی حیثیت سے جانتی ہے، اب شاید خود کو پہچاننا آسان ہو۔

واپس گھر میں آیا۔ میز پر جو کتابیں تھیں، ان میں چھپی ہوئی تصویروں سے اپنی شکل پہچاننے کی کوشش کرتا رہا۔ ممکن ہے میں وہی ہوں جو آئینے میں نظر آیا تھا۔ ایک ایک کتاب اٹھا کر دیکھی۔ ساری تصویریں نہایت خوش وضع لوگوں کی تھیں۔ کوئی تصویر کسی داڑھی بڑھے ہوئے لال لال دیدوں والے شخص کی نہیں تھی۔

اب ایک اور خیال سوجھا۔ چلو جتنے نام بھی یاد آتے ہیں، ان کو دُہراتا ہوں شاید کسی نام پر دماغ میں گھنٹا بجے، الف سے شروع کرتا ہوں۔ آثم، اویس، اللہ دتہ... نام لیتے لیتے بستر پر لیٹ گیا اور غافل سو گیا... دوبارہ اٹھا تو شراب اور نیند کا خمار اتر چکا تھا اور

Marfat.com

مجھے یاد آ گیا کہ میں کون ہوں؟ میں نے سوچا، آج ہی اپنے مکان پر نام کی تختی لگا لیتا ہوں۔ اگر آئندہ ایسی آفت پڑی تو باہر جا کر نام پڑھ لیا کروں گا۔ مگر کیا نام پتے سے مجھے پتا چل جائے گا کہ میں کون ہوں؟ میں پھر تذبذب میں پڑ گیا۔ یقین سے تو اب بھی نہیں کہہ سکتا کہ میرا نام کیا ہے اور میں کون ہوں؟ کوئی چیز، کوئی آدمی ایسا نہیں جو میری تصدیق کرے۔ جب آدمی خود اپنی تصدیق نہ کر سکے تو اور کون کر سکتا ہے!؟

Marfat.com

افسانچے

اعمال نامہ

(۱)

ایک آدمی نے آخرت میں اللہ میاں کے حضور کہا:

''میں نے پچّیس برس تک علم حاصل کیا۔ پچاس سال کی عمر تک اس پر عمل کرنے کی کوشش کی مگر آخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ علم قابلِ ستائش نہیں تھا۔ مزید پچّیس برس اس علم کو بھلانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اس میں بھی ناکام رہا تو مجبوراً یہاں چلا آیا...!''

(۲)

ایک عورت نے اللہ میاں سے کہا:

''میں بیس سال اپنے باپ کی حکومت سہتی رہی۔ پچاس سال کی عمر تک شوہر کی اطاعت کی۔ مزید پچّیس سال بیٹے کے کہے میں رہی۔ آپ نے بہت اچھا کیا مجھے اپنے پاس بلالیا... کہیے، کیا حکم ہے؟''

شیشہ اور ہیرا

ایک شیشے کا ٹکڑا اور ایک ہیرا ایک غیر آباد ریگستان میں پاس پاس پڑے تھے۔ شیشے کے ٹکڑے نے طنزاً ہیرے سے کہا، ''اے جوہرِ بے بہا! اب تم میں اور مجھ میں کیا

Marfat.com

فرق ہے؟ تم ریت میں دبے ہو، میں بھی ریت میں دبا ہوں۔ مجھ پر بھی ریت کی تہیں چڑھ رہی ہیں، تم پر بھی چڑھ رہی ہیں۔''

ہیرے نے جواب دیا،'' تم میں اور مجھ میں اب بھی وہی فرق ہے جو ہیرے اور شیشے کے ٹکڑے میں ہوتا ہے۔ جب بھی مجھے کوئی دیکھے گا، اٹھا لے گا، تمھیں چھوڑ دے گا۔''

شیشے کے ٹکڑے نے کہا،''کس ہوا میں ہو، کوئی جوہری اب تمھیں پا نہیں سکتا، جو دب گیا سو دب گیا۔ وقت کی ریت تلے میں اور تم برابر ہیں۔''

ہیرے نے کہا،''ایسا نہیں ہوتا، دبے خزانے کبھی نہ کبھی نکالے جاتے ہیں۔''

''وہ وقت جانے کتنی صدیوں بعد آئے۔'' شیشے نے کہا۔

''ہاں یہ ہوسکتا ہے...'' ہیرے نے جواب دیا،''مگر جب وہ وقت آئے گا تب بھی تم شیشے کا ٹکڑا ہو گے اور میں اس وقت بھی ہیرا ہی ہوں گا۔''

جین☆ کی مجبوری

(۱)

نیم کی نمکولی سے ایک پودا پھوٹا اور بڑھتا رہا۔ پاس ہی آم کا ایک درخت تھا۔ نیم کو شوق ہوا کہ وہ بھی آم جیسے بڑے بڑے اور میٹھے پھل دے۔ اس نے بہت زور لگایا مگر اس کے پھل نمکولی ہی رہے۔

بچے آتے، آم کے درخت پر چڑھتے یا پتھر مارتے، آم جھولی میں بھرتے اور بھاگ لیتے۔ ایک آدھ بچہ نمکولی بھی اٹھا کر منہ میں رکھ لیتا۔ پھر تھوتھو کر کے گٹھلی منہ سے پھینک دیتا اور بھاگ لیتا۔

نیم کا درخت اندر ہی اندر کڑوا ہونے لگا کہ وہ بڑھتا ہے مگر اس کی نمکولی نہیں بڑھتی، آم نہیں بنتی۔ وہ اپنے سائے میں بیٹھنے والوں سے یہ سوال کرتا مگر کوئی اسے خاطر خواہ جواب نہ دیتا۔ کچھ ہنس دیتے، کچھ مسکرا کر ٹال جاتے، کچھ سنی ان سنی کر جاتے۔ ایک

☆ Gane۔

Marfat.com

دن ایک حکیم صاحب کا اُدھر سے گزر ہوا۔ نیم نے ان کے سامنے بھی رونا رویا۔ اُنھوں نے فرمایا، ''میاں نیم، آم کیا کھا کے تمھارا مقابلہ کرے گا۔ تم جڑ سے لے کر پات تک، تلگوں سے لے کر چھال تک مجسم دوا ہو، شفا ہو۔ تمھاری تو ہوا اور سایہ بھی اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ سنا نہیں دو مسافر جا رہے تھے۔ ایک نیم کے سائے میں بیٹھتا، سوتا، چلا جاتا، دوسرا کیکر کی چھاؤں میں۔ منزل تک پہنچتے پہنچتے کیکر کے سائے میں سونے والا اَدھ موا ہو گیا مگر نیم کی چھاؤں میں بیٹھنے والا مسافر ہٹا کٹا رہا۔''

نیم نے کہا، ''میں آم بننا چاہ رہا تھا، آپ نے کیکر کی کہانی سنا دی، بس یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ میں آم کیوں نہیں بن سکتا؟''

''مشیتِ ایزدی...'' حکیم نے کہا اور دامن جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پاس کے درخت سے دو چار پکے آم توڑے اور جھولی میں بھر کر چلتا بنا... نیم کا درخت کچھ اور کڑوا ہو گیا۔

(۲)

دو چوہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خوب کوشش کر کے ہاتھی بن کر دکھائیں گے۔ وہ روز جاگنگ کرتے، خوب ورزش کرتے، بہت سا کھانا کھاتے مگر ہر روز وہ چڑیا گھر جا کر ہاتھی کو دیکھتے تو کہتے کہ ہم تو اب تک بہت چھوٹے ہیں۔ پھر جاگنگ کرنے لگتے، پھر ورزش کرنے لگتے، پھر بہت سا کھانا کھاتے مگر وہی چوہے کے چوہے۔

آخر ایک دن ایک سیانے کے پاس گئے۔ اس نے کہا، ''خالی خولی کوشش سے کچھ نہیں ہونے کا، دعا بھی مانگو...''

تب وہ اپنے بنانے والے سے گڑگڑا کر دعا مانگتے کہ وہ انھیں ہاتھی بنا دے۔ ہوتے ہوتے بوڑھے ہو گئے۔ قویٰ جواب دینے لگے۔

جب ایک چوہا قریب المرگ ہوا تو اس نے ساتھی سے پوچھا، ''دوست، کیا ہم نے کوشش میں کمی کی؟''

''نہیں...'' دوسرے نے کہا۔

''کیا ہم نے دعاؤں میں کسر کی؟''

''نہیں...'' دوسرے نے کہا۔

''پھر کیا وجہ ہے کہ ہم ہاتھی نہ بن سکے؟''

''مشیتِ ایزدی۔''

یہ جواب سن کر پہلے چوہے نے جان جانِ آفریں کے سپرد کردی۔

تکرار

ایک چوہا رات کو چوہے دان میں پھنسا۔ پھنسنے کے بعد بھی مزے سے دو گھنٹے تک کٹر کٹر روٹی کھاتا رہا۔ صبح دیکھا تو چوہا چوہے دان میں نہیں تھا۔ اور جس سلائی میں روٹی پھنسی ہوئی تھی وہ سرکی ہوئی تھی۔ لوگ حیران تھے کہ پٹ بند ہے، چوہا کہاں گیا؟

''سلائی سرکی ہوئی ہے، میرا خیال ہے، چوہا اس جگہ سے نکل کر بھاگ گیا۔'' ایک شخص نے کہا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' دوسرے نے کہا، '' اتنی چھوٹی سی جگہ سے چوہا نکل نہیں سکتا۔''

''تو پھر کہاں سے بھاگا؟ دروازہ تو بند ہے۔'' پہلے نے پوچھا۔

''یہ میں نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ سلائیوں کے درمیان سے نہیں بھاگ سکتا۔''

''تو تم بتاؤ، وہ کس طرح بھاگا۔ چوہا چوہے دان میں نہیں ہے اور سلائیوں کے درمیان سے نکلا نہیں تو آخر گیا کہاں؟''

''یہ میں نہیں جانتا مگر مجھے یقین ہے کہ وہ سلائیوں کے بیچ میں سے نہیں نکل سکتا۔''

پہلے آدمی نے اپنا سر پیٹ لیا، بال نوچ لیے، گریباں چاک کرلیا۔ وہ دیوانہ ہو چکا تھا۔

Marfat.com

مور کا پر

''میں چاہتی ہوں میرے فن میں مور کے پر کی سی خوبی اور خوب صورتی ہو۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ مور کا پر میرے نزدیک دنیا کی خوب صورت ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''ایسے کہ مور کا ہر پر ایک مکمل اکائی ہے۔ اس کے نقش، اس کے رنگ ہر پر میں تکمیل کو پہنچے ہوئے ہیں۔ ایسے رنگ جو رنگوں سے ماورا ہیں۔ ایسا وزن جو وزن سے ماورا ہے۔ بڑے آرٹسٹ کی ایک اسٹروک کو الگ کرو تو ساری تصویر کا حسن اس میں موجود نہیں ہوتا مگر مور کے ہر پر اور اس کی ہر کاہ میں رنگوں کے ہلکے گہرے شیڈ، دھوپ میں اس کی چمک، اس کی بے وزنی اور ساری خوب صورتی موجود ہوتی ہے۔ پھر سارے پر مل کر مور کی دُم بناتے ہیں جس کا کُل اس کے اجزا کی جمع سے بہت زیادہ ہوتا ہے اور جب وہ دُم پھیلا کر ناچتا ہے تو اس کا حسن دُم کے پروں کے کُل سے کئی ہزار گنا بڑھ جاتا ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ میرے فن میں مور کے پر کی سی خوبی اور خوب صورتی ہو۔''

تاج محل

تاج کے صدر دروازے کا پتھر سرخ ہے۔ اس صدر دروازے سے داخل ہو کر دوسری طرف نکلے تو پرے کا پورا تاج سامنے تھا۔ سنگِ مرمر کا تاج محل اتنے فاصلے سے یک دم جو سامنے آیا تو لگا جیسے ہاتھی دانت کا بنا ہوا ہے، بے حد نفیس کاری گری کا آرائشی شاہ کار۔

لمحے بھر کو خیال آیا کہ چاروں مینار عمارت کے مقابلے میں قدرے چھوٹے

Marfat.com

ہیں۔ تخیل نے ذرا سا طویل کیا تو بے ڈول لگے، ذرا چھوٹا کیا تو محسوس ہوا جیسے تاج بھی آپ سے ملنے بڑھا چلا آ رہا ہو۔ پھر حدِ ادب ... پیچھے کے دو مینار چھپ گئے تو یوں لگا جیسے کوئی کہہ رہا ہو... You are too close

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا مجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

مگر ہم اور آگے بڑھے۔ اپنی آغوش میں چھپا کر تاج نے ہمیں سنگِ مرمر کی سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچا دیا۔ یہاں تاج کے چاروں پہلو یکساں سے ہیں مگر پھر بھی یکساں نہیں ہیں۔ سامنے سامنا ہے، پیچھے پچھایا ہے۔ اس پلیٹ فارم سے دیکھو تو دو چیزیں تاج کے حسن میں اضافہ کرتی ہیں۔ ایک جمنا کا پس منظر، دوسرے...

تاج محل اگر یہاں نہ ہوتا اور یوں نہ ہوتا تو دنیا کے پردے پر یکتائے روزگار نہ ہوتا۔ میرا ایقان ہے کہ آرٹ کے شاہ کار بنائے نہیں جاتے، بن جاتے ہیں۔ یوں تو ایک بڑا فن کار ہر فن پارے کو شاہ کار بنانا چاہتا ہے مگر جب اس کی کاوش میں کچھ اور چیزیں غیر شعوری طور پر شامل ہو جاتی ہیں تب شاہ کار وجود میں آتا ہے۔

شاہ کی محبت کے ساتھ آرٹسٹ کا وجدان، بنانے والے کی ہنرمندی اور وہ مقام کہ جہاں تاج ہے... جب تاج محل نظر آتا ہے تو زمین سے آسمان تک تاج ہی تاج ہوتا ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عمارتیں جو اطراف میں ہیں، جمنا جو پس منظر میں ہے، آسمان کی نیلاہٹ، بادلوں کی سفیدی، سورج کا طلوع وغروب، چاند کے مختلف روپ، شفق کے رنگ سب اس موتی کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ نئے نئے رنگ اور روپ دیتے ہیں۔ ہر رنگ اور ہر روپ الگ ایک شاہ کار ہے۔

اندر داخل ہوئے تو رہبر نے شاہ اور ملکہ کی قبریں دکھائیں۔ کٹہرے کے اندر ممتاز محل کی قبر بیچوں بیچ ہے، شہنشاہ پہلو میں ہے۔ رہبر نے قبروں اور کٹہرے پر کیے ہوئے کندہ کاری کے کام پر ٹارچ کی روشنی پھیری تو وہ یوں چمکے جیسے پہاڑوں پر خزاں سے رنگیں جنگلوں پر سورج کی کرن پڑے تو وہ دمک اٹھتے ہیں۔

Marfat.com

پھر اس نے پپیہے کی سی ہوک بھری آواز نکالی اور سارا تاج اس کی گونج سے سسکنے لگا۔

نیچے اصل قبروں کو دیکھنے اترے تو گرمی اور حبس سے سارا سنگِ مرمر پسیج رہا تھا۔ اس ڈر سے زینے کے سنگِ مرمر پر ہاتھ نہ دھرا کہ موم کی طرح ہاتھ کے زور سے دب نہ جائے۔

ممتاز محل نے دہائی دی، ''دیکھو میں گھٹن میں پسینے پسینے ہو رہی ہوں۔''

میں نے کہا، ''عزیزہ، چپکی پڑی رہو۔ اپنی ذات کا بھرم رکھو۔ دیکھ نہیں رہی ہو ساری دنیا تم پر رشک کھا کھا کر مری جا رہی ہے۔ ایک شخص نے تم سے عشق کیا اور دنیا کو تاج محل دیا جو محبت کا سمبل بنا۔ آخر جب محلوں میں رہتی تھیں اور صرف بچے جنتی تھیں تب کیا گھٹن اور دردوں سے پسینے پسینے نہ تھیں۔ عورت کا مقدر یہی ہے۔ مرد اپنے پسینے کی کمائی کھاتا ہے۔ عورت ماحول کی گھٹن کے پسینے میں جیتی مرتی ہے۔'' بس اتنی ہی باتیں ہوئی۔ حق یہ ہے کہ حبس اور گھٹن بے پناہ اور ناقابلِ برداشت تھی۔ کوئی دریچہ یا روشن دان نہ تھا صرف ایک زینہ تھا جس پر آنے جانے والے لوگوں کی سانسوں نے سانس لینا دشوار کر رکھا تھا... میں الٹے قدموں باہر آئی۔

باہر نکل کر دیکھا کہ تاج نے محبت کا بھرم بڑی خوب صورتی سے رکھا ہے۔ کئی جوڑے ہاتھ میں ہاتھ دیے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔ ایک امریکن جوڑا ایک دوسرے کی محبت میں سرشار، تاج کے حسن میں مخمور اونچے چبوترے پر چڑھا دنیا بھر سے بیگانہ بیٹھا تھا۔

دل بھر کر چاروں طرف گھومنے پھرنے کے بعد ہم نیچے آئے۔ تاج کا عکس پانی میں دیکھا۔ پورے کا پورا تاج پانی کے اندر ثابت و سالم اور خوب صورت، ان ماڈلوں سے کہیں بہتر جو سنگِ مرمر میں یا مونگے موتیوں میں یا دھاتوں میں بنائے جاتے ہیں۔ اور ماڈل بھی دیکھے ہیں، الحمرا کا ماڈل اصل الحمرا سے زیادہ خوب صورت ہے کہ چھوٹا اور پیارا ہے۔ مسجدِ قرطبہ کا ماڈل آج کی مسجد کے مقابلے میں بہت دل آویز ہے کہ قدیم عہد کی

Marfat.com

جیتی جاگتی سجی سجائی مسجد کا ماڈل ہے لیکن تاج کے ہزاروں ماڈلوں میں سے کوئی ایک بھی اصل سے زیادہ دل کش تو کیا اصل کے نزدیک بھی نہیں ہے اور تو اور کوئی تصویر اصل سے لگا نہیں کھاتی۔ لگتا ہے وہ کیمرا ابھی نہیں بنا جو تاج کے ''کُل'' کی عکاسی کر سکے۔

تاج کی حاضری سے لوٹے تو الٹے قدموں، ہم ہی نہیں، سب کے سب، جس سرخ دروازے سے داخل ہوتے ہیں، اس سے باہر نکلتے ہی تاج خواب کی طرح غائب ہو جاتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ دیر نگاہوں میں بسائے رکھنے کے لیے الٹا چلنا پڑتا ہے۔ شاہوں، فقیروں کے دربار کی رسم ہے مگر یہاں حسن کا خراج ہے جو بے مانگے ملتا ہے۔

یوں نہ ہوتا تو آج تاج کو یوں نہ جانا جاتا...

سوچ کا پھیر

اگر تمھیں پیسوں کے ڈھیر سے ایک پیسا اٹھانے کو کہا جائے تو کون سا پیسا اٹھاؤ گے؟ بھائی، سارے پیسوں کی قیمت تو برابر ہوتی ہے پھر بھی میں اس ڈھیر سے سب سے چمکتا دمکتا پیسا اٹھاؤں گا۔ چیز کی قدر و قیمت اپنی جگہ مگر صورت شکل، چمک دمک کا اپنا ایک مقام ہے اور پھر انتخاب کا حق ملے تو کچھ فائدہ تو اٹھانا چاہیے۔

اور تم؟

بس وہ پیسا اٹھا لوں گا جو سب سے نزدیک ہو چاہے زنگ کھایا ہو، قیمت برابر ہو تو تکلیف اٹھانے کا فائدہ کیا!

اور تم؟

بھئی میں تو ایک پیسے کے لیے اپنا وقت کھوٹا نہ کروں گا۔ میرے حصے کا کوئی بھی اٹھا لو، پیسا ہی تو ہے۔

اور تم؟

میں پہلے یہ پوچھوں گا کہ اس پیسے کا ڈھیر لگانے والا کون ہے؟ اس کا مقصد کیا

Marfat.com

ہے؟ کوئی کھیل ہے، پھندا ہے یا محض تضیعِ اوقات۔

اور تم؟

پیسے نوادرات میں سے ہیں تو قدیم ترین سکہ، نئے ہیں تو کورے پنڈے کا تازہ ترین۔

اور تم؟

کسی کنجوس مکھی چوس کا پیسا ہے تو کچھ بھی نہ لوں گا۔ ہاں اگر سخی کا ہو تو شاید...

اور تم؟

پہلے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگوں گا کہ بابرکت پیسا ہاتھ آئے۔ قسمت والا پیسا ہو تو ایک پیسے سے کروڑوں روپے بن جاتے ہیں۔ پیسے کا کھیل قسمت کا کھیل ہے بھائی۔ کیا معلوم اپنی قسمت اسی پیسے میں چھپی بیٹھی ہو۔

اور تم؟

میں ڈھیری لگانے والے کو پستول دکھا کر سارے پیسے لے لوں گا، دیکھوں میرا کیا کرلے گا...!؟

بہادر اور بزدل

بہادر آدمی کس سے ڈرتا ہے؟

بزدل سے، جو پیٹھ کے پیچھے سے وار کرتا ہے۔

بچپن

بچپنا اور ذہن کی ناپختگی توازن کے فقدان کا نام ہے۔ بچوں کے ذہن کا آئینہ حقیقت کو کئی گنا بڑا یا چھوٹا دکھا سکتا ہے۔ اسی لیے بچپن کی خوشیاں، نفرتوں اور محبتوں کا اعتبار نہیں ہوتا۔ امریکا میں بچے اپنے والدین سے "طلاق"، لینے کی بات کرتے ہیں یا خود

پر سختیاں کرنے کے بدلے والدین کو قتل کردیتے ہیں۔ ان کے ناپختہ ذہن کے آئینے نے حقیقت کو کتنا بدل کر دکھلایا، اس کا پتا لگائے بغیر سزا اور جزا کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔

کُل

جب آپ زندگی کا کوئی کُلیہ بنائیں تو پھر اسے پوری طرح زندگی کے ''کُل'' پر اپنائیں جیسے صوفی یا جوگی کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ تعلیم میں ایک کلیہ، کھیل میں دوسرا۔ تعلیم میں امریکا میں یہ نیا چرچا چلا ہے کہ مقابلہ ضروری نہیں، اوّل آنا لازمی نہیں، حصہ لینا کافی ہے۔ بچے دن رات ٹی وی پر مقابلہ دیکھتے ہیں۔ جیتنے والے کو شہرت، پیسا، بڑی بڑی رقوم پر ملازمتیں خواہ مس امریکا ہوں، کھلاڑی ہوں یا فلمی ستارے۔ اسی لیے پڑھائی غیر اہم، کھیل، سستی شہرت، ماڈلنگ اور گانے والے گروپ اہم ہوگئے ہیں یا مفت کی کمائی جیسے جوئے بازی اور لوٹو (lotto) جو کئی ملین ڈالر کے ہوتے ہیں۔ آپ کا مقصد اور مشن ہو دنیا کی لیڈری اور سب سے بڑی طاقت بنے رہنا، ہر کام میں سب سے آگے ہونا اور فلسفہ یہ ہو کہ مقابلہ ضروری نہیں صرف حصہ لینا اہم ہے تو گویا یوں ہوا کہ جانا شمال میں ہے اور رخ جنوب کی طرف ہے۔

فردا کے آگے پردا

قیدی نے کہا، جب میں قید میں تھا تو بہت سے ساتھیوں نے قید سے بھاگنے کی سبیل کی۔ مجھ سے ساتھ چلنے کو کہا، میں نے انکار کردیا۔ ان بھاگنے والوں میں کچھ کامیاب ہوئے، کچھ ناکام، کچھ پکڑے گئے، چند مارے گئے۔ کچھ ساری عمر کے لیے ایسی آفتوں میں گھر گئے کہ زندگی جہنم بن گئی۔ مجھے نہیں معلوم میں بھاگتا تو میرے ساتھ کیا گزرتی۔ کامیاب ہوتا یا ناکام... میں اگر پچھتاؤں کہ نکل بھاگتا تو اس قید سے چھوٹ جاتا تو کیا فائدہ! کیا معلوم بھاگنے والے سوچ رہے ہوں کہ قید پوری کاٹ لیتے تو اچھا ہوتا۔

Marfat.com

کن حالات میں کیا ہوتا، اس بات کا پتا نہیں چلتا اور نہ معلوم ہونے کی کوئی ضرورت ہے تو پچھتاوا کیسا!

بہار

پودا، جو ایک لٹکے ہوئے گملے میں لگا ہوا ہے، اس کی زندگی کتنی ہے! زمین سے وہ رزق کھینچ نہیں سکتا۔ آسمان کا پانی اس کی دسترس سے باہر ہے۔ صرف ہاتھوں سے دیے گئے پانی سے سینچا جاتا ہے۔ چار چھ یا دس بارہ دن پانی نہ ملے تو مرجھا جائے گا۔ چند دن میں جڑیں بھی سوکھ جائیں گی۔ وہ جان داری اس میں کہاں جو جڑدار درختوں میں ہے کہ خزاں آئی تو سونا رولتے رہے، برف پڑی تو سرما میں سو جانے والے جانوروں کی طرح مردہ بن گئے۔ بہار آئی تو انگڑائی لے کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ یوں کونپلیں پھوٹیں، یوں کلیاں نکلیں۔ ایسے پھول پات آئے جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ کہاں وہ جلی لکڑی جس میں زندگی کی رمق بھی نہیں، کہاں یہ روئیدگی، یہ پھیلاؤ یہ زندگی جو آپ سے آپ پھوٹی پڑ رہی ہو اور اپنے آپے میں نہ سما رہی ہو۔ اسی پالے اور برف کی نمی نے جس نے درخت کو جلا ڈالا تھا، زمین کے اندر اتر کر، اس کی رگوں میں خون بن کر اسے دوبارہ زندگی دے دی۔

حوالہ

بزرگ کہتے تھے کہ ہر چیز کی زیادتی خراب ہوتی ہے۔ شاید سچ کی زیادتی بھی بُری ہوتی ہے۔ شیخ سعدی جیسے بزرگ مصلحت آمیز کذب کو تکلیف دہ سچ پر ترجیح دیتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ کام کی کوئی چیز بنانے کے لیے سونے میں بھی ملاوٹ کرنی پڑتی ہے۔ سچ دو دھاری تلوار ہے۔ مخاطب کے ساتھ سچ بولنے والا خود بھی زخم کھاتا ہے۔ اسی لیے جو آدمی سچ میں جھوٹ کی ملاوٹ نہیں کرسکتا، ہمیشہ دکھی رہتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ لوگ اسی کو جھوٹا سمجھیں۔ جھوٹ کی دنیا میں بے میل سچ کا تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ لوگ سچے

شخص کو جھوٹا سمجھ کر اس کی زندگی عذاب بنا سکتے ہیں، اس لیے کہ ہر شخص نے زندگی کو اپنے حوالے سے سمجھا ہے اور اس کے نزدیک وہی حوالہ حرفِ آخر ہے۔

اچھی اور بُری آگ

آگ وہ ہے جو کسی کے اندر پارسیوں کے آتش کدے کی طرح سوتے جاگتے جلتی رہے۔ اندر کی آگ کی کوئی بات کرے تو لوگوں کا دھیان فوری طور پر بُری طرف جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں آگ گناہوں کی، حسد کی یا صرف جنس کی ہوتی ہے حالاں کہ آگ اچھی بھی ہوسکتی ہے اور بُری بھی۔ جلانے والی بھی اور جِلانے والی بھی۔ تخلیق کی آگ، نئے در کھوجنے اور نئی باتیں دریافت کرنے کی آگ اچھی آگ ہے۔ اس آگ کے لیے بھی عمر کی کوئی قید نہیں۔ لوگوں نے کلیہ بنا رکھا ہے کہ ایک خاص عمر کے بعد کوئی تصور، تفکر یا کھوج نہیں رہ جاتی مگر ایسا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں میں یہ شعلے تاحیات رہتے ہیں جس طرح بُری آگ کے پروردہ لوگ آخری سانس تک اپنے جہنم میں جلتے رہتے ہیں۔

مشین

جب کوئی مشین خراب ہو کر ایک ہی جگہ پر گھومتی رہے تو اسے نکالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ اسے آگے یا پیچھے لے جانا پڑتا ہے کہ کسی صورت دوبارہ صحیح راہ پر پڑ جائے۔

مگر جو مشین پیچھے جا کر پھر آگے ہی نہ بڑھے کیا اس کے ٹھیک ہونے کا کوئی امکان ہے...!؟

تربیت

جن بچوں کے والدین دوسروں کے سامنے بچوں سے پیار اور عاجزی سے

Marfat.com

بات کرتے ہیں اور تنہائی میں ان پر سختی کرتے ہیں، وہ بچے دوسروں کے سامنے انھیں خوب ناک چنے چبواتے ہیں۔ انھوں معلوم ہوتا ہے کہ اکیلے میں ان حرکتوں کا بھی حساب دینا ہوگا لیکن وہ دوسروں کے سامنے ان کا پیار حاصل کرنے اور اپنے دل کا غبار نکالنے سے باز نہیں آتے۔ سو یہ سلسلہ قائم رہتا ہے، جب تک ماں باپ یہ فیصلہ نہ کرلیں کہ بچوں کے لیے ان کا رویہ اکیلے دُکیلے میں ایک ہی ہونا چاہیے۔

ہوائیاں

تم ہم کیا چیز ہیں۔ لگانے والوں نے حضرت بی بی عائشہ اور سیتا جی کی عفت پر بھی بہتان لگائے ہیں۔ ان بہتان لگانے والوں میں زیادہ تر وہ مرد حضرات ہوتے ہیں، جو عورت اور مرد کی تنہائی کا تصور کسی اور طریقے سے کر ہی نہیں سکتے اور وہ عورتیں جن کو کسی قسم کے انتخاب کا حق کبھی نہیں ملا، انتقاماً ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ بات کو ہوا ملے تو وہ آگ کی طرح پھیلتی ہے اور اڑتی جاتی ہے۔ اس کو جڑ کی ضرورت نہیں۔ جڑوں کی ضرورت زندہ چیز کو ہوتی ہے مردہ ہوائی کو نہیں۔

عمر کے دور

عمر کی ہر نئی منزل میں قدم رکھتے وقت بڑی الجھنوں کا سامنا ہوتا ہے۔ بچہ جب ماں کی کوکھ سے دنیا میں آتا ہے تو ہر ہر چیز کے لیے دوسروں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس وقت اس کے اوپر جو بھی گزرتی ہے، قدرت اسے بھلا دیتی ہے ورنہ اس وقت کی محتاجی اس کی ساری شخصیت کو مجروح کردیتی۔ بعد میں احساسِ زیاں کم ہوتا جاتا ہے، اپنی فتح مندی اور کارکردگی بڑھتی جاتی ہے۔ محتاجی احساسِ احسان مندی بن جاتی ہے جس کا بدلہ وہ اپنے بچوں کی غیر مشروط نگہداشت سے چکاتا ہے۔ بچپن کے بعد لڑکپن، لڑکپن سے جوانی، جوانی سے ادھیڑ عمری اور ادھیڑ عمری سے بڑھاپا سب تکلیف دہ دور ہیں۔ کہیں آدمی جھپاک سے

Marfat.com

داخل ہونا چاہتا ہے مگر نہیں ہو پاتا۔ کہیں دہلیز پر کھڑا رہ کر جھانکنا چاہتا ہے، اندر جانے سے ہچکچاتا ہے مگر وقت ہر ایک کو تیز ریلے کی طرح دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ زندگی میں کتنا ہی امتیاز اور تفریق ہو، کم از کم اس معاملے میں قدرت نے کوئی تعصب نہیں رکھا۔ ہر کوئی ہر سال کی عمر سے گزرتا ہے اور اس کے گوناگوں تجربوں سے بھی، کوئی ایک دن بھی پھلانگ نہیں پاتا۔

عمر کی گرائمر

ماضی بعید بوڑھوں کے لیے ہے۔ ماضی قریب ادھیڑ عمروں کے لیے۔ حال جوانوں کے لیے، مستقبل قریب لڑکپن کے لیے اور ''مستقبل بعید'' بچوں کے لیے۔

یقین

کیا بدقسمتی کی بات ہے کہ انسان کو خدا کے وجود کا یقین اس بات سے ہو کہ اس پر جو ظلم اور یک طرفہ زیادتیاں ہوئی ہیں، ان کا حساب کرنے والا کوئی تو ہوگا۔ کوئی تو ہوگا جو اس کے لیے عدل کرے گا، جواب دہی کرے گا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ جیتے جی جس جہنم سے گزرتا ہے، اس کی سزا و جزا نہ ہو... یہ ناممکن ہے، اگر ہے تو سراسر ناانصافی ہے۔ اس کا دل پکار اٹھے کہ خدا ضرور ہے جو بالآخر اس کے ساتھ انصاف کرے گا۔

نیا سال

میں نے ایک صوفی سے پوچھا۔ نیا سال کب شروع ہوتا ہے؟''

اس نے جواب دیا، ''جب اللہ کی رضا ہوتی ہے۔''

میں نے ایک اچھے پاکستانی سے پوچھا۔ اس نے انگریزی اخبار کا پہلا صفحہ غور سے دیکھا پھر اس نے کہا، ''اصل میں ہمارا نیا سال محرم سے شروع ہوتا ہے لیکن ہمارا مالی

سال جنوری سے شروع ہوتا ہے۔ معاشرے میں مال کی بہت اہمیت ہوتی ہے، اس لیے ہمارا معاشرتی سال بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ چوں کہ ہم کہتے آئے ہیں کہ ہمارے ہاں مذہب اور معاشرہ الگ الگ نہیں اس لیے ہماری دو رُخی زندگی کی طرح ہمارے نئے سال بھی دو ہیں۔ دو نئے سال ہونے کے باوجود ہم عیسائیوں اور پارسیوں یا ایرانیوں کی طرح نئے سال کی خوشیاں منانے سے محروم ہیں، اس لیے کہ محرم سوز و نوحہ خوانی کا مہینہ ہے اور جنوری میں خوشی کے ہنگامے حکومت کی طرف سے ممنوع ہیں۔''

میں نے ایک نیک کرسچین سے پوچھا، ''نیا سال کب شروع ہوتا ہے؟'' اس نے جواب دیا... ''یسوع مسیح کی وفات سے، حالاں کہ پیدائش کے دن سے شروع ہونا چاہیے۔ ذرا سوچو تو... اگر نئے دن کی آمد صرف پانچ دن پیچھے کردی جائے تو کتنی بیہودگیاں کم ہوجائیں۔ لوگ ہوٹلوں میں شراب پی کر ناچنے کودنے کے بجائے چرچ میں 'پاک رات، خاموش رات' کی حمد گا کر نئے سال کا استقبال کیا کریں۔''

میں نے ایک ایکٹریس سے پوچھا، ''میرے لیے تو نیا سال اس وقت شروع ہوتا ہے جب کسی...!؟''

میں نے خود نئے سال سے پوچھا، وہ ہنس پڑا۔ بولا، ''میں وہی پرانا سال ہوتا ہوں مگر ہر سال نیا بن کر آجاتا ہوں۔ شروع میں میری بڑی پذیرائی ہوتی ہے لیکن ایک ماہ نہیں گزرتا کہ دُر دُر پھٹ پھٹ شروع ہوجاتی۔ ایک سال میں کوئی چیز اتنی پرانی نہیں ہوتی جتنا کہ بے چارہ سال۔ سب اسے کوڑے کی طرح نکال کر پھینک دینا چاہتے ہیں لیکن میں ہی جانتا ہوں کہ جس نئے سال کی اتنی آؤ بھگت ہو رہی ہے، وہ بھی میں ہی ہوں، ہر سال کی طرح نیا بھیس بدل کر آگیا ہوں۔''

بدترین بیماری

میں نے ایک دانا سے پوچھا، ''دنیا میں بدترین بیماری کیا ہے؟'' اس نے جواب

Marfat.com

دیا، ''احساسِ کمتری... دوسری بیماری میں مبتلا شخص خود تکلیف اٹھاتا ہے، اس بیماری میں دوسروں کو کھاتا ہے۔ بیماری ایک کو ہوتی ہے، کرب میں بہت سے گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر ان کے کرب کو نہ کوئی جانے، نہ سمجھے، نہ دوا، نہ دارو... کینسر کے مریض کی طرح گھلتے رہیں اور مریض اس 'احساسِ برتری' کے ساتھ گھومتا پھرے کہ وہ 'حاکم' ہے... کنٹرول مین ہے، طاقت اس کے پاس ہے۔ وہ طاقت کتنی کم زور ہے اندر سے، وہ جانتا ہے اور اس کم زور طاقت کو مستقل طور پر قوی کرنے کی کوشش میں دوسروں کا جینا حرام کرتا رہتا ہے...''

کون جانے!

خدا نے ہر چیز جدا جدا بنائی ہے۔ کروڑوں پتوں میں سے دو کی نسوں میں بھی شاید ہی یکسانیت ہو۔

یکسانیت کیوں نہیں ہوتی؟

اب میں کیا جانوں، یہ تو بنانے والا جانے جس نے جانے کتنے سال کائنات کو 'پروگرام' کیا... پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ جو کچھ پروگرام کیا ہے، وہ پردے پر کیسا لگتا ہے، اپنے کمپیوٹر کی ایک ''کی'' (key) پر انگلی مار کر یا ''کن'' کہہ کر اس پروگرام کو کائنات کے پردے (screen) پر پھیلا دیا۔

مینار

جب باہر کی سیر اور سفر ممکن نہ رہیں تو انسان کو چاہیے کہ اپنے اندر سفر شروع کردے۔ جب اپنے اندر کے سارے پھیلاؤ، ختم ہوجائیں تو اندر ہی ایک مینار بنانا شروع کرے اور قطب مینار کی طرح اس کی گول گول سیڑھیاں سہج سہج چڑھتا جائے اور ہر منزل سے دنیا کا نظارہ کرتا جائے۔ جب ایک منزل طے ہوجائے تو اس مینار کو اور اونچا کرلے۔

اچھی تحریر، بُری تحریر

میرے ساتھ مستقل طور پر یہ ہوتا ہے کہ کوئی اچھی کتاب پڑھنی ہو تو زندگی کے بھولے بسرے واقعات، کردار پرچھائیوں کی طرح ذہن کے پردے پر گزرنے شروع ہوجاتے ہیں۔ کبھی یہ اڑتے ہوئے ذرّے بڑے بڑے ہونے لگتے ہیں۔ ذہن میں کہانی بننے لگتی ہے اور یہ بھی ہوا کہ میں نے پڑھنا چھوڑ کر لکھنا شروع کردیا جب کہ میری تحریر کا اس کتاب سے، جو میں پڑھ رہی تھی، بظاہر کوئی تعلق بھی نظر نہیں آتا۔ بس اچھی تحریر وجدان کی ڈوری کو ہلکا سا ہلاتی ہے، ارتعاش پیدا ہوتا ہے، باقی کام آسان ہوجاتا ہے۔

بُری تحریر وجدان کی ڈوری کو ہلانا تو ایک طرف ذہن میں ایسے مروڑ ڈالنا شروع کرتی ہے کہ تھوڑی دیر میں ذہن کا خودکار بٹن بند ہوجاتا ہے۔ کتاب ہاتھ سے گرجاتی ہے یا اسے بند کرنا پڑتا ہے۔

اعراب

ایک ہی عہد میں، ایک ہی عمر کے لوگ کائناتی لحاظ سے عمر کی مختلف منزلوں میں ہوسکتے ہیں۔ ان کی ذہنی اور نفسی عمر مختلف ہوسکتی ہے۔ اسی لحاظ سے ان سے برتاؤ ہونا چاہیے۔ بڑے لوگوں کے لیے تحریر میں ''اعراب'' لگانے ضروری نہیں ہوتے مگر بچوں کے لیے یہ چھوٹے چھوٹے سمبل بہت اہم ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر وہ پڑھ نہیں سکتے۔ مذہب کی مختلف رسوم ہوسکتا ہے وہ اعراب ہوں جن کے بغیر کچھ لوگ اس کو ''پڑھ'' نہ سکیں۔

غصہ

آج کا ماہر نفسیات کہتا ہے، ''غصے کو اپنے اندر مت رکھو، اس کو اس طرح نکال پھینکو کہ کسی کو تکلیف نہ ہو۔ بدلہ لینے کی کوشش نہ کرو۔ اس سے تمھاری توانائی ضائع ہوگی،

ہمہ وقت سوچ میں رہنے سے ذہنی زیاں اور وقت ضائع ہوگا۔کوئی تکیہ لے لو اور اس پر یہ سوچ کر خوب گھونسے مارو کہ یہ وہ شخص ہے جس کے خلاف تمھیں غصہ ہے۔ بازار میں اب خاص طور پر ایسی چیزیں ملتی ہیں جن کو مار کر آپ اپنا غصہ ٹھنڈا کرسکتے ہیں۔ کچھ پر لکھا ہوتا ہے ''مالک'' (boss)۔

غم و غصے میں آج بھی لیڈروں کے پتلے بنا کر جلائے جاتے ہیں۔ راون کے پتلے جلانے کا رواج خدا جانے کب سے ہے۔ شیطان کو کنکریاں مارنے کا التزام بھی شاید اسی لیے ہو۔

قربت اور فاصلہ

بعض اوقات فاصلے سے آدمی مرعوب ہوجاتا ہے۔ قربت کسوٹی کا کام بھی دیتی ہے۔ پتا چل جاتا ہے، کون کیا ہے اور کتنے پانی میں ہے...!؟

روپٹہ بھر میل

پیٹھ کا وہ حصہ جہاں باوجود کوشش کے کہیں سے ہاتھ نہ پہنچ سکے،بعض اوقات میل کا گڑھ بن جاتا ہے۔ روپٹہ بھر میلی جگہ میں جب خارش ہوتی ہے تو بعض اوقات بدن میں پھیل جاتی ہے۔ آدمی خود ہی اپنا جسم کھجا کھجا کر لہولہان ہوجاتا ہے۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان صدیوں سے ساتھ رہتے ہیں مگر دلوں میں روپٹہ بھر میلی جگہ ہے۔ یہ کدورت وقفے وقفے سے دونوں قوموں کو لہولہان کرتی رہتی ہے۔

شادی خانہ...

پہلی امریکن شادی ہمیشہ قبل از وقت ہوتی ہے، اس لیے بیش تر ناکام و ناکارہ ہوتی ہے۔ دوسری ابتدا میں زوردار ہوتی ہے لیکن بعد میں چونٹیوں بھرا کباب ہوجاتی

Marfat.com

ہے۔ تیسری ابتدا میں دوسری سے بھی زوردار ہوتی ہے لیکن بعد ازیں وہ بھی رڈی اور ناکارہ ہوجاتی ہے۔ چوتھی، پانچویں اور چھٹی شادیاں عموماً مختصر مگر خوش گوار ہوتی ہیں۔ افسوس کہ وہ بھی زندگی بھر ساتھ نہیں دیتیں۔

پاکستانی شادی ایک ہی ہوتی ہے جو کبھی ناکام، کبھی ناکارہ، کبھی چیونٹیوں بھرا کباب، کبھی زوردار اور کبھی خوش گوار ہوتی ہے۔ اکثر اوقات سب کچھ ایک ہی وقت میں ہوتی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ زندگی بھر ساتھ بھی دیتی ہے۔

اصل، نقل

نوجوانی میں آپ انیسویں صدی کے روسی ادیبوں کی طرح زندگی میں بے انتہا غربت، بیماریاں، پریشانیاں اور کرب دیکھ کر بڑے کڑھتے ہیں اور ان ہی کی طرح سوچ میں پڑجاتے ہیں کہ کیا واقعی خدا ہے؟ اگر ہوتا تو کبھی ایسی دنیا نہ بناتا کہ جس میں معصوم بچے ایسی ایسی مصیبتیں بھگتتے ہیں کہ بے درد انسان تک لرز اٹھتا ہے... جب آپ صوفی منش، صوفی صفت انسانوں کو دیکھتے ہیں جو ہر قسم کے دکھ درد کی طرف سے اَن جان سے بنے رہتے ہیں تو آپ کو ان پر بھی غصہ آتا ہے اور پھر ان ہی لوگوں سے جب آپ یہ سنتے ہیں کہ دنیا کا یہ کاروبار بیوروکریٹ، کمشنر، وزیر، سفیر اور سیاست داں نہیں چلا رہے، بلکہ قطب اور ابدال چلا رہے ہیں تو اور رونا آتا ہے کہ سیاست دانوں کی بے حسی تو قابلِ برداشت ہے لیکن قطب اور ابدال کی کارکردگی کا یہ عالم کیسے قابلِ قبول ہوسکتا ہے! پھر آپ کو بتایا جاتا ہے کہ یہ قطب ابدال ان تمام دنیاؤں سے واقف ہیں جو تھیں، جو ہیں اور آنے والی ہیں۔ اس تمام وقت سے، وقت کی ان تمام تہوں سے، تاریخ کے ان مختلف دھاروں سے جو تھے، ہیں یا ہوں گے۔ تاریخ کے ایسے دھارے جو ہوسکتے تھے مگر نہ ہوئے یا ہوئے مگر ان دھاروں کا علم ہمیں نہ ہوا کیوں کہ ہم تاریخ کی کسی اور لہر بہر میں تھے... اور یہ بھی کہ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، ہوسکتا ہے یہ عالمِ امکاں ہو۔ کسی اور عالم

Marfat.com

کا پہلا ادھ کچرا مسودہ (رف ڈرافٹ) ہو۔ تحریر کی وہ پہلی صورت جس کی لکھنے والے کے نزدیک زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ کہانیوں میں انسان مرتے ہیں، ساتھی روتے ہیں لیکن لکھنے والا نہیں روتا کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہ محض افسانہ ہے۔

اصل عالم کیا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ میری ڈگری میرے سوٹ کیس میں محفوظ تھی۔ اس کی فوٹو کاپی کسی بچے نے پھاڑ دی۔ اس بچے کی دادی خوف سے لرز اٹھیں۔ میں نے کہا، ''جانے دیجیے ایسی ہزاروں کاپیاں پھاڑ دے تو کیا فرق پڑتا ہے، اصل تو میرے پاس محفوظ ہے۔'' وہ میری صورت دیکھنے لگیں۔ وہ فوٹو اسٹیٹ کی حقیقت سے واقف نہ تھیں... کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم سب صرف کاپیاں ہیں اور ہماری اصل کہیں اور محفوظ ہے؟

جڑواں مینار

وہ گنبدِ بے در تھا۔ آدھی زندگی اس سے ٹکرا کر، راہ ڈھونڈنے کے بعد راستہ نہ پا کر وہ بھی ایک گنبدِ بے در بن گئی۔ اب دو جڑواں مینار ساتھ ساتھ کھڑے ہیں۔ بظاہر پاس پاس، بباطن دور دور... دیکھنے میں خوش نما لگتے ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے بِنا نامکمل ہے لیکن ان میں آپس میں صرف یہی ایک رشتہ رہ گیا ہے۔ دو بے در کے گنبدوں میں اور رشتہ ہو بھی کیا سکتا ہے...!؟

سوال، جواب

اللہ میاں کے ہاں پہنچتے ہی ان سے بحث چل نکلی۔ سوال، سوال، سوال۔ اللہ میاں نے کہا، میں نے تمھیں اتنی عمر دی۔ تم نے اس میں کچھ سوچا سمجھا نہیں، آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ کردی۔ جاؤ واپس، اور دوبارہ غور وخوض کرو۔

اس نے چلا کر کہا، غور وخوض کے نتیجے میں ہی تو یہ سوال سوجھے ہیں، ورنہ...

مگر اس کی ایک نہ سنی گئی۔ اسے اوپر سے ہی دھاڑ سے نیچے پھینک دیا گیا۔

Marfat.com

لوگوں نے کہا، معجزہ ہوگیا... مردہ زندہ ہوگیا۔

زندگی

کبھی زندگی میں ایسے جوار بھاٹے آتے ہیں جیسے ربر کی کشتی میں چٹانی دریا کے نوکیلے پتھروں پر سے گزر رہے ہوں۔

کبھی ایسا سکوت جیسے چاندنی راتوں سنسان ریگستانوں میں ہوتا ہے۔

کبھی ایسے طوفانی لمحے، جیسے گردباد کا سیاہ ہاتھی اپنی لانبی سونڈ اٹھائے سیدھا آپ کی طرف لپکا آرہا ہو۔

کبھی ایسی بے آواز روانی جیسے کسی پتلی نہر میں کوئی کشتی چپ چاپ بہتی چلی جا رہی ہو۔

کبھی ایسا ذہنی شور جیسے بلندی پر راکٹ سدِصوت توڑتا ہوا گزر گیا ہو۔

کبھی ایسی پُرامید خاموشی جیسے چڑیا اپنے گھونسلے میں انڈوں پر آنکھیں موندے بیٹھی ہو۔

کبھی ایسی بے رس موٹی کتاب کی طرح ٹھس جسے برسوں سے کسی نے نہ کھولا ہو اور جس پر مٹی کی تہ جمتی جا رہی ہو۔

کبھی ایسی بلاخیز جیسے رولر کوسٹر پر بیٹھے ہوں... دل میں ایک وحشیانہ خوف، ذہن میں ایک اَن جانا احساسِ تحفظ۔

کوئی دن ایسا جیسے سیملکی روئی کا گالا ہوا سے اڑتا ہوا آیا اور گزر گیا۔

کوئی دن ایسا بھاری جیسے کوئی پتھر بیچ سڑک میں پڑا ٹھوکریں کھا رہا ہو اور جسے کوئی کنارے پر رکھ دینے کا روادار نہ ہو۔

کوئی دن شیشہ کہ آر پار سب کچھ نظر آئے۔

کوئی دن بلور کہ چمک سے آنکھیں خیرہ ہوں اور باہر دیکھنے کو جی نہ چاہے۔

کوئی دن سیسہ کہ قسمت کی بھاری دیوار کے پیچھے جھانکنا ناممکن ہوجائے۔

کبھی زندگی عدل کے ترازو کی طرح آدھوں آدھ، سانس روکے کہ کسی بھی طرف کا پلڑا جھک نہ جائے۔

یہی زندگی کبھی شیروں کی للکار،
کبھی تلوار کی تیز دھار،
کبھی چڑیوں کی چہکار،
کبھی پپیہے کی پکار،
کبھی پھولوں کی مہکار
کوئی ساعت برف کے ابتدائی گالوں کی طرح مسرور اور پُراسرار،
کوئی ساعت برف کی منجمد دیوار کی طرح رِستی اور ناگوار،
کوئی ساعت آنسو،
کوئی ساعت نالہ،
کوئی ساعت تبسم،
اور کوئی ساعت قہقہہ،

جب یہ سب کچھ ہوتب ہی تو زندگی بنتی ہے۔ ہر زندگی میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ کہیں کم، کہیں زیادہ، بقدرِ تقدیر، بقدرِ تدبیر، بقدرِ ورثہ (جین، gene)... یا بقدرِظرف۔

گردشِ مکرر

قدرت میں ازل سے گردشِ مکرر کا سلسلہ ہے۔ آج اسے recycling کا نام دیا گیا ہے۔ پانی سے بھاپ، بادل پھر پانی۔ پانی سے برف، گیس اور پھر پانی۔ مٹی سے پودے، پودوں سے کھاد، کھاد سے پھر پودے۔ زمین سے پہاڑ، پہاڑوں سے ریزے اور پھر زمین۔ انسان کو چاہیے کہ قدرت سے سبق سیکھے اور ایسی چیزیں بنائے جو مرنے مٹنے کے بعد خود بخود دوسرے جنم میں آجائیں ایسے پولی تھین کے تھیلے نہ بنائے جو پانچ سو

Marfat.com

سال تک رلتے پھریں اور مٹی نہ ہوسکیں۔ toxic waste کو استعمال کرنے کا سلیقہ نہ آئے، اسے نہ بنائے۔ ماحول کو آلودہ کرنے اور زمین میں زندہ دفن کرنے کا اسے کوئی حق نہیں۔ بنیادی بات! کوئی ایسی چیز نہ بنائے جو پیدائش، افزائش اور موت کے بعد کسی نہ کسی صورت میں آپ سے آپ، جلد دوبارہ پیدا نہ ہوسکے۔ ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ آتما بھی recycle کرتی ہے جسے آواگون کہتے ہیں۔ پوتر آتمائیں گردشِ مکرر میں بھی پوتر رہتی ہیں اور آہستہ آہستہ نروان حاصل کرلیتی ہیں، یعنی انھیں گردش کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید وہ کسی امر، قائم بالذات وجود کا حصہ بن جاتی ہیں۔ گندی آتمائیں پولی تھین کے وہ تھیلے ہیں جو گردشِ مکرر کے باوجود مدتوں رُلتی پھرتی ہیں...

بعض آتماؤں کو اپنا پچھلا جنم یا اس کی بعض باتیں یاد رہ جاتی ہیں...کبھی وہ زبان جو وہ پچھلے جنم میں بولتی تھیں۔ ایسی آتماؤں کے مالک عالمِ بے ہوشی یا سخت ہیجان کے عالم میں بے تکان پچھلے جنم کی زبان بولنا شروع کردیتے ہیں۔ گلِ کوزہ جب دوبارہ کوزہ بنتی ہے تو ہوسکتا ہے کہ پچھلے جنم کا رنگ، ساخت یا بافت باقی رہ جاتی ہو...

مسلمانوں کے نزدیک جسم خاکی ہے جو خاک سے جا ملتا ہے۔ ہر روح نوری اور پاک ہے جسے نروان کی حاجت نہیں، وہ مرتی نہیں بلکہ جسم سے نکلتے ہی عالمِ ارواح میں چلی جاتی ہے، اسے گردشِ مکرر کی ضرورت نہیں۔ گردشِ مکرر کے لیے ایک مرتبہ مرنا اور ختم ہوجانا ضروری ہے۔

سمجھوتا

زندگی کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہوتو؟

سمجھوتا...اگر تم کسی شخص کو دیکھو جسے زمانے بھر کی خوشیاں اور دنیا بھر کی دولت ملی ہو یا کوئی ایسا شخص جو ہر پابندی سے ماورا اور من مانی کرنے والا دکھائی دے تو بھی دھوکا مت کھانا۔ یقین رکھنا کہ اس نے بھی کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی سمجھوتا ضرور کیا ہے۔ سمجھوتے کا ہی دوسرا نام زندگی ہے۔ اس کے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں۔ بچہ جب ماں کے

پیٹ میں پڑتا ہے تو ایک سمجھوتے سے ہی اس کی داغ بیل پڑتی ہے۔ کسی نے اس کا نام شادی، کسی نے محبت، کسی نے جنس رکھ دیا ہے مگر دو انسانوں کے پل بھر کے سمجھوتے سے جو بیج پھوٹتا ہے، وہی ایک نئی زندگی ہے جو سمجھوتے کی کھاد اور پانی سے ہی پرورش پاتا ہے۔ جس کی اساس جس چیز سے اٹھے گی، اسی سے اس کی بڑھوتری ہوگی... اسی سے تو وہ پنپے گی اور نشوونما پائے گی۔

بازیچۂ اطفال

بچے کسی بات پر بے حد سنجیدہ ہوں تو بڑا آدمی بظاہر ان کے ساتھ سنجیدہ ہو جاتا ہے لیکن دل میں جانتا ہے کہ نہیں ایسی کوئی پریشانی کی بات نہیں۔ دنیا کو ہمیشہ اسی طرح سمجھو... اگر تم دنیا کو بازیچۂ اطفال نہیں سمجھو گے تو دنیا تمھیں بازیچہ سمجھے گی۔ جتنا تم اس کے ہاتھ میں کھیلو گے اتنا ہی وہ اور ناچ نچائے گی۔

پردہ

جو لوگ دوسروں کے زخم کریدتے ہیں بیٹی، وہ اپنے زخم ان کے پردوں میں چھپاتے ہیں۔ غیر شعوری طور پر ان کو تسکین ملتی ہے۔ شاید غیبت بھی یہی کرتی ہو۔ دوسروں کی برائی اپنی کسی خامی کا پردہ ڈھانپتی ہو۔

زبردست اور زبردستی

بیٹی، بچپن میں میری ایک سہیلی تھی۔ وہ گڑیوں سے نہیں کھیلتی تھی۔ جب وہ خوش ہوتی تو لال، گلابی رنگوں سے پھول بناتی، جب اداس ہوتی تو بھورے پیلے رنگوں سے سوکھے پتے بناتی اور جب غصے میں ہوتی تو دانت نکالے، بپھرے جانور بناتی۔ جو بھی اس کی تصویریں دیکھتا، اَش اَش کرتا اور کہتا کہ ایک دن یہ لڑکی بڑی مصورہ بنے گی۔

یہی ہوا، جوں جوں وہ بڑی ہوتی گئی، اس کا کام بہتر ہوتا گیا۔ مگر جب اس کی شادی ہوئی تو اس کا شوہر اسے تصویریں بنانے سے منع کرنے لگا۔ اس کے نزدیک یہ فضول شوق تھا، وقت اور پیسے کا نقصان تھا اور اس کام میں لگے رہنے سے گھر داری میں فرق آتا تھا۔

میری سہیلی، بے چاری کہتی تھی کہ اگر وہ تصویریں نہیں بنائے گی تو مرجائے گی۔ وہ شوہر سے چھپا چھپا کر تصویریں بناتی اور بیچتی رہی کہ اس کا شوہر گھر داری کے علاوہ اس کے اپنے خرچ کے لیے کوئی پیسا نہ دیتا تھا۔

آخر ایک دن اچانک شوہر کو معلوم ہوا کہ اس کی بیوی بہ حیثیت آرٹسٹ بہت مشہور ہوچکی ہے۔ نام کے علاوہ پیسا بھی کما رہی ہے۔ اس دن سے شوہر اس کا اور اس کے آرٹ کا سرپرست بن گیا۔ اس سے زبردستی تصویریں بنوانے اور فروخت کرنے لگا۔ چند دن بعد سہیلی میرے پاس آکر رونے لگی کہ اب اس سے کوئی اچھی اور خوب صورت تصویر بنتی ہی نہیں۔

کیوں... اب تو تمھارا شوہر بھی تمھارا طرف دار ہے۔ گھر کے لیے نوکر بھی رکھ دیا ہے۔

اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا، یوں لگتا ہے جیسے آرٹ زبردست کی مار کھا کے تو جی سکتا ہے مگر زبردستی کرنے سے نہیں پنپ سکتا۔ اُس پودے کی طرح مر جاتا ہے جسے اس لیے زیادہ پانی دیا جا رہا ہو کہ جلدی سے بڑھ کر پھل دینے لگے...

بپتا

تمھیں تمھارے دادا کا قصہ سناتی ہوں۔ تم چار ماہ کی تھیں کہ تمھیں کوئی کہانی سنا رہے تھے۔

میں نے پوچھا، ''کیا سنا رہے ہو؟''

اپنی بپتا۔'' جواب ملا۔''

Marfat.com

''وہ کیا سمجھے گی...'' میں نے ہنس کر کہا۔

ٹھنڈی سانس بھر کر بولے، ''سمجھے گی نہیں، سن تو لے گی۔''

اپنے اپنے گُر

زندگی گزارنے کے گُر، زندگی کرنے کی آسانیاں، کائنات کے بھید اور بیماریوں کے حل کسی ایک نسل کے حوالے کبھی نہیں کیے جائیں گے۔ آنے والی ہر نسل کو یہ کام کرنا ہے، اپنے لیے حل کھوجنا ہے۔ کائنات کے یہ گُر دوسرے سائنس داں اور عالم آگے لے کر چلتے ہیں لیکن زندگی گزارنے کے گُر کتابوں میں ہوں، تحقیقی اداروں میں پرکھے جاچکے ہوں، تب بھی ہر شخص کو اپنے لیے خود ہی ڈھونڈنے پڑتے ہیں، جس طرح ہر بچے کو ایک خاص وقت میں پہلا دانت نکالنا، پہلا قدم اٹھانا اور پہلا لفظ بولنا پڑتا ہے۔

عمل کی آزادی

اگر آپ چاہیں کہ دوسرے آپ کو اپنی مرضی پر چلنے پر مجبور نہ کریں تو لازم ہے کہ خود بھی آپ یہ کام نہ کریں۔ دوسروں کو اپنی مرضی کا پابند نہ کرنے کی کوشش خود بہ خود آپ کو اپنی مرضی پر چلنے کی اجازت دے دیتی ہے جس طرح دوسروں کو اپنی مرضی پر چلانے کی کوشش اَن جانے میں آپ کو دوسروں کی مرضی کا پابند بنا دیتی ہے۔

پرستش

قدرت اور فطرت کے اپنے قانون ہیں مگر قدرت اور فطرت ''اخلاقیات'' میں نہیں پڑتی یا اس کے نتائج بہت دیر سے سمجھ میں آتے ہیں۔ ان رخنوں کو روکنے کے لیے مذہب کو درمیان میں لایا گیا ہے۔ اصل میں ثالثی کے لیے بظاہر مطلق حکم... یہ کرو... یہ نہ کرو۔

پرستش کے آداب اپنے اندر سے پھوٹتے ہیں۔ یہ انسانی جبلت کی طرح انسان میں موجود ہیں۔ جب وہ کسی کا حکم مانے گا، اپنے سے اونچا درجہ دے گا تو اسے اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر پوجے گا اور دوسرے سے بھی کہے گا کہ اسے پوجو۔

میری ایک دوست سقراط کے جیل خانے کے چھوٹے چھوٹے کنکر اور دوسری دوست حرم کا طواف کرتے ہوئے پاؤں میں چبھتے ہوئے پتھر پرس میں ڈال کر لائی۔ امی کی برسی کے دن بے تحاشا جی چاہتا ہے کہ کھیر پکاؤں، شوق سے کھاتی تھیں۔ یہ سب کیا ہے! محبت، عقیدت یا رسم پرستی۔

میل سے بھاری

''بیٹی، ذرا میرا دوپٹہ دھو دے، میل سے بھاری ہو رہا ہے۔''

''دادی، میل سے بھی کوئی چیز بھاری ہوجاتی ہے؟''

''ہاں بیٹی، میری سونے کی یہ چوڑیاں بھی میل سے بھاری ہیں۔ پچاس سال میں ماشوں سونا گھس گیا ہے مگر میل نے حساب برابر کر رکھا ہے اور تو اور بعض بندے بھی میل سے بھاری ہوتے ہیں۔''

''کیوں... کیا وہ کبھی نہاتے نہیں؟''

''چاہے دن میں دو دفعہ نہاتے ہوں۔ یہ لوگ من کے میل سے بھاری ہوتے ہیں۔ ہنس مت بیٹی۔ یہ باتیں کتابوں سے نہیں تجربوں سے آتی ہیں، اس لیے صرف دادی اماؤں کو پتا ہوتی ہیں۔ جب تو بڑی ہوجائے گی، اپنے تجربے سے سب باتیں سمجھ لے گی۔''

مانگے ملے نہ بھیک

عجیب سی بات ہے بیٹی، مگر ہے کہ جب آدمی دینے کے قابل ہو تو اسے بن

Marfat.com

مانگے ملتا ہے اور جب مانگنے کی جگہ پر ہو تو کچھ نہیں ملتا۔

حیرت

''دادی میں حیران ہوں کہ یہ بے چاری عورت جو فٹ پاتھ پر لحاف اوڑھے سو رہی ہے اٹھ کر کہاں نہائے گی۔ کیسے میک اپ کرے گی اور اپنا زیور کہاں رکھتی ہوگی بے چاری... !؟''

''ہاں بیٹی، تیرے لیے یہی بات حیران ہونے کی ہے کیوں کہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ یہ عورت برسوں نہاتی نہیں تو میک اپ کیا خاک کرے گی اور زیور تو کبھی اس کی پشتوں نے نہیں رکھا۔''

بیٹی، بیٹا

''دادی، جب دادا مجھے 'بیٹا' کہتے ہیں تو آپ انھیں کیوں ٹوکتی ہیں؟''

''یہ جتانے کے لیے کہ انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے، کیوں کہ جب وہ بیٹی کو بیٹا کہتے ہیں تو گویا اَن جانے میں یہ کہتے ہیں، کاش تو بیٹا ہوتی!''

راستے

''دادی، یہ ساری سڑکیں کہاں جاتی ہیں؟''

''کہیں نہ کہیں جا کر کسی اور سڑک میں مل جاتی ہیں۔''

''ایسے راستے بھی تو ہوتے ہیں دادی جو جنگل میں جا کر کھو جاتے ہیں یا دریا یا سمندر پر جا کر ختم ہو جاتے ہیں۔''

''ختم نہیں ہوتے، صرف نظر نہیں آتے۔ وہ جنگل یا پانیوں پر چپکے چپکے چل کر،

کہیں نہ کہیں جا کر پھر دوسرے راستوں سے مل جاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے آدمی کبھی کھو نہیں سکتا اگر وہ چلتا رہے۔ ہاں بیٹی، اگر اسے جنگلوں میں اور پانیوں پر چلنے کا سلیقہ ہو اور وہ چلتا رہے۔''

بُری بات

''دادی، کیا آپ کی دوست پیغمبرہ ہیں؟''

''کس نے کہا؟''

''میری سہیلی کہہ رہی تھی کہ وہ ایسی باتیں کرتی ہیں جیسے خدا نے انھیں کوئی پیغام دے کر بھیجا ہو۔ شکل سے بھی وہ فرشتہ لگتی ہیں اور فرشتہ سیرت بھی ہیں۔''

''بری بات! ایسے نہیں کہتے بیٹی، عورت پیغمبر نہیں ہوتی، فرشتہ صورت ہو یا فرشتہ سیرت، عمر کی کسی بھی منزل کو پہنچ جائے وہ صرف دادی یا نانی ہوتی ہے۔''

سیکھنے کا عمل

''دادی، سب سے زیادہ کیا چیز انسان کو سیکھنے پر اکساتی ہے؟''

''تجسس۔''

''اس کے بعد؟''

''بہتر زندگی بسر کرنے کی تمنا۔''

''اس کے بعد؟''

''خود کو بہتر بنانے کا شوق۔''

''اس کے بعد؟''

''کچھ نہیں، اس کے بعد دوسروں سے بہتر زندگی بسر کرنے کی خواہش اور

دوسروں سے برتر بننے کے شوق میں سیکھنے کا عمل ختم ہوجاتا ہے۔ صرف ہوس اور نمائش رہ جاتی ہے اور ترقی کا گراف نیچے جانے لگتا ہے۔ قوموں کے زوال کا گراف بھی اسی طرح گرتا ہے۔''

امرود اور نشان

''دادی، یہ امرود پر نشان کیسا ہے؟''

''بیٹی، چڑیا نے چونچ ماردی تھی۔ امرود کچا تھا، زخم بھر گیا مگر نشان رہ گیا۔''

''چڑیا امرود پر چونچ کیوں مارتی ہے دادی؟''

''وہ امرود کو کھانا چاہتی ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ امرود اسے پسند ہے۔''

''جو چیز پسند ہوتی ہے کیا اسے کھا لیتے ہیں؟''

''کچھ چیزیں اس لیے پسند ہوتی ہیں کہ کھانے میں اچھی لگتی ہیں، کچھ اس لیے کہ دیکھنے میں اچھی لگتی ہیں۔''

''جو چیز دیکھنے میں اچھی لگے اور کھائی نہ جاسکے کیا اس پر نشان ڈالنا اچھی بات ہے؟''

''اچھی بات تو نہیں ہے بیٹی، مگر دنیا والے ایسا کرتے ہیں۔ ان کو محبت کے چرکے کہتے ہیں۔''

سخن کا صرافہ بازار

ہم ایک بڑے شاعر کے تازہ کلام کو لے کر سخن کے صرافہ بازار گئے۔ جوہر نے

Marfat.com

تول کر کہا۔ ''مال تو کھرا ہے مگر ذرا پرانا ہے۔''

ہم نے کہا... ''کیا کہہ رہے ہو! پہچانتے نہیں ہو، کس کی چیز ہے؟''

بولا۔ ''پہچانتا ہوں صاحب، مال وہی ہے، مگر کوئی نیا ڈیزائن (نئی وضع) نہیں ہے اور پھر ٹانکہ بہت ہے پہلے کے مقابلے میں۔''

ایک اور شاعر کے کلام کو کھرا سونا سمجھ کر لے گئے تو جوہری نے کہا۔ ''غلط ہے، نری کھوٹ ہے، تولہ بھر سونا یا چاندی نکل آئے تو مونچھ منڈوا دوں۔''

سخن کے صارفہ بازار کا خیال ہمیں ایک غلطی سے آیا، غلطی بھی کتابت کی۔ مرزا غالبؔ نے کہا تھا۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

لوگ تو خیر نالے کو رسا باندھتے ہیں، کاتب سے بعید نہیں کہ اسے رسّا باندھ دے اور اس میں گرہ بھی لگا دے۔

غلطی تو خیر اتنی بڑی نہیں تھی مگر ہمارے تخیل کی اڑان نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ایک کتاب کے تبصرے میں کتاب کے صفحات درج تھے سو اور قیمت درج تھی تین سو... اس پر ہمیں خیال آیا کہ اگر مصنفوں کی تخلیقات فی صفحے کے حساب سے فروخت ہوتیں تو کیا خوب ہوتا۔

پھر خیال آیا کہ اگر سونا تولے کے حساب سے مل سکتا ہے تو شاعروں اور ادیبوں کا کلام تولے اور ماشے کے حساب سے کیوں نہیں بک سکتا۔ ظاہر ہے کہ ہر شاعر کے کلام کے دام ایک تو نہیں ہوسکتے چناں چہ ٹیلی وژن، ریڈیو اور اخباروں میں روز کے بھاؤ آیا کریں۔

اور اِن اِن شاعروں کے کلام کے بھاؤ آج موصول نہیں ہوئے۔

اور ادب کا اسٹاک ایکسچینج بن جائے تو کبھی کسی ادیب کا بھاؤ چڑھا ہوا ہے تو کبھی کسی اور ادیب کا، کبھی کسی کا بھاؤ یکایک گر گیا۔ کبھی اعلان ہو رہا ہے کہ آج ادب

Marfat.com

میں مندی کا رجحان رہا... اور کبھی ہلّہ بول دیا گیا...

پر نہ خدا کرے کہ یوں

ادب اور ادیب یوں ہی ٹھیک ہیں۔ سہج پکے سو میٹھا ہو۔ دس پندرہ سال میں لوگ نام جاننا شروع کرتے ہیں۔ چالیس پچاس سال میں بھول بھال جاتے ہیں۔ اگر تخلیق میں جان ہو تو سو دو سو سال بعد نشاۃ الثانیہ کا دور آتا ہے ورنہ اکثر... آج مرے کل دوسرا دن۔

Marfat.com

کھوج

''کبھی کبھی بدن کا ایک ذرا سا دانہ جاکر ذہن میں چمٹ جاتا ہے۔'' ماہرہ نے ٹانگ کو ہلکا سا کھجلایا۔

''کیا خارش ہے؟'' منظر نے اخبار سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

''کل تک تو نہیں تھی، اب ہلکی ہلکی شروع ہوئی ہے۔'' ماہرہ نے کہا اور بے خیالی میں ایک مرتبہ ہاتھ پھر اس دانے تک گیا۔

''ڈاکٹر کو دکھا دیتیں۔'' منظر نے اخبار پڑھتے پڑھتے جیسے مروّتاً کہا۔

''فون پر بات کی تھی، اس نے کیفیت پوچھی، میں نے بتائی، کہنے لگی جب درد نہیں اور کاٹے کی جگہ سوجن نہیں تو پریشانی کی بات نہیں، ایک آدھ دن میں ٹھیک ہو جائے گا...''

''دوا نہیں بتائی کوئی؟''

''نہیں، بولی جگہ صاف رکھو اور کوئی تبدیلی ہو تو بتانا۔ اب یہ تبدیلی ہے کہ ایک ننھا سا سفید دانہ ابھر آیا ہے، تل برابر۔ سوچ رہی ہوں، بتاؤں یا نہ بتاؤں۔''

''بتا دو۔'' منظر نے کہا۔

Marfat.com

ماہرہ کو معلوم تھا، منظر یہی کہے گا۔ وہ اُس کی جگہ ہوتی تو خود بھی یہی کہہ دیتی، اس لیے کہ کہنا کتنا آسان ہوتا ہے، کرنا ہو تو کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ ڈاکٹر مصروف ہوگی، سوچے گی، ذرا ذرا سی بات پر اٹھایا فون کر دیا، درد اور سوجن تو ابھی بھی نہیں ہے اور ڈاکٹر ملے گی کہاں۔ اس کی منکر نکیریں بات کریں گی، پھر ڈاکٹر کی ڈھونڈیا پڑے گی۔ ہوسکتا ہے بے چاری کوئی ضروری کام کر رہی ہو یا آپریشن تھیٹر میں ہو۔

چلو شام تک دیکھے لیتی ہوں۔ ماہرہ نے جیسے بلند آواز میں سوچا۔

''دکھانا کہاں ہے دانہ؟'' پہلی دفعہ اخبار سے نظر ہٹا کر منظر نے اس کی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ جانے کیوں وہ سرخ ہوگئی۔

''نہیں، کہیں نہیں ہے۔''

''ارے دانہ دیکھ رہا ہوں، کیا موتی اکھاڑ لوں گا۔''

''بہت منا سا ہے، نظر بھی نہیں آئے گا۔''

''ہے بھی یا یوں ہی...''

''کیا مطلب؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں، کھانا رکھ دو، بھوک لگی ہے۔''

ماش کی دال کے ساتھ سرکے میں پیاز ڈالتے ہوئے ماہرہ نے کہا، ''رحیمہ سے بھی بات ہوئی مکڑی کے کاٹنے کی۔ کہہ رہی تھی بعض مکڑیاں زہریلی ہوتی ہیں۔ سرکہ وغیرہ لگالو۔''

''تم نے کہا نہیں کہ بعض لڑکیاں بھی زہریلی ہوتی ہیں جیسے وہ خود... اسے چاہیے کہ وہ بھی صبح شام سرکہ پیا کرے... خاص طور پر ناشتے میں۔''

''تمھیں میری ساری سہیلیاں زہر کیوں لگتی ہیں؟''

''زہریلی ہیں اس لیے... اور مرد دوست بھی۔''

''مرد دوست تو ابھی تک نہیں ہیں۔''

''تو وہ کون ہیں جن کے ساتھ باہر جاتی ہو؟''

Marfat.com

''کہاں جاتی ہوں، بس میٹنگ میں کبھی کبھی وہ بھی اسی شہر میں۔''

''ہاں مجھے سب معلوم ہے۔''

''تو خیر چھوڑو، بات سرکے کی ہو رہی تھی۔'' ماہرہ نے بات بدلی۔

''ہاں یہ سرکہ تم خود کھاؤ یا زخم پر لگاؤ یا اپنی سہیلی کو بھیج دو۔ میں تو اچار سے کھاؤں گا۔''

''میں نے احتیاطاً لگا لیا اور اب کھا بھی رہی ہوں۔''

''احتیاطاً ڈاکٹر کے پاس بھی ہو آؤ...''

''کہہ تو رہی ہوں، شام کو دیکھے لیتی ہوں۔''

''جیسی تمھاری مرضی... مگر اس گھر میں مکڑی کہاں سے آئی؟ کہیں گھاس واس پر کاٹا ہوگا۔''

''میں سمجھی نہیں۔''

''مطلب یہ کہ جب پکنکوں پر اِدھر اُدھر جانا ہوتا ہے تو وہاں مکڑیاں ہوتی ہیں۔''

''پچھلے ایک سال سے تو میں پکنک پر نہیں گئی۔''

''میرے ساتھ۔''

''نہ تمھارے ساتھ، نہ کسی اور کے ساتھ۔''

''تو اس گھر میں مکڑیاں کہاں سے آئیں گی، جہاں خاتونِ خانہ کو صفائی کا جنون ہو؟''

''اسی گھر میں تھی اور اسی خاتون کو کاٹا۔''

''کیسے؟''

''میں attic کی صفائی کر رہی تھی۔ ہاؤس کوٹ پہن رکھا تھا کہ صفائی کے بعد نہا دھو کر کپڑے بدلوں گی۔ وہاں پرانی سی کرسی پر بیٹھ کر چیزیں جھاڑ پونچھ رہی تھی کہ ہاتھ پر جالا سا لگا... میں نے جھٹکا تو محسوس ہوا جیسے ٹانگ پر کوئی چیز ہے۔ ایک بھوری گھریلو سی مکڑی تھی۔ میں نے جھٹک کر چپل سے دبا دی۔ ٹانگ کو دیکھا تو ہلکا سا سرخ نشان تھا اور

بس۔ درد بھی نہیں ہوا۔"

"اگر صفائی کا جنون نہ ہوتا تو attic میں نہ جاتیں اور جالوں میں نہ الجھتیں... جالا مکڑی کا گھر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس طرح تمھارے گھر پر حملہ کرے تو..."

"تو شاید میں بھی کاٹ لوں۔" ماہرہ ہنسی۔

تو بے چاری مکڑی نے کیا برا کیا۔ ایک ہی بوند زہر کی ہوگی، اس غریب کے پاس۔"

شام تک وہ جگہ جہاں مکڑی نے کاٹا تھا، سرخ ہوگئی اور سوج گئی ہلکی سی جیسے مچھر کے کاٹنے پر بعض دفعہ ہوجاتی ہے۔ ماہرہ نے ڈاکٹر کو دکھایا۔

"بلیک وِڈو (black widow) تو نہیں تھی؟" ڈاکٹر پوچھنے لگی، "یہ زہریلی ہوتی ہے۔"

"مجھے کیا معلوم؟" ماہرہ نے کہا۔

ڈاکٹر کتاب اٹھا لائی... اس میں تصویریں بھی تھیں۔

"کالی بیوہ تو بے حد بدشکل ہے۔ میں تو اسے مارتے ہوئے بھی گھن کھاتی۔ اور یہ سرخ بیوہ تو بڑی خوب صورت ہے۔ گلابی گلابی ہاتھ پاؤں اور سیاہ جسم جس پر سرخ چتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ تو مکڑی لگ بھی نہیں رہی..."

"تو پھر وہ کیسی تھی جس نے آپ کو کاٹا... اس کے سر پر وائلن جیسی شکل بنی ہوئی تھی؟"

"بھوری سی گھریلو قسم کی تھی، جیسے یہ..." ماہرہ نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔ "مگر attic میں اندھیرا تھا، اس لیے میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اس کے سر پر وائلن تھا۔ گٹار یا ستار... پاؤں سے کچلتے ہی سارے سُر بے چاری کے بیچ سے نکل گئے۔ مگر ایک بوند زہر کی وہ ڈال ہی گئی؟"

"خیر، پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، صرف نظر رکھیے۔ اگر نیلے یا اودے رنگ کے ہالے سے پڑجائیں... تو مجھے بتائیں..." ڈاکٹر نے کہا۔

Marfat.com

نیلے، اودے دائرے بھی پڑے۔ اگلے چند دنوں میں زخم اور بڑھ گیا۔ antibiotics سے بھی قابو میں نہ آیا۔ بدن میں درد اور متلی کی کیفیت بڑھتی گئی جیسے flue ہو رہا ہو۔ کھانا نہ کھایا جاتا تھا۔ ایک ہفتے میں دس پاؤنڈ وزن کم ہوگیا۔ زخم درمیان سے سیاہ پڑنے لگا اور سوجن بڑھنے لگی۔ باوجود دواؤں کے نہ متلی کی کیفیت میں کمی آئی، نہ زخم بہتر ہوا، بلکہ اطراف میں بڑھنے لگا۔ جب پوری ٹانگ سوج گئی۔ سیاہ زخم پہلے سے بھی خراب ہوگیا اور جسم میں پانی کی کمی ہوگئی تو فوری طور پر سرجن کو بلوایا گیا۔ سرجن کے دیکھتے دیکھتے وہ بے ہوشی میں چلی گئی... سرجن نے ماہرہ کے شوہر اور عزیزوں کو بتایا کہ اس کی ٹانگ میں زہر پھیل گیا ہے جس سے اس کا گوشت گلنا شروع ہوگیا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے، وقت بہت کم ہے۔ اور وہ کسی بھی وقت کومے میں جاسکتی ہے... وقت کم تھا اور سب آپس میں لڑ رہے تھے۔

''میں جانتا ہوں، تم چاہتے ہو وہ مر جائے... تم مرنے کے بعد اسے پوجنے کو تیار ہو مگر زندگی میں اسے سکھی نہیں دیکھ سکتے۔''

''بکواس نہ کیجیے بڑے بھائی صاحب آپ!... ہم اس کی بات کا احترام کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے وہ کتنی خود رائے ہے...''

''زندگی اور موت کے قانون انسان کے ہاتھ میں نہیں، خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ تم اس سے بڑے نہیں ہو اور نہ وہ ہے جو اس وقت بول نہیں سکتی۔''

''صرف ایک آدمی مریض کے پاس ٹھہر سکتا ہے، پلیز پانچ منٹ کے لیے۔ دوسرا پانچ منٹ بعد آئے... آئی ایم سوری... مگر اس یونٹ کے یہی قانون ہیں...''

منظر ٹھہر گیا... باقی نرسوں کے علاقے سے گزرتے جھولتے دروازے کے پار غائب ہوگئے۔

''آئی ایم سوری...'' نرس نے پھر ایک بار کہا۔

''میں سمجھتا ہوں...'' منظر نے کہا، ''مگر یہ سب بھی اس کے بھائی بہن ہیں۔ اس سے محبت کرتے ہیں۔ تمھارا کیا خیال ہے کہ شوہر زیادہ محبت کرتا ہے یا بھائی بہن...''

Marfat.com

نرس اس کی صورت دیکھنے لگی۔ پھر مسکرائی، ''مجھے نہیں معلوم... بہت سی باتوں پر منحصر ہے۔''

''ڈاکٹر کیا کہتا ہے، کوئی امید ہے؟''

''یقیناً... ڈاکٹر چاہتا ہے وہ کومے میں نہ چلی جائیں، آپ جب تک ہیں، ان سے باتیں کریں، انھیں زندگی کی طرف بلائیں۔ وہ بول نہیں سکتیں مگر شاید سن سکتی ہیں۔''

''کیا میں ان کا پسندیدہ گانا گا سکتا ہوں؟''

''ضرور... میں دوسرے مریض کو دیکھ کر ابھی آتی ہوں۔''

منظر نے ماہرہ کی یخ بے جان انگلیاں تھامیں اور دھیرے دھیرے گاتا رہا۔ اس کا پسندیدہ نغمہ... اس کی اپنی مرضی ہوگی تو وہ لوٹ آئے گی... اس کا اپنا جی چاہے گا تو... لیکن فیصلہ ہمیں کرنا ہے... حالاں کہ اس نے تو کئی مرتبہ اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ کتنی ہی بار سب کے سامنے کہہ چکی ہے۔ مجھے مصنوعی مشینوں پر نہ رکھنا۔ زندگی کی امید نہ ہو تو موت کے لمحوں کو طویل نہ کرنا۔

منظر کی کزن دُرِ شہوار جھولتے دروازے سے جھانکی، پھر اندر آئی۔

''تمھیں ڈاکٹر بلا رہا ہے۔ میں ماہرہ کے پاس ٹھہرتی ہوں۔''

''اچھا...'' منظر جانے کے لیے بڑھا۔

''بات سنو، منظر... باہر کوئی اور بھی تمھارا منتظر ہے۔''

منظر کو عجیب سا لگا... کوئی میرا منتظر ہے۔ کون! باہر تو سب ماہرہ کے عزیز ہیں۔ سب اس کے ہوش میں آنے اور اس کی صحت یابی کے انتظار میں ہیں۔ میرا انتظار کون کر رہا ہے... ڈاکٹر کے علاوہ کوئی اور بھی...

دھیرے سے جھولتے دروازے کھول کر وہ باہر نکلا۔ بیوی کے عزیز رشتے دار کوئی کسی کھڑکی کے پاس کھڑا تھا، کوئی کسی در کے پاس۔ چند گروپ میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ دو ایک ویٹنگ روم میں بیٹھے تھے۔

''مسٹر منظر! مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ آیئے اس چھوٹے سے کانفرنس روم

Marfat.com

میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

سرجن منظر کو لے کر کانفرنس روم میں چلا گیا۔

☆

کوئی گانا گا رہا تھا۔ منظر تھا۔ پھر کوئی آیا تھا اور گانا بند ہوگیا تھا۔ آنے والی نے کہا، ڈاکٹر تمھارا انتظار کر رہا ہے اور کوئی اور بھی... قدموں کی چاپ کے ڈوب جانے کے بعد اسی آواز نے سختی سے کہا تھا:

"بس اب جاؤ بھی، پیچھا چھوڑو اس کا۔" شاید وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ آواز جانی پہچانی سی تھی مگر بہت زیادہ جانی پہچانی نہیں تھی۔ ہاں وہ مجھ سے ہی کہہ رہی تھی کہ اس کا پیچھا چھوڑ دو۔ کیا میں بہت بیمار ہوں؟ کیا میرے حواس کام نہیں کر رہے ہیں، کچھ نہیں... مگر یہ کون ہے جو چاہتی ہے، میں منظر کی زندگی سے نکل جاؤں... شاید اس کی دوستوں میں سے کوئی... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ جو مجھ پر اتنا شک کرتا ہے تو وہ خود کسی کے ساتھ پھنس گیا ہے۔ جو کچھ خود کرتا ہے، اس کے الزام میرے سر تھوپتا ہے۔ وہ جو شادی سے پہلے محبت کے بڑے بڑے دعوے کرتا تھا، سب کچھ بول جاتا ہے۔ شاید دنیا ہے ہی بدلنے کے لیے۔

ایک نمونہ بنایا چھوٹے چھوٹے رنگین شیشوں کا اور ۔۔۔ ہلکے ہلکے ہلاتے رہے۔ پیٹرن بدل رہے ہیں۔ کچھ کے کچھ، کچھ کے کچھ... رنگ کھل رہے ہیں، مل رہے ہیں، الگ ہو رہے ہیں۔ لکیریں، نقطے، قوسیں، دائرے ملتے ہیں، نئے نمونے بناتے ہیں پھر الگ ہوجاتے ہیں۔ نئے نمونے بن رہے ہیں، مٹ رہے ہیں، یہ دنیا ہے۔ اس رنگ برنگی، پل پل بدلتی، روپ بہروپ بھرتی دنیا میں ہم کیا ڈھونڈتے ہیں... کیا کیا کچھ... محبت، اطمینانِ قلب، کاملیت، عدل و انصاف، سچائی، انسانیت اور بقا... جس چیز سے خود بنی نہیں، وہ کہاں سے لائے وہ...

ایک نقطۂ ہے صفر... اس کو حال کہہ لو... حال کا ہر لمحہ، ہر لحظہ، ذرہ چھوٹے سے چھوٹا ایٹم صفر ہے۔ اس کے دونوں طرف eternity ہے۔ رنگ بدلتی، پل پل بدلتی نمونے

Marfat.com

بناتی... اور صفر ہر ایک کا اپنا ہے۔ اس صفر کے ایک طرف ماضی ہے جو ازل سے جا کر ملتا ہے۔ دوسری طرف مستقبل ہے جس کا سرا ابد سے جا کر مل جاتا ہے۔ ہر شخص کا حال، ازل اور ابد الگ بھی ہے اور ایک بھی کہ آخر کو سب کے ازل اور ابد جا کر ایک جگہ مل جائیں گے... شاید دائرہ ہی ہو۔ ازل اور ابد بھی جا کر رنگوں کے دائرے کی طرح مل جاتے ہوں اور قوسِ قزح کے رنگ بن جاتے ہوں۔ شاید یہ جو رنگ بدلتی، پل پل نئے روپ دھارتی دنیائیں ہیں، کائنات ہیں، کہکشائیں ہیں، یہ سب ازل اور ابد کے دائرے میں گھومتی رنگین شیشوں کی کرچیاں ہیں۔ ان کے نمونے ہماری زندگیاں ہیں کہ پل بھر کو ہیں، پل بھر میں نہیں ہیں... لیکن ہمارے اپنے لیے کتنی اہم ہیں۔ کتنے سنجیدہ ہیں ہم اپنی زندگیوں، خوشیوں اور غموں کے بارے میں... کتنی سنجیدگی اور اہمیت سے اس نے کہا... اب جاؤ بھی، اب پیچھا چھوڑو اس کا... اور اگر میں چلی گئی تو کیا ہوگا... ایک ننھا سا ٹکڑا اپنی جگہ سے ہلا اور کسی طرف کو چلا گیا... کیا فرق پڑا کسی چیز میں... شاید بڑے نمونے کے بدلنے میں ایک حقیر، غیر اہم سا کردار ادا کیا ہو...

ہاں... بڑا نمونہ اصل چیز ہے جو چھوٹے نمونوں، ٹکڑوں، ریزوں، ذرّوں اور رنگوں سے، ان کی حرکت سے بن رہا ہے۔۔ بن رہا ہے یا کوئی بنا رہا ہے یا کسی نے حرکت دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود اپنی طاقت سے یا اپنی حرکت کے زور سے حرکت میں آ رہا ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس بڑے نمونے میں ایک ذرّے کی کیا حقیقت ہے؟ ایک طرف تو آپ نہایت بے طاقت اور غیر اہم ہیں۔ لیکن اگر کہیں نہ کہیں اس بڑے نمونے میں آپ کی جگہ ہے تو قلابہ اس سے بھی ملتا ہوگا جس نے یہ نمونہ بنایا۔ کتنا ہی حقیر چھوٹا ٹکڑا کسی مقصد سے لگا ہوا ہے تو بڑی تصویر کا حصہ تو ہے۔ یہ زعم تو ہے کہ اس کی اہمیت ہے۔ اس بڑے نمونے میں کوئی مقام ہے تو اس کے خالق سے بھی کوئی نہ کوئی رشتہ تو ہے... تو یہ بڑا نمونہ ایک بڑا سسٹم ہے جس میں اور سسٹم کام کر رہے ہیں... کیا ان میں کوئی ایسا مشترکہ قانون ہے جو طبیعیات، مابعدالطبیعیات اور روحانیت پر یکساں لاگو ہو... اگر ایسا قانون مل جائے تو کیا کائنات کا قفل کھل جائے گا؟ فرض کرو ایسا کوئی قانون نہیں

ہے تو کیا ایسے قانون کا نہ ہونا کسی ازلی سچائی کا اشاریہ ہے۔ کیا یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ کچھ باتیں، کچھ سوال ایسے ہیں جن کا جواب کبھی نہیں ملے گا۔ شاید... شاید نہیں۔

قدموں کی چاپ... شاید وہ چلی گئی۔ چلتے چلتے پھر وہی بات کی، ''اب یہاں تک آ گئی ہو تو اور آگے بڑھ جاؤ۔ پیچھا چھوڑ دو اس کا۔''

☆

ڈاکٹر چلا گیا اور منظر باہر نکلا تو پھر اسے وہ بات یاد آئی جو دُرِشہوار نے کہی تھی کہ کوئی اور بھی اس کا منتظر ہے۔ دور کی ایک کھڑکی سے جھانکتی ایک خاتون نے پلٹ کر اسے دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی اس کی طرف آئی۔ چند لمحے پہچاننے میں لگے۔ وہ ثریا تھی... دُرِشہوار... کی چھوٹی بہن... ایک زمانے میں ثریا سے اس کی شادی کرانے میں دُرِشہوار نے بڑی تگ و دو کی تھی اور بہت حد تک کامیاب بھی ہوگئی تھیں۔ ان کی اپنی شادی شدہ زندگی کامیاب نہیں گزری تھی پھر بھی وہ دوسروں کی زندگی کے جوڑ توڑ میں لگی رہتی تھیں۔ بہت سی شادیاں کرائی بھی تھیں مگر ثریا سے منظر کی شادی نہ ہوسکنے کو انھوں نے اس کا اور اپنا المیہ بنا لیا تھا۔

''ہیلو...تم یہاں کیسے؟'' منظر نے پوچھا۔

ایک کانفرنس میں آئی تھی۔ آپا نے بتایا کہ ماہرہ بہت بیمار ہیں۔ میں نے کہا آپ عیادت کے لیے جائیں تو مجھے بھی لیتی جائیں، بس آ گئی۔''

''کہاں ہیں سب لوگ؟'' منظر نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

''آپا تو ویٹنگ روم میں بیٹھی ہیں۔ ماہرہ کے بہن بھائی شاید اس کو دیکھنے چلے گئے ہیں۔''

''وہ آجائیں تو تم چلی جانا مگر صرف ایک منٹ کے لیے، وہ بہت جلد اسے سرجری میں لے جائیں گے۔''

''اگر میں نہ جاؤں!'' ثریا نے پوچھا۔

''تم اسے دیکھنے آئی تھیں نا!''

Marfat.com

''پتا نہیں...''

''مجھ سے ملنے آئی تھیں!''

''پتا نہیں...'' بس یہ خیال تھا کہ اخلاقاً جانا چاہیے...آپا سے کہا بھی کہ میں کیا کروں گی جا کر، تو انھوں نے زور دیا کہ میں آؤں...''

''ہنھ...'' منظر کے منھ سے نکلا۔

''کیا ہنھ...تم نے ایسے کہا جیسے تم کچھ سمجھ رہے ہو۔''

''ہاں...شاید۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ میری بہتری چاہتی ہیں۔''

''میرا آنا تمھاری بہتری ہے!''

''ان کے خیال میں۔''

''مگر میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ بس تعلقات ہوں تو رسم ہے کہ آدمی ایسے موقعوں پر جائے۔ اور کچھ نہ سمجھنا۔''

''میں سمجھ گیا۔''

''میں نے کہا اور کچھ نہ سمجھنا۔''

''نہیں اور کچھ نہیں سمجھا...''

ثریا ہنس پڑی، وہ مسکرایا۔

دُرِشہوار نے ویٹنگ روم سے دیکھا۔ اطمینان کا ہلکا سا سانس بے خیالی میں لیا اور باہر آئی۔

''اچھا، اب میں بھی ماہرہ کے پاس جا رہا ہوں۔'' منظر نے کہا۔

''ڈاکٹر لاکھ سر پٹیں، ہوتا وہی ہے جو یہاں لکھا ہے۔'' دُرِشہوار نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔

''میں بھی ایک منٹ کے لیے ہو آتی ہوں۔'' ثریا سبک رفتاری سے چلتی،

Marfat.com

دروازے کو دھکیل کر اندر داخل ہوگئی۔ منظر کو اس کے ساتھ جانا اچھا نہ لگا۔ اس نے چند منٹ کا وقفہ دینا مناسب سمجھا۔

''ثریا سے ملے؟'' دُرِشہوار نے تجاہلِ عارفانہ سے پوچھا۔

''جی ہاں...'' منظر نے مختصراً کہا۔

''ویسی کی ویسی ہے، ہلکی پھلکی سی... باتیں بھی ویسی ہی ہیں، عمر تو اس کو چھو کر نہیں گزری...''

''ہاں، شاید...''

''میں اسے مستقل یہاں بلانے کا سوچ رہی ہوں۔''

''اچھا...'' منظر نے کہا، ''وہ تو لندن میں ہے نا اور اس کا شوہر بھی۔''

''ارے شوہر سے تو کب کی طلاق ہوگئی۔ وہ تھا ہی بد ذات۔''

''میرے لیے انکشاف ہے۔'' منظر نے کہا، ''مگر مجھے آپ پر تعجب ہے کیوں کہ آپ کہا کرتی تھیں، قصور ہمیشہ عورت کا ہوتا ہے۔ وہ چاہے تو گھر میں بیٹھی رہ سکتی ہے، چاہے گھر کھنڈر ہو جائے۔''

''ہاں... مگر ثریا نے نہیں چاہا اور اب میں سوچتی ہوں کہ اس جیسی عورت کو کیا ضرورت ہے کسی کے جوتے کھانے کی۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ خوب صورت، پڑھی لکھی اور اپنے پیروں پر کھڑی ہے۔''

''تو دوسری عورتوں کو ضرورت ہے جوتے کھانے کی؟''

''بہت سی عورتوں کی مجبوری ہے... اور بھئی بدکار عورت کو مارنا جائز ہے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ بدکار ہوتی ہیں جو مار کھاتی ہیں۔''

''کوئی اپنی آنکھ سے نہیں دیکھتا مگر دنیا کہتی ہے تو یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔''

''اچھا چھوڑیے، آپ ماہرہ کو دیکھنے آئی تھیں اور آپ نے اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔''

Marfat.com

''تم سے نہیں کی اور کہتی بھی کیا، جب بے چاری نہ زندوں میں نہ مردوں میں... اور بے چاری یہ بھی کہہ چکی ہے ہر ایک سامنے کہ اسے بھرپور زندگی گزارنے کا شوق ہے۔'' انھوں نے آنکھیں چلائیں۔

''ماہرہ آپ کی بھاوج ہے، ایک طرح آپ کو اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔''

''خیال کیوں نہیں... اللہ آپریشن کامیاب کرے... اگر نہ ہوا تو رو دھو لیں گے... صبر آجائے گا۔ مردہ مردوں میں، زندہ زندوں میں... یہی قانونِ قدرت ہے... لو، ثریا آگئی... میں تو اب چلتی ہوں، تم جاؤ تو راستے میں اس کو چھوڑ دینا۔''

''کیا ثریا کی قیام گاہ میرے گھر کے راستے میں ہے؟''

''اس سے پوچھ لینا... مجھے کیا یہاں کے راستوں کا پتا ہے۔ ثریا میں چلی۔ مجھے یہاں سے ایک جگہ قرآن خوانی میں جانا ہے۔''

''مگر میں تو کئی گھنٹے یہیں رہوں گا۔ ماہرہ کے آپریشن کے ختم ہونے تک...''

''تو ثریا کی بھی آج چھٹی ہے۔ کیا کرے گی سارا دن... میں تو شام کو گھر پہنچوں گی۔''

''میں ٹیکسی لے کر اپنے ہوٹل چلی جاؤں گی۔'' ثریا نے کہا۔

''جیسی تمھاری مرضی... خدا حافظ...'' دُرِشہوار نے ایک نظر دونوں پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

☆

اب تو کئی آوازیں ایک ساتھ آرہی ہیں۔ وہ جانی پہچانی ہیں۔ منظر کی اور اس کے اپنے بہن بھائیوں کی۔ کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے۔ کسی نے اس کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ دیا ہے۔

''بس اب آپ سب جائیے پلیز...'' نرس نے کہا۔

''کیا ان کو سرجری کے لیے لے جا رہی ہو؟'' یہ آواز بھی نئی ہے۔

''دیکھو، دیکھو شاید انھوں نے آنکھ کھولی...'' نئی آواز نے کہا، ''مجھے یوں لگا جیسے

Marfat.com

آنکھ کھولی ہو، پلکیں ذرا سی ہلیں، یا شاید نہیں... میرا وہم تھا شاید..."

کیا میں نے آنکھ کھولی تھی۔ جی میں آیا تو تھا کہ دیکھوں یہ نئی آواز کس کی ہے۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں نے آنکھ کھولی تھی۔ شاید... شاید نہیں۔

کیا یہ جواب ساری باتوں پر لاگو ہوسکتا ہے۔

خدا ہے؟

شاید... شاید نہیں... یہ تو کوئی جواب نہ ہوا۔

میری بیماری کا علاج ہے؟ شاید... شاید نہیں۔

یہ جواب نہیں، یہ تو سوال ہے، ابتدا ہے، جواب تو آگے آئے گا۔ جواب میں یقین ہونا چاہیے... ہاں یا نا...

علم یقین ہے، علم الیقین۔

شاید سب چلے گئے... قدموں کی چاپ ڈوب گئی۔

کون تھی وہ... کرید سی ہوئی... یہ کرید ہی علم کا منبع ہے۔

یہ سارے فلاسفر، یہ سائنس داں کریدنے ہی میں تو لگے ہوئے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں یہ؟ جواب!... ایسے جواب جو ٹھیک ٹھیک چول میں بیٹھ جائیں۔ جگ شا پزل (Jig Shaw Puzzle) میں ملتا جلتا ٹکڑا بعض دفعہ تصویر میں لگ جاتا ہے لیکن پوری طرح چول میں ٹھیک ایک ہی ٹکڑا بیٹھتا ہے جو اس جگہ سے کاٹا گیا ہے... کیا جوابات سوالات میں سے کاٹے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ایک نہ ایک دن وہ تصویر ضرور مکمل ہوجائے گی۔ شرط یہ ہے کہ سارے ٹکڑے مل جائیں... اتنی قابلیت ہو کہ ان ٹکڑوں کو پہچان سکیں اور اتنا وقت کہ ان کو ان کی جگہ پر لگا سکیں۔ شرائط سخت ہیں۔ کیا کبھی انسانی نسل کو سارے ٹکڑے، پوری قابلیت اور اتنا وقت میسر آسکے گا۔ شاید... شاید نہیں۔

شاید اس وقت جب اسے تصویر مکمل کرنے کی لگن ہوگی اور وہ اپنا وقت اس کام میں لگانا پسند کرے گا... اگر وہ تخریبی کاموں میں لگا رہا تو شاید نہیں۔

مجھے اسٹریچر پر ڈال کر کہیں لے جا رہے ہیں۔ کہاں لے جا رہے ہیں؟ میں

پوچھ نہیں سکتی۔ صرف قیاس کرسکتی ہوں۔ گمان اور قیاس آرائی کیا ہے۔ قیاس آرائی، سوچ اور علم میں کیا فرق ہے...!؟

شاید علم جاننا ہے۔ جاننے کی کوشش کرنا سوچ ہے۔ سوچ کسی امرِ واقع (fact) پر مبنی ہوگی۔ قیاس کی بھی کوئی نہ کوئی بنیاد تو ہوتی ہے، مثلاً مجھے اسٹریچر پر ڈال کر لے جا رہے ہیں، یہ بنیاد ہے۔ کسی دوسری جگہ منتقل کررہے ہیں، یہ سوچ ہے۔ یہ امرِ واقع بھی ہے۔ شاید وہ مجھے دوسری منزل پر لے جارہے ہیں یا شاید آپریشن تھیٹر میں... یہ قیاس ہے۔ سوچ میں یقین کا عنصر زیادہ ہوا... قیاس میں تخیل کا...

کیا سائنس سوچ کے بل پر چلتی ہے اور آرٹ قیاس پر پھلتا پھولتا ہے...؟

اور فلسفہ...!

فلسفہ قیاس کو سوچ بنا دیتا ہے۔ ایک بنیاد پر محل بناتا چلا جاتا ہے۔ وہ یقینی ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی... فلسفی کو سائنس داں کی طرح نہیں کہنا چاہیے کہ یوں ہے، یوں ہے... یوں ہے... اسے کہنا چاہیے، شاید یوں ہے... شاید یوں ہو... مگر ایسے فلسفی کو فلسفی کون مانے گا... شاید ہنسی آگئی تھی۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی...'' نرس نے کہا۔

''تم اس کے reflexes کا پورا ریکارڈ رکھ رہی ہونا...''

''جی... مگر بعض دفعہ کہنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ ہوا یا نہیں۔ مسکرائی یا نہیں، شاید روشنی پڑی ہو اس کے ہونٹوں پر...''

''شاید۔'' ڈاکٹر بولا، ''پھر بھی جو تم محسوس کرو، لکھتی رہو، یہ ضروری ہے۔ یہ عام مریضہ نہیں ہے۔ ایسے کیس بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔''

گویا میں بھی کسی بڑی تصویر کا کھویا ہوا کوئی چھوٹا سا حصہ ہوں جو شاید میڈیکل کی کسی تصویر میں فٹ ہوجائے۔ اب جو کچھ مجھ پر بیت رہی ہے، نہیں معلوم کہ کتنا امر واقع ہے اور کتنا قیاس...

حقیقت یا امرِ واقع کی بنیاد کیا ہے؟

انسانی حواس... نرس نے سمجھا میں مسکرائی۔ پھر قیاس کیا کہ شاید کھڑکی سے روشنی کی رمق پڑی۔ انسان جو کچھ جانتا بوجھتا ہے، اس کی بنیاد حواس ہیں اور حواس... ناقابلِ اعتبار ہیں۔ اور بھی کئی پیچیدہ نکتے ہیں۔ انسان کے اپنے عقائد، توہمات، حواسوں کی کیفیت اور کسی خاص وقت میں کسی خاص حس کی کیفیت، پھر روشنی، انہماک، توجہ اور فاصلے... ویسے بھی... ویسے بھی حواس تو محض پیغام رساں ہیں۔ پیغام کو سمجھنے کا کام... کوڈ کو جاننے کا تو ذہن کرتا ہے اور پیغام صاف نہیں ہے تو غلطی کا امکان ہے... تبھی تو ایک ہی واقعے کو لوگ مختلف طریقوں سے دیکھتے ہیں۔ ہر شخص اپنے بیان کو صحیح اور دوسرے کے بیان کو غلط سمجھتا ہے۔ اب مجھے دیکھ کر لوگ کیا کہہ رہے ہیں... کچھ کا خیال ہے کہ میں تقریباً مر چکی ہوں... کچھ کا خیال ہے کہ میں ذہنی طور پر بیدار ہوں لیکن میرا جسم تقریباً بے کار ہو چکا ہے... بعض لوگ کہتے ہیں، دل جب تک چلے، سانس جب تک آئے آدمی زندہ ہے، خواہ وہ سانس اپنا ہو یا مشین کا دیا ہوا... نرس کا خیال ہے کہ میرے جسم میں حرکت ہے، کبھی پلکیں ہلتی ہیں، کبھی ہونٹ مسکراتے ہیں۔

''ڈاکٹر دیکھا... ابھی پھر اس نے ہونٹ سکیڑا... نئے پیدا شدہ بچے کی طرح جو آپ ہی آپ مسکرا دیتا ہے۔''

اب کچھ دیکھنے سننے کا وقت نہیں... سرجری کی تیاری مکمل ہے، کام شروع کرو... پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے... یہ کم بخت رشتے دار... ہم فارم چھپوا کر بانٹتے رہتے ہیں کہ اپنی قسمتوں کا فیصلہ باہوش و حواس کر جاؤ... ہمیں بتا جاؤ کہ تم بولنے کے قابل نہ رہو تو تمھارے ساتھ کیا کریں اور کیا نہ کریں مگر یہ لوگ سنتے ہی نہیں...

☆

اندھیرا... گہرا اندھیرا... اور گہرا اندھیرا...

کیا یہ موت کا اندھیرا ہے؟... نہیں بلکہ بہت ہلکی باتوں کی بھنبھناہٹ سی آ رہی ہے۔ شاید فرشتے کچھ کر رہے ہیں یا ڈاکٹر اور نرسیں... حساب کتاب؟ یا آپریشن... کیا میں زندہ ہوں؟ کیا میرا ذہن اب بھی کام کر رہا ہے؟ یا میں مر چکی ہوں؟ سوال یہ ہے کہ موت

Marfat.com

کی اس عظیم نظام میں کیا جگہ ہے؟ کیا بڑے سسٹم سے الگ کوئی چیز ہے! نہیں موت تو پیدائش سے جڑی ہوتی ہے۔ اس کا منطقی انجام ہے۔ پیدائش، موت، پیدائش یہ زندگی گردشِ مکرر (recycling) ہے۔ موت بڑے سسٹم میں فٹ آتی ہے تو کیا دکھ اور تکلیف نہیں آتی؟... مگر دکھ اور تکلیف کا پلڑا جھکا ہوا ہو تو پھر وہ موت سے وابستہ ہوئے زندگی سے نہیں۔ اسی لیے تو میں زندگی کو بھرپور، غیرملوث گزارنے کی قائل ہوں۔ زندگی کا معیار دیکھیے نہ کہ مقدار... جب دکھ اور بیماری کا پلڑا جھک کر موت کی سمت چلا جائے تو سکون سے، خوشی سے، بلند ہمتی سے اُدھر چلے جاؤ۔ ایک سفر ہے جو ہر ایک کو کرنا ہے، پہلے کیا تو کیا بعد میں کیا تو کیا... صفر کے نکتے پر ٹھہرے ہوئے اگر پلڑا ابد کی طرف جھک گیا تو آپ نے ابد کو آداب کیا اور اُدھر کو ہولیے... کیوں کہ میرے نزدیک اُدھر پلڑا جھکنے کا مطلب یہ ہے کہ اب زندگی کی روئیدگی ختم ہوئی۔ وہ کھاد بننے کے لیے تیار ہے۔ بعض اوقات ہرے بھرے پودوں کا کھاد بننا اچھا نہیں لگتا مگر زندگی کی روئیدگی ختم ہوجائے تو مجبوری ہے... جب پودے کی جڑیں زمین سے نکل پڑیں تو انھیں برتن میں پانی ڈال کر رکھنا بے معنی ہے۔ یہ تو مصنوعی زندگی ہے... لیکن کبھی کبھی برتن میں جڑیں دوبارہ پھوٹ آتی ہیں اور پودے کو دوبارہ زمین میں لگایا جاسکتا ہے۔ اب مصنوعی زندگی اور اصل زندگی کا فیصلہ کون کرے...!!

اگر یہ پتا چل جاتا کہ زندگی کا اصل مقصد کیا ہے اور موت کے اصل معنی کیا ہیں تو شاید یہ طے کرنا آسان ہوجاتا مگر جب تک یہ طے نہیں ہے یا ان پر ایک رائے نہیں ہے، جوابوں میں اختلاف رہے گا اور جب تک اختلاف رہے گا، یہ فیصلہ نہیں ہوسکتا کہ زندگی کب ختم کردینی چاہیے یا کب سمجھ لیا چاہیے کہ زندگی اپنے منطقی انجام کو پہنچی... ابھی تو یہ فیصلہ بھی نہیں ہوا کہ اس فیصلے کا حق کس کو ہے... قدرت کو، اس انسان کو جس زندگی ترازو میں ہے، ڈاکٹر کو، مذہبی پیشوا کو یا حکومت کو۔ اگر بیمار انسان کو فیصلے کا حق ہے تو وہ کئی مرتبہ یہ فیصلہ دے چکی ہے۔ لیکن شاید اس کا یہ حق ابھی تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔

☆

اسپتال کے کیفے ٹیریا میں ثریا کے ساتھ چائے پیتے ہوئے منظر کو خیال آیا کہ وہ خود وہی کر رہا ہے جس کے طعنے ماہرہ کو دیتا تھا۔ وہ صفائی میں کہتی تھی... میں تنہائی میں کسی کے ساتھ چائے نہیں پیتی ہمیشہ گروپ میں ہوتی ہوں۔ لیکن وہ یقین نہیں کرتا تھا۔ آج وہ ثریا کے ساتھ تنہا چائے پی رہا ہے جب کہ وہ آپریشن تھیٹر میں ہے... کیا وہ ماہرہ کو بتائے گا؟

شاید... شاید نہیں... اور وہ کون سی ہر بات بتاتی ہی ہوگی۔ صرف ظاہر کرتی ہے... خیر دیکھا جائے گا... ذکر آئے گا تو بتا بھی دے گا... ایسی بڑی بات کون سی ہے۔ ظاہر ہے جب وہ ماہرہ کو دیکھنے آئی تو میرے ساتھ ہی بیٹھے گی... اور یہ تو ایک دن کی بات ہے، وہاں تو روز کا قصہ ہے... پھر اتنے گھنٹے تنہا جوکھیاں مارتا۔ اب وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی ہیں تو بوجھ ہلکا سا ہوگیا ہے۔ آپریشن کی طرف سے دھیان ہٹ جاتا ہے اور انصاف کی بات ہے کہ اچھا لگ رہا ہے۔ شاید اس کو بھی اچھا لگتا ہوگا۔ میں تو صرف ایک مرتبہ ہی ملوں گا... وہاں تو روز ہی ہوتا ہے۔ ساتھ کام کرتے ہیں۔ کچھ تو بڑھوتری ہوتی ہوگی۔ سب سادھو تو ہو نہیں سکتے... اور وہ کون سی ایسی ستی ساوتری ہے۔ کیسی کڑواہٹ سے کہہ رہی تھی دُرِشہوار کہ بھئی وہ تو "بھرپور" زندگی گزارنے کی قائل ہے... پر ان دوستوں سے یارانے بہت پکے ہیں... شاید اس لیے کہ وہ اس کے رازوں کی امین ہیں، یہ ان کے رازوں کی امین ہوں گی... ساری حرکتوں سے واقف ہوں گی... مگر اب کیسی بے حس و حرکت پڑی تھی... زندگی اور موت کے بیچ... پتا نہیں کہا کیا کرتی تھی کہ بیچ میں یہ ہے... ایک طرف یہ ہے، دوسری طرف وہ ہے... خدا جانے کیا کہتی رہتی ہے۔ میں ہاں ہاں کہتا رہتا ہوں، سنتا نہیں... سن بھی لوں تو مغز ماری کون کرے۔ بھلا ایسی فضول باتوں میں دماغ کھپانے کی ضرورت کیا ہے؟ کہتی ہے، میں Epicurus ہوں۔ میں اس بات کو مانتی ہوں کہ خالص خوشی دکھ کے نہ ہونے کا نام ہے۔ اس کو کہتے ہیں اپونیا (aponia) اور روح کے سکوت کو کہتے ہیں ایٹریکسیا (atraxia)۔ میں نے کہا، اپنی بیٹیوں کے یہی نام رکھ لینا، اچھے نام ہیں۔ تب مجھے مارنے لپکی... مگر یہ بھی پرانی بات ہے۔ اب وہ ایسی باتیں مجھ

سے کم ہی کرتی ہے۔ آسان زبان میں بات کرتی ہے، شاید کسی اور سے ہوتی ہیں اب ایسی باتیں۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''کچھ نہیں... ماہرہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''ظاہر ہے...اس کے آپریشن کے بارے میں پوچھ لو کسی سے۔''

''نہیں... ختم ہونے پر ڈاکٹر آن کر خود ہی بتائے گا۔''

''پھر کچھ بات کرو، سوچتے رہنے سے کیا ہوگا...''

''ہاں بات کرتے ہیں...تم سناؤ، تمھاری شادی کیسی رہی؟''

''جیسی سب شادیاں رہتی ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''شادی بھی زندگی کی طرح ہے، مختلف منزلیں آتی ہیں۔ جیسے جوانی، بڑھاپا، موت... کسی پر جوانی زیادہ دن رہتی ہے، کہیں بڑھاپا...''

''تم بھی ماہرہ کی طرح باتیں کررہی ہو۔ ایسی باتیں کم سمجھ میں آتی ہیں میرے۔''

''کند ذہن ہوگئے ہو، پہلے تو اچھے خاصے تھے۔''

''نہیں، شاید تم زیادہ ہوشیار ہوگئی ہو۔''

''یہ بھی ہوسکتا ہے۔ زندگی ہر ایک کو کچھ نہ کچھ سکھاتی ہے۔ تم نے کوئی سبق سیکھا؟''

''میں نے یہ سیکھا کہ عورتیں مردوں سے بہت زیادہ سیکھ لیتی ہیں زندگی میں...''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ ان کا ادب کرنا چاہیے۔''

''نہیں ان سے ڈر کر رہنا چاہیے۔''

''یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔اچھا اس سے پہلے کہ ماہرہ کے بہن بھائی واپس آئیں، مجھے چلنا چاہیے۔''

''چلو میں چھوڑ آتا ہوں۔''

☆

Marfat.com

جھولا... غنودگی... شور... ہلچل... خاموشی... پھر جھولا... پھر غنودگی... پھر شور... پھر خاموشی... یہ کیا ہے؟

ہوش میں آئی تو اسے اپنے ذہن کی کیفیت یاد آنے لگی۔ ذہن میں زندگی اور موت، معیار اور مقدار کا جو جھگڑا چل رہا تھا، وہ پوری طرح نہیں تو کسی حد تک موجود تھا۔ ڈاکٹر recovery room میں کئی مرتبہ جھانک کر گیا تھا۔ اس نے کسی نرس کو نہیں بھیجا تھا۔ وہ اس سے ضروری بات کرنا چاہتا تھا۔

''مسز منظر! میں ایک بہت اہم بات کہنے والا ہوں۔ اس کے لیے آپ کو بہت بہادر بننا ہوگا...''

''آپ کو جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالیے، میں بہادر ہوں اور ہر قسم کی بات سننے کے لیے تیار ہوں۔''

''میں آپ کو ساری بات سچ سچ بتا رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے مسز منظر کہ آپ بہادر ہیں... بات یہ ہے کہ آپ کا زخم زہر باد بن گیا ہے اور ساری ٹانگ میں پھیل گیا ہے... ہمیں آپ کی جان بچانے کے لیے یہ ٹانگ کاٹنی ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ موجودہ سائنسی ترقی کی ایجادوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے rehabilitation کے بعد آپ جیسی باہمت عورت نارمل زندگی گزار سکتی ہے۔ اگر فوری آپریشن نہ ہوا تو آپ کی زندگی بے حد خطرے میں ہے۔''

''تو میں زندہ ہوں اور فیصلے کا لمحہ میرے سامنے ہے۔'' ماہرہ سوچتی ہے اور آنکھیں بند کر کے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا... ڈاکٹر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا ہے... پھر ماہرہ نے اپنی آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور کہا۔

''ڈاکٹر! میں زندگی میں بہت چھوٹی چھوٹی باتوں اور چیزوں کی عاشق رہی ہوں۔ ایک چھوٹی سی خوب صورت تتلی، خوب صورت پتھر، اچھی پینٹنگ دیکھ کر جتنا خوش ہوتی تھی، لوگ مجھ پر ہنستے تھے۔ آپ سمجھتے ہوں گے، ایسے لوگ زندگی سے منہ موڑ کر موت کو ترجیح نہیں دیں گے مگر میں ہمیشہ سے مختصر اور بھرپور زندگی گزارنا چاہتی تھی۔ میرا

Marfat.com

فیصلہ یہی ہے کہ آپ مجھے اپاہج نہ ہونے دیں... میرا علاج کرتے رہیے اگر فائدہ ہوگیا تو ٹھیک ہے، ورنہ جو خدا کو منظور ہو..."

"میں آپ کو مرض کی شدت بتا چکا ہوں، اس طرح یہ فیصلہ موت کو دعوت دینا ہے۔"

"تو یہی سہی..." ماہرہ نے دھیرے سے کہا۔

"میں تو آپ کو طاقت ور سمجھتا تھا، آپ تو کم زور نکلیں۔"

"ہوسکتا ہے آپ کی طاقت کا تصور میرے تصور سے الگ ہو۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کو مارنے کے لیے طاقت کی ضرورت ہوتی ہے، خود مرنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہوتی ہے... میں ہمت کو طاقت سے برتر سمجھتی ہوں۔ طاقت نظر آتی ہے، ہمت نظر نہیں آتی۔ لوگ طاقت سے ڈرتے ہیں مگر ہمت والے سے ہار جاتے ہیں۔ طاقت نے لوگوں کو سولی پر چڑھایا مگر تاریخ نے ان لوگوں کو یاد رکھا جو ہمت سے سولی پر چڑھ گئے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ طاقت سطحی ہے، ہمت بنیادی، گہری اور اصل چیز ہے۔"

"مگر بات یہ ہے بیگم منظر کہ جینے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے اور مرنے کے لیے بزدلی کی... مسلسل ہمت جو نہ کرسکے وہ ایک بار جی کڑا کر کے زندگی کی سرحد پھلانگ لے، یہ ہمت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نادان اور نوجوان لوگ زیادہ خودکشی کرتے ہیں۔ وہ زندگی سے مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اور فرار کی راہ اختیار کرتے ہیں۔"

"آپ گویا زندگی کے معیار کے قائل نہیں، مقدار کے قائل ہیں۔"

"میں اس بات کا قائل ہوں کہ جو لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی صرف ان ہی کی ہے اور وہ اسے جس طرح اور جب چاہیں، ختم کرسکتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ ہر زندگی کے ساتھ دوسری زندگیاں بندھی ہوئی ہیں اور ایک زندگی ختم ہونے سے بہت سی زندگیوں پر اثر پڑ سکتا ہے۔ اس لیے دوسروں کا بھی خیال کرنا چاہیے۔"

"آپ نے تو زندگی کو کھیل بنا دیا کہ جب کوئی بچہ کھیل چھوڑ کر جائے تو باقی چلاتے ہیں۔ کہاں چلے ہماری باری دے کر جاؤ... یہ کیا بات ہوئی۔ زندگی کا کھیل پورا

Marfat.com

کھیل کر جاؤ، چاہے اس سے پہلے مٹی میں مل جاؤ۔ خواہ مخواہ کا دباؤ... آدمی مرتا ہی ہے، قدرتی مرے تب بھی آہستہ آہستہ صبر آجاتا ہے اور میرے نزدیک یہ بھی قدرتی موت ہے۔ چند دن لوگ باتیں ضرور بنائیں گے۔ دوست افسردہ ہوں گے، دشمن خوش ہوں گے...لیکن میں اپنے فیصلے پر قائم ہوں اور ہاں، آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میں نے اپنے تمام اعضا، دل، دماغ، گردے اور آنکھیں donate کردی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ڈاکٹر نے افسردگی سے کہا،'' آپ اچھی طرح سوچ لیجیے... ابھی تو آپ کا دل، دماغ، گردے، آنکھیں سب کام کر رہی ہیں۔ ایک ٹانگ کا نہ ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آج کل ہر قسم کی سہولتیں میسر ہیں۔ آپ جیسی ذہین خاتون کو زندگی میں کیا کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے، سوائے اس خیال کے کہ آپ کو جسمانی طور پر مکمل اور خوب صورت ہونا چاہیے؟''

''نہیں میرا خیال ہے کہ زندگی میں جو کچھ کرسکتی تھی کرلیا۔ ہمیشہ اوپر کی طرف چڑھتی رہی، اب نشیب میں جانے کی باری ہے تو قطرہ قطرہ کیوں گروں، ایک دم کیوں نہ لڑھک جاؤں۔''

''زندگی کو آپ نے کس طرح سمجھا ہے مسز منظر؟''

''زندگی میرے نزدیک ایک بہت بڑی تصویر ہے جس کے ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں۔ دو ٹکڑے ہمیں لگانے ہیں... ہر شخص کو، ہر نسل کو، ہر صدی کو... کام بہت بڑا ہے۔ لوگ آتے جائیں گے اور اپنا کام کر کے جاتے جائیں گے... مثلاً ایک ٹکڑا ''سچ'' کا ہے۔ ہر مذہب، ہر فلسفہ، ہر نیک شخص یہی کہتا ہے کہ ہمیشہ سچ کی فتح ہوتی ہے۔ لیکن کیا اس صدی میں یہ ہو رہا ہے...نہیں، تو پھر یہ مستقبل کا ٹکڑا ہے، اسے سنبھال کر رکھنا ہوگا۔ کبھی مستقبل میں اپنی جگہ لگے گا... ابھی تو دنیا بھر کی برائیاں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں، غلامی اور ستی کی رسم مٹ گئی لیکن استحصال کئی شکلوں میں اب بھی موجود ہے۔ عورتوں کا استحصال مردوں کے ہاتھوں، کم زوروں کا استحصال طاقت وروں کے ہاتھوں، لاقانونیت استحصال کر رہی ہے قانون کا... میرے خیال میں انسانیت کا مکمل چربہ وہی ہوگا

Marfat.com

جب یہ سب ختم ہو جائے گا... سچ کی فتح کا ٹکڑا اپنی جگہ... انصاف کے بول بالا ہونے کا ٹکڑا اپنی جگہ انسانوں کی برابری کا ٹکڑا اپنی جگہ لگ جائے گا۔ یہ ہماری نسل، ہماری صدی کا مقدر نہیں ہے۔ نامعلوم کس صدی کا مقدر ہے۔ اس لیے کم از کم میں اپنی جگہ کسی بہتر آدمی کے لیے خالی کرنے کو تیار ہوں۔''

''کیا آپ نے اپنے حصے کا ٹکڑا لگا دیا؟''

''جی ہاں، میرا خیال ہے۔''

''خیال سے کام نہیں چلے گا، یقین کی بات کیجیے۔''

''ہاں، جو کچھ کرنا تھا، کر چکی... جو کچھ لینا دینا تھا، لے دے چکی۔''

''کس کو؟''

''دنیا کو۔''

''تو آپ آج کے انسان سے مایوس ہیں...''

''نہیں... مگر میرا خیال ہے کہ اُسے بھی صحیح معنوں میں اشرف المخلوقات بننے کے لیے بہت صدیاں درکار ہیں۔''

''تو پھر فیصلہ کیا ہوا؟''

''بتا تو دیا... اگر آپ میرے علاج سے مایوس ہیں، تو میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔''

''گویا باتیں مثبت کی ہوتی رہیں اور فیصلہ نفی میں ہوا۔''

''موت کو نفی کیوں کہتے ہیں، آپ... موت زندگی کی بڑھی ہوئی ڈور سمجھ لیجیے۔ موت زندگی سے الگ کوئی چیز تو نہیں ہے... اگر آپ زندگی کو بڑے کینوس کی شکل میں دیکھیں۔ کھاد سے ہی تو روئیدگی پھوٹتی ہے۔''

''اچھا... تو میری بات غور سے سنیے... میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کسی بھی ذی روح کو زندگی مل رہی ہو اور وہ موت کا فیصلہ کرے۔ میرے پاس وقت کم تھا، میں نے منظر صاحب سے آپریشن کے کاغذ پر دستخط کروائے اور آپریشن کر دیا۔ اس وقت آپ

آپریشن کے بعد کی بے ہوشی سے ہوش میں آئی ہیں... میرا خیال تھا کہ آپ کو زندگی اور موت کے درمیان چند منٹ ملیں گے تو آپ زندگی کو ترجیح دیں گی اور میں خوش ہوکر بتاؤں گا کہ ہم آپریشن کر چکے ہیں لیکن اب جو ہونا تھا، ہوچکا۔ اس فیصلے میں، میں اکیلا نہیں تھا اور بھی بہت سے لوگ شریک تھے۔''

ماہرہ کا رنگ زرد پڑ گیا... ''اس کا مطلب ہے کہ میری ٹانگ...'' اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ڈاکٹر کو محسوس ہوا جیسے وہ پھر بے ہوش ہونے والی ہے... ڈاکٹر نے اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور آہستہ آہستہ کہنے لگا:

''مسز منظر! اگر آپ اس کو اتنا ہی غلط سمجھتی ہیں تو میں اس کی تلافی کرنے کو تیار ہوں۔''

ماہرہ نے آنکھیں کھولیں۔ یہ کہہ کیا رہا ہے ڈاکٹر...!؟

''لوگ یہی سمجھ لیں گے کہ آپریشن کامیاب نہیں ہوا۔ آپ جان رہی ہیں نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میری زندگی بھی قابلِ رشک حد تک کامیاب رہی ہے اور میں نے زندگی میں بہت کم غلط فیصلے کیے ہیں لیکن آپ اسے صحیح نہیں سمجھتیں تو وہ بھی ہوسکتا ہے جو آپ چاہتی ہیں... چند منٹ آپ کو بناوٹی طور پر بے ہوش رہنا ہوگا اور آخر میں چپ چاپ اپنا کام کرنے کے بعد میں یہ تاثر دے سکتا ہوں کہ آپ ہوش میں نہ آسکیں... آپ کی پہلے کی حالت دیکھتے ہوئے کسی کو یہ ماننے پر تامل نہیں ہوگا۔ ایک مرتبہ اور سوچ لیجیے، اب میں صرف پندرہ منٹ آپ کو دیتا ہوں۔ اس دوران کوئی یہاں نہیں آئے گا۔''

یہ کہہ کر دروازہ بند کر کے ڈاکٹر تیزی سے باہر نکل گیا۔

☆

پندرہ منٹ بعد ڈاکٹر واپس آیا۔

''کیا کہتی ہیں آپ؟'' اس نے آہستہ سے ماہرہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔

''میرا ووٹ زندگی کے حق میں ہے۔'' ماہرہ نے کہا۔

''زندگی زندہ باد...'' ڈاکٹر نے ماہرہ کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''میں آپ سے یہ نہیں

پوچھوں گا کہ آپ نے یہ فیصلہ کیوں کیا، کہ زندگی اپنا جواب آپ ہے۔''

''مگر میں نے مشینوں سے عارضی زندگی لینے کو منع کیا تھا، آپ نے مجھے خودکشی کرنے کا حق دیا۔''

''اس لیے کہ میرے خیال میں آپ کا پہلا فیصلہ بھی خودکشی ہی تھا۔''

''اور بعد میں آپ مجھے جان سے مارنے پر تیار ہوگئے۔''

''آپ جان سے اتنی بیزار تھیں تو اور کیا کرتا...'' ڈاکٹر مسکرایا۔

''تو کیا آپ سچ مچ مجھے مار دیتے؟''

''اس پر پھر کبھی بحث کریں گے مسز منظر... اب تو ساری زندگی پڑی ہے ہمارے پاس بحث کرنے کے لیے...'' ڈاکٹر نے آنکھ ماری۔ ''جان لیوا تو یہ پندرہ منٹ تھے جو گزر گئے۔''

''پھر بھی... مجھے یقین نہیں کہ آپ مجھے جان سے مار دیتے۔''

''نہیں... میں کوئی اور ڈراما کھیلتا۔''

''مثلاً...''

''مثلاً... کہ کوئی وکیل آپ کے پاس آتا اور کہتا کہ اس نے اتفاقاً ہماری باتیں سن لی ہیں اور یہ کہ آپ کے حقوق بری طرح پامال ہوئے ہیں، چناں چہ وہ آپ کو نہ صرف انصاف دلوائے گا بلکہ اچھی خاصی رقم بھی... وہ آپ کو ایسی لچھے دار باتوں میں الجھاتا اور ڈاکٹروں سے انتقام لینے کی ایسی میٹھی باتیں کرتا کہ آپ اس کے دام میں آجاتیں اور مرنا ورنا سب بھول جاتیں۔''

''اچھا... ڈاکٹروں کے ہاں یہ بھی ہوتا ہے۔''

''جو کچھ سارے معاشرے میں ہو رہا ہے، وہ ہر جگہ ہوسکتا ہے۔ لیڈر اور مذہبی رہنما نہیں بچتے تو ہم سوسائٹی سے الگ تو نہیں۔''

''اگر اگر میں مقدمہ دائر کر دیتی تو...''

''تو ہم اپنا نام اور وقت بچانے کے لیے کچھ دے دلا کر کورٹ سے باہر فیصلہ

کر لیتے... اگر آپ اس پر آمادہ نہ ہوتیں تو مقدمہ کورٹ میں جاتا اور آپ ہار جاتیں۔ کیوں کہ آپ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی کوئی تحریر ہمارے پاس نہیں پہنچی تھی۔ آپ کے شوہر نے آپریشن کے کاغذ پر دستخط کر دیے تھے اور اس لیے بھی کہ ابھی آپ کے جیسے خیال رکھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ جیوری ہو یا جج فیصلہ ہمارے حق میں ہی ہوتا۔"

"تو ہر طرح آپ جیتتے اور جیتے بھی..."

"اسی جیت میں آپ کی بھی جیت ہے مسز منظر... زندگی سے آپ مایوس نہ ہوں تو وہ کبھی آپ کو مایوس نہیں کرتی۔ آپ کو تو بہت کام کرنے ہیں ابھی۔ آپ انسانوں سے، آنے والی صدیوں سے مایوس نہیں... آپ میں ہمت ہے تو آپ کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ دوسروں کو مایوسی سے نکالیں۔"

"میں خود بہت مایوس ہوں ڈاکٹر، بہت depressed..."

"میں سمجھتا ہوں مگر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب آپ آرام کیجیے، تھوڑی دیر میں آپ کو آپ کے کمرے میں پہنچا دیا جائے گا اور مسٹر منظر آپ کو دیکھنے آ سکیں گے۔"

☆

"پیڈل پر پاؤں رکھو... پیڈل پر... میں کیا کہہ رہی ہوں؟"

یہ کون اتنی کرخت آواز میں بول رہا تھا۔

ماہرہ نے وہیل چیئر کے پیڈل پر پاؤں رکھے۔ کسی نے پیچھے سے اسے دھکیلا۔

"کیوں... کہاں لے جا رہی ہیں آپ مجھے؟"

"کنویں میں دھکیلنے اور کہاں... تم تو اپاہج بن کر جینا نہیں چاہتی تھیں نا... تو اب کیوں دم نکل رہا ہے..."

دُرِشہوار جھٹکے دیتی، دھکیلتی اسے دوسرے کمرے میں لے گئی اور کھانے کی میز کے پاس کھڑا کر دیا۔ "یہ ٹوسٹر میز پر رکھا ہے۔ توس سینک کر رکھو میز پر... بہت حرام کی کھالی، اب حرام نہیں چلے گا..."

''اس سے پہلے کہ میں آپ کا حکم مانوں، مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اس گھر میں کون کون رہ رہا ہے اور کس حیثیت سے؟''

''کون رہے گا... منظر، میں اور ثریا۔''

''آپ دونوں اتنے دن سے اس گھر میں رہ رہی تھیں؟''

''تھیں نہیں، اب بھی رہ رہی ہیں۔ گھر کا گھروا ہو رہا تھا۔ میاں تمھارا، تمھاری نعش کے پاس دن رات بیٹھا رہتا تھا، میں اور ثریا آگئے دیکھ بھال کے لیے..''

''مگر ایسی کون سی دیکھ بھال...''

''زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں، ساری دنیا کو معلوم ہے کہ عورت کے بغیر گھر نہیں چلتا۔''

''آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں...؟''

''میں کیا کر رہی ہوں، سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ منظر کو بھی اب پتا چل گیا ہے کہ ثریا تم سے کہیں بہتر بیوی ثابت ہوگی۔''

''اور وہ یقیناً آپ کو بھی ٹھکانا دینے کو تیار ہوگی، اس سب کے بدلے جو آپ کر رہی ہیں۔''

''جو جی چاہے سمجھ لو... ویسے بھی میرے بھائی کا گھر ہے، کسی کا احسان نہیں ہے۔''

''آپ کے اپنے کئی سگے بھائی بھی تو ہیں۔''

''تو میری مرضی... جہاں چاہوں رہوں، تمھارے گھر آؤں تب کہنا۔''

''گویا یہ میرا گھر نہیں ہے۔''

''تھا کبھی... اب نہیں ہے نہ آئندہ ہوگا۔''

''منظر نے تو یہ نہیں کہا۔''

''تم نے اسے کچھ کہنے سننے کے قابل چھوڑا ہی کب تھا۔ تم ہی اس کی زبان تھیں، تم ہی اس کی آنکھ اور کان...''

''اور اب؟''

''اب اس کی آنکھوں پر سے پردہ ہٹ گیا ہے۔ یہ اس کی بھلمنساہٹ ہے کہ پھر بھی اس نے اب تک تم سے کچھ باز پرس نہیں کی۔''

''باز پرس...! کس بات کی؟''

''بھولی نہ بنو... میں بھی جانتی ہوں، تم بھی جانتی ہو تو پوچھنے سے فائدہ۔''

''میں شاید نہیں جانتی۔'' ماہرہ نے کہا۔

''تو خاموش رہو... اسی میں بہتری ہے۔''

''کس کی؟''

''تمھاری۔''

''مگر آپ تو خاموش نہ رہیں۔ آپ نے جھوٹی سچی تہمتیں دھریں اور کسی کا گھر اجاڑنے میں بھی آپ کو عار نہیں۔''

''یاد کرو... تم نے پہلے میری بہن کا حق مارا بلکہ اس غریب کو زندہ درگور کیا اور تمھیں افسوس ہوا؟''

''مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ آپ کی بہن کا منظر سے کوئی تعلق ہے۔ مجھے کسی نے نہیں بتایا۔''

''یہ تمھارے بھولپن اور جھوٹ کا جادو مجھ پر نہیں چل سکتا، سارے زمانے کو معلوم تھا۔''

''مگر مجھے معلوم نہیں تھا کیوں کہ میں ملک سے باہر تھی۔ وہیں منظر مجھ سے ملے اور انھوں نے مجھ سے چھپایا پھر بھی آپ کی نظروں میں گناہ گار وہ نہیں، میں ہوں۔''

''جو حق چھینتا ہے، وہ گناہ گار ہوتا ہے۔''

''منظر نے کچھ نہیں کیا؟''

''وہ تمھارے ہتھ کنڈوں کے آگے ہار گیا۔''

''اور آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کے ہتھ کنڈوں کے آگے ہار جاؤں۔''

Marfat.com

''جو جیسا کرتا ہے، ویسا بھرتا ہے۔''

''میں بھی عورت ہوں، آپ بھی اور ثریا بھی... ایک مرد نے ہم تینوں کے ساتھ زیادتی کی اور ہم ایک دوسرے کو سزا دیتے رہے اور اس مرد کو نوازتے رہے۔ کیا کبھی آپ نے اس بات پر غور کیا؟''

''غور و فکر تم کیا کرو... میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ اگر منظر کو پہلے ثریا کی پروانہ ہوتی تو اب بھی نہ ہوتی۔''

''آپ نے اسے مظلوم بنا کر پیش کیا۔ میرے خلاف ایسی باتیں کیں کہ اس کا ذہن پھر گیا۔ حالاں کہ دل میں وہ بھی خوب جانتی ہے کہ زیادتی اس کی ہے۔ اگر آپ میرے خلاف یہ سب نہ کرتیں..''

''تو تم بھی کرلو...''

''میں نچلے ہتھ کنڈوں کی قائل نہیں ہوں۔''

''قائل نہیں ہو تو بھگتو... یوں کہو کہ کورے کپڑے پر رنگ چڑھ گیا تھا مگر اب نہیں چڑھے گا۔''

''بقول آپ کے کپڑا تو پہلے بھی کورا نہیں تھا، رنگ تو پہلے بھی چڑھا ہوا تھا۔''

''مگر ثریا کی دوری سے اور تمھاری حرکتوں سے کٹ گیا تھا، اب یہ نہیں ہوگا... اب میں یہاں ہوں، اس کی دیکھ بھال کے لیے... اور ثریا ماشاء اللہ ثابت و سالم ہے۔''

''اچھا... مگر آپ یہ بھول رہی ہیں کہ ان کی فقط بات چیت طے ہوئی تھی، ہماری شادی بہت پرانی ہے۔''

''پرانی چیز بوسیدہ ہو جاتی ہے اور ہو چکی ہے۔ میں جان گئی ہوں ماہرہ بیگم۔''

''ثریا اور منظر کا تعلق تو اس سے بھی پرانا ہے۔ تو اس میں پیوند لگانے کی کوشش کیوں کر رہی ہیں؟''

''اس سے تمھیں کیا مطلب؟ تم جو کر سکتی تھیں، کر لیا اور جو چاہو، اب کرلو۔''

''میں رسہ کشی کی قائل نہیں ہوں۔''

Marfat.com

''تم مہارِشی ہو... نچلے ہتھ کنڈوں کی قائل نہیں تو کہیں منھ کالا کر جاؤ، کسی پہاڑ کی گپھا میں رہو جا کر۔ وہ غریب کب تک تمھیں گھسیٹے گھسیٹے پھرے گا۔''

''اتنی ہم دردی تو آپ نے کبھی اپنے مرحوم شوہر پر بھی خرچ نہیں کی تھی۔''

''خبردار! جوان کو اس بیچ میں گھسیٹا۔''

''آپ خود ہی گریبان میں منھ ڈال کر دیکھ لیں۔''

''زیادہ باتیں بنائیں تو منھ نوچ لوں گی۔ بہتر یہی ہے کہ اس گھر سے چلی جاؤ، اس سے پہلے کہ وہ ہاتھ پکڑ کر نکالے۔ لندن، پیرس کسی بھی دریا کے کنارے، پہاڑ کے دامن میں رہنے کے بڑے ارمان تھے تمھیں۔''

''ایسی باتیں تو ہر آدمی کرتا ہے۔''

''ہم نے تو کبھی نہیں کیں۔''

''تو آپ چاہتی کیا ہیں؟''

''کاغذات تیار ہیں طلاق کے... منظر دستخط کر چکا ہے۔ تم بھی کر دو... یہ ہیں کاغذات۔''

''آپ نے جہاں اتنا انتظام کیا ہے، یہ بھی کر دیں کہ کسی دریا کے کنارے، پہاڑ کے دامن میں ایک کٹیا دلوا دیں، کسی کو پتا نہ چلے کہ میں کہاں ہوں۔ میں چاہتی ہوں سب یہی سمجھتے رہیں کہ میں واقعی ان کے لیے مر چکی ہوں... آپ اور ثریا منظر کی آزادی کی اتنی قیمت تو دے ہی دیں گی۔''

''میرا خیال ہے، تمھارے پاس بھی خاصا پیسا ہے۔ تمھاری خواہش اتنی مشکل نہیں، انتظام کیا جا سکتا ہے۔''

''کب تک؟''

''دستخط کرنے کے بعد جب تم چاہو۔''

''دستخط میں کر دوں گی۔''

''ہاں، جلد سے جلد... ساتھ کیا لے جاؤ گی؟''

Marfat.com

''چند کپڑے، چند برتن اور کتابیں...''

''اور یہ کرسی.. تمھاری بہادری کا تمغائے امتیاز...''

''میری بہادری کا تمغائے امتیاز؟''

''ہاں اور کیا... ہر ایک یہی کہتا ہے، کتنی بہادر عورت ہے، موت کو شکست دے دی۔''

''اور زندگی سے شکست کھا لی۔'' ماہرہ نے دھیرے سے کہا۔

''شکر ہے کہ تم نے مان لیا۔ ہم تو سدا تمھاری فتح کے ہی ترانے سنتے آئے ہیں۔''

''فتح کے ترانے گونجتے ہیں، دل کے ٹوٹنے کی آواز نہیں ہوتی۔''

''اب آئیں نا اوقات پر... بہت اونچا اڑتی تھیں، جو جتنی اونچائی سے گرتا ہے، اتنی ہی زیادہ چوٹ لگتی ہے۔ اور ہاں... میں تمھیں بتا دوں، منظر چار دن کے لیے ملک سے باہر گیا ہے، اس عرصے میں تمھارا انتظام ہو جائے گا۔ تم اس کے پیچھے ہی چلی جانا۔ ٹھیک ہے یا کوئی ردّ و بدل؟''

''کوئی ردّ و بدل نہیں، سب ٹھیک ہے۔''

''تمھارے بہن بھائی پوچھیں تو ان سے کیا کہوں؟''

''جو جی چاہے...''

''یہی کہ جہاں منہ اٹھا ہوگا، چلی گئی ہوگی۔ اس سے پہلے کبھی کی بات سنی تھی جو اب سنتی!''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔''

''کیا سچ نہیں ہے؟''

''کیا سچ ہے کیا غلط... ابھی یہ جاننے کے لیے کئی صدیاں درکار ہیں...''

''تو پھر سوچ کیا رہی ہو، دستخط کیوں نہیں کر دیتیں؟''

''صرف ایک شرط ہے میری۔ دستخط منظر کے سامنے کروں گی۔''

Marfat.com

''اوہو، رسّی جل گئی، پر بل نہیں گیا۔ میں نے کہا تھا، منظر چار دن کے لیے باہر گیا ہے۔تم اس کے پیچھے ہی چلی جانا۔''

''اس کے لیے میں تیار ہوں۔''

☆

تیار ہو تو اب رو کیوں رہی ہو؟ ماہرہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔

آنسو... بغیر اس سے پوچھے... بغیر اس کے جانے... چھاجوں اس کی جھولی میں گر رہے تھے۔ وہ فقیرنی ہی رہی... زندگی کی بھیک لی... اب آنسوؤں کی بھیک بے مانگے مل رہی تھی۔ ذلت، الزامات اور گالیاں... اور گھر نکالا بھی بھیک کی طرح مل رہا تھا جیسے کوئی احسان ہو رہا ہو اس پر۔

''اللہ میاں نے سزا دے دی، اب بھی دماغ ٹھکانے نہیں آیا۔'' کیا ایسی باتیں سننے کے لیے اسے زندگی ملی تھی۔ ڈاکٹر نے تو کہا تھا، تم لوگوں کو مایوسی سے نکال سکتی ہو... تو اٹھو کائنات کے کھوئے تکمے ڈھونڈنے والی اٹھو، اپنے دل و ذہن کے تکمے کھولو... روح کا تکمہ کھولو اور باہر جاؤ... خود رحمی سے باہر نکلو... کیا کہا... طاقت نہیں ہے؟... طاقت نہیں ہے تو ہمت سے کام لو... ہمت کے آگے طاقت ہار جاتی ہے۔

ہمت... ہمت... ہمت...!!

☆

کتنا سہانا منظر ہے۔ چڑیاں چہچہا رہی ہیں، دریا بہہ رہا ہے، سیمل کے درختوں سے گرے ہوئے روئی کے گالے دریا پر رسان سے پل بھر کے لیے بیٹھتے ہیں، پھر تیرتے چلے جاتے ہیں، پھول کتنے رنگا رنگ ہیں، تتلیوں کے کیسے کیسے رنگ ہیں مگر سب رنگ اس بڑے آتشیں تھال کے آگے ماند پڑ رہے ہیں جو مغرب میں افق پر دھرا ہے۔ نیچے اتر جانے کے لیے۔ منٹوں میں پھسل جائے گا اور رات اتر آئے گی... رات کے سناٹے، رات کی آوازیں۔ کچھ آوازیں رات میں دھیمی ہو جاتی ہیں، کچھ تیز ہو جاتی ہیں۔ دن کو بھی تو یہی ہوتا ہے، رات کی صدائیں دب جاتی ہیں، دن کی ابھر آتی ہیں۔ اب سب کچھ تسلیم

Marfat.com

کرنے کے بعد کوئی دکھ نہیں ہے۔ کسی آری کے تکونے دھار دار دانت دل کو آہستہ آہستہ نہیں کاٹ رہے۔ سارے حواس سلامت ہیں، بس ایک تنہائی ہے۔ کوئی دکھ نہیں ہے۔ دکھوں کے نہ ہونے کا نام ہی خوشی ہے، راحت ہے، جنت ہے۔

ہاں جب آری کی تیز دھار دل کو کاٹ رہی ہو تو یہی لگتا ہے کہ دکھ اور تکلیف کا نہ ہونا ہی جنت ہے... مگر ہر چیز اضافی ہے۔ جب اور کوئی دکھ نہ ہو تو تنہائی کا دکھ ہوتا ہے۔ تنہائی بھی کرب انگیز ہوسکتی ہے۔ یہ بھی کتنا غنیمت ہے کہ میری کلاس کو مجھ سے پڑھنے کے لیے یہاں بھیج دیتے ہیں۔ دریا کے کنارے سبزے پر بیٹھ کر پڑھانے یا مل کر پڑھنے میں کتنا مزہ آتا ہے۔ سب اپنے اپنے ذہن کے مطابق جواب کھوجتے ہیں۔ کبھی کبھی میں ابتدا کرتی ہوں، کبھی باتوں باتوں میں خود ہی سبق کی ابتدا ہوجاتی ہے۔

''سنو بچو! ہر چیز اضافی ہے۔ ہمارے ذہن اور سوچ میں ہے۔ کیا کوئی چیز حقیقی نہیں ہے؟ کوئی چیز حقیقی نہیں ہے تو حق کیا ہے؟ حق نہیں ہے تو باطل بھی نہیں ہے یا سب کچھ ہے۔ حقیقت بھی، سچ بھی، باطل بھی، تقدیر بھی، تدبیر بھی، سکھ بھی، دکھ بھی اور اگر سب کچھ ہے تو کیا ہم زندگی کا کوئی پیمانہ بناسکتے ہیں جو اس بارے میں کچھ کہنا چاہے ہاتھ اٹھائے... ہاں بولو...''

''اگر میں کہوں، مجھے نہیں معلوم کہ یہ کرسکتے ہیں یا نہیں۔''

ماہرہ مسکرائی... ''دنیا کا سب سے محفوظ جواب... 'مجھے نہیں معلوم'۔ مگر کیا لاعلمی ذریعۂ نجات ہے؟ قانون کی لاعلمی قانون کی گرفت سے نہیں بچاتی۔ لاعلمی تن آسانوں کے لیے محفوظ ترین جواب ہے مگر تن آسانی کم ہمتی ہے۔ اگر سب ہاتھ پیر توڑ کر بیٹھ رہیں یا بیٹھ رہتے، کھوجنے اور جاننے کی کوشش نہ کرتے تو دنیا میں ذرا بھی ترقی نہ ہوئی ہوتی... کسی کو کچھ کہنا ہے تو ہاتھ اٹھائے۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں سمجھتا ہوں ترقی کے لیے رسک لینا ضروری ہے۔''

''کیسا رسک؟ جسمانی، ذہنی یا معاشی۔''

''کسی قسم کا رسک بھی ترقی کی گارنٹی نہیں ہے۔'' ایک لڑکی بولی۔

''لیکن پڑے پڑے سڑ جانے کے خلاف گارنٹی تو ہے۔ اور اگر سب مل کر کوشش کریں، مل کر رسک لیں۔ فضول کاموں سے اجتناب کر کے صرف تعمیر کے لیے کوشاں ہوں تو انسانی نسل کی ترقی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔''

''بہت خوب، ہاں تخریبی کاموں سے بچنا ضروری ہے لیکن تخریبی کاموں کی ذرا وضاحت کرو۔''

''جیسے جنگ... جنگ تعمیر میں فٹ نہیں آتی۔ جنگ کے لیے لوگ کہتے ہیں کہ ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہے گی لیکن ماضی میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو کہتے ہوں گے کہ غلامی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی... جنگ بنیادی طور پر جان لیتی ہے اور اس کا دوسرا نام قتل ہے۔''

''اور تم جو ہر شخص سے لڑتے پھرتے ہو۔'' کسی نے کہا، کئی قہقہے بلند ہوئے۔

''جواب دو...'' ماہرہ نے کہا۔

''میرے نزدیک خیالات کا اختلاف لڑائی نہیں ہے۔ اس لیے تخریبی نہیں ہے۔ اس سے نئی راہیں کھلتی ہیں۔ اس میں نامقبولیت کا رسک ضرور ہے مگر کیوں کہ خیالات کا اختلاف تعمیری ہو سکتا ہے، اس لیے یہ رسک لینا چاہیے۔''

''تو کیا یہ طے ہوا...'' ماہرہ نے کہا، ''کہ تعمیر اور تخریب آخری معیار ہونا چاہیے۔ ایک سطر کھینچیے، درمیان میں صفر، ایک طرف تخریب دوسری طرف تعمیر... تعمیر سے رغبت، تخریب سے نجات۔ جو لوگ یہ بات صحیح سمجھتے ہیں ہاتھ اٹھائیں۔ ماشاء اللہ... اب یہاں سے آگے چلتے ہیں۔ اختلافِ رائے اگر ذاتی منفعت پر مبنی ہو تو تخریبی ہے۔ انسانوں کے ذہن میں بچپن سے یہ بات بٹھانے کی ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے انفرادی فائدوں کے پیچھے نہیں ہیں۔ ہمیں زندگی کی بڑی تصویر میں تعمیری ٹکڑے لگانے ہیں۔ ان ٹکڑوں کی کھوج میں دوسری چیزوں سے صرفِ نظر کرنا ہے... ایک اور ضروری بات کہ اگر مقابلہ انسانی فطرت میں ہے تو ہمارا مقابلہ مغرب اور مشرق سے نہیں ہے، اشتراکیت اور سرمایہ پرستی سے نہیں ہے بلکہ آنے والی صدیوں سے ہے۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ ہر صدی نے

کتنے سوال حل کیے ہیں، کون سی صدی، افکار کی حد تک، ایجادات کی حد تک اور اعمال کی حد تک سب سے امیر رہی ہے اور منزل تک پہنچنے میں سب سے زیادہ قدم کس نے بڑھائے ہیں۔ ہمیں صرف ''ہم'' کہہ کر بات کرنی چاہیے، خود کو میں اور تم میں بانٹنا نہیں چاہیے، اس طرح کوئی کسی پر الزام نہیں دھر سکے گا۔ سب کی غلطیاں ساجھی اور کامیابیاں اکٹھی ہوں گی۔ اگر کسی اور سیارے کا باشندہ آ کر ہماری دنیا میں رہنے لگے تو وہ بھی 'ہم' میں شامل ہوگا... ہاں کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''ایسے بھی تو کام ہیں جو لوگوں کو عزیز ہیں مگر وہ منزل پر پہنچنے میں مدد نہیں کرتے۔''

''مثلاً؟''

''مثلاً... کھیل، تفریح، رسمیں، کلچرل اور مذہبی تقریبات جو انفرادی اور اجتماعی طور پر لوگوں کو پسند بھی ہیں، شاید دانش وروں کو ان کی پروا نہ ہو اور وہ ترقی میں نہ مثبت ہوں نہ منفی...''

''کوئی جواب دینا چاہے گا؟''

''میرے خیال میں ان کو بجا لانے میں ہر شخص آزاد ہونا چاہیے۔ جب تک دو کسی مثبت کام میں رکاوٹ نہیں بنتے یا منفی رجحانات کی تبلیغ نہیں کرتے۔ شرط وہی ہے کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ کسی صورت میں کسی کی صحت پر، انسان کے ماحولیات (environ) پر غلط اثر نہ ڈالیں۔ کسی انسان یا طبقے کی حق تلفی نہ کریں اور کسی کے اعتقاد کو ٹھیس نہ پہنچائیں۔''

''کوئی حق میں ہے یا مخالفت میں کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کہو...''

''مگر جو کلچرل اور مذہبی رہنما ان کی رہبری کرتے ہیں ان میں اختلاف ہوتا ہے۔''

''ٹھیک... دیکھنا یہ چاہیے کہ وہ اختلاف تعمیری ہے یا تخریبی... کیا آج تک کسی دانش ور یا مذہبی رہنما نے یہ کہا کہ چوری اچھی چیز ہے۔ ہر مذہب اور قانون میں چوری

Marfat.com

بری ہے، اس لیے کہ کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ چیز زبردستی لے جو اس کی نہیں ہے۔ جس طرح آپ لوگوں کی چیز نہیں لے سکتے، اسی طرح کسی کی جان نہیں لے سکتے۔ قتل بدترین جرم ہے، ستی بدترین قتل ہے۔ دوسروں کو اپنی مرضی کا تابع بنانا، ان سے زبردستی کام کروانا جیسے بے گاری یا غلامی بھی ایک طرح کی چوری ہے جسے استحصال کہتے ہیں۔ جنگ کیوں خراب اور منفی ہے کہ پہلے اس کی تیاری میں وقت اور توانیاں ضائع ہوتی ہیں، ہتھیار بنائے جاتے ہیں جن سے لوگوں کو مارا جاتا ہے۔ بہت سی تباہی، بربادی، قتل و غارت کے بعد امن کی باتوں میں، اسیروں کے تبادلے میں، نئی سرحدیں بنانے اور مٹانے میں اور جنگ سے پیدا شدہ قحط اور بیماریوں سے لڑنے میں وقت گزرتا ہے۔ لوگ جھوٹی ہم دردیاں اور مدد کی گٹھڑیاں لے کے نکلتے ہیں مگر ضروری یہ ہے کہ ان کاموں کو سرے سے روک دیا جائے، ان کی جڑیں پھوٹنے سے پہلے۔ لوگ صرف مثبت کام کریں اور مثبت تفریح۔ اس لیے کہ محض کام کرتے رہنے سے انسان تھک جاتا ہے۔ دوبارہ توانائی حاصل کرنے کے لیے آرام اور تفریح ضروری ہے...''

''لیکن مثبت کام کا احساس اور شعور عوام اور خواص میں پیدا کیسے کیا جائے گا؟''

''سوچیے اور جواب دیجیے...'' ماہرہ نے کہا، ''ہاں کہو...''

''جیسے وطن کی محبت کا احساس بچوں میں پیدا کرتے ہیں، جیسے ملک کے جھنڈے کا احترام سکھاتے ہیں۔ جیسے فصلوں اور موسموں سے آگاہی دیتے ہیں، جیسے روزمرہ کے کاموں میں بتایا جاتا ہے کہ کون سے کام اہم ہیں اور کون سے غیر اہم...''

''ٹھیک... اور کوئی... جی بولیے...''

''جیسے کہ والدین اور خاندان کی محبت کا درس دیتے ہیں۔ پھر رفتہ رفتہ دنیا اور کائنات کے حقائق بتاتے ہیں...''

''ٹھیک... اور کوئی...؟''

''جیسے بچوں کو صفائی پاکیزگی سکھاتے ہیں۔ دوستی، رشتے داری، احسان مندی، خاندان کی ریت رسمیں اور مذہب کے ارکان۔ اس کے علاوہ تاریخ جغرافیے کا علم، اچھے

شہری بننے کا درس، سائنس اور حکومت میں ووٹ دینے کی اہمیت تو دنیا میں رہنے، انسانیت کا حصہ بننے، اس کی ذمہ داریاں کیوں نہیں سکھا سکتے...؟''

''اور کچھ؟''

''جس طرح ہم انھیں بری باتوں سے بچنا سکھاتے ہیں، مثلاً تمباکو اور شراب نوشی کیوں بری ہے؟ منشیات سے دور رہنا کیوں ضروری ہے جس طرح آپ دوسروں کی چیزیں زبردستی نہیں لے سکتے، اس طرح آپ کسی کی جان بھی نہیں لے سکتے۔ قتل بدترین جرم ہے... دوسروں کو زبردستی اپنی مرضی کے تابع بنانا اور ان سے زبردستی کام کروانا جیسے غلامی اور بے روزگاری بھی جرم ہے۔ اسی طرح ریپ (rape) زبردستی بھی ہے اور استحصال بھی۔''

''تو یہ سب بتانا آپ کے نزدیک علم ہے؟''

''جی ہاں...''

''تو علم کی کسوٹی کیا ہوئی؟''

''وہی تعمیر اور تخریب... ترقی اور تنزل۔ جو چیز انسان کے ذہن کو، اس کی جسمانی ساخت کو، قوتِ فکر یا اس کی شخصیت کو گھٹائے وہ تنزل ہے۔ ایسی مصروفیات اور علم وفنون سے بچوں کو الگ کر دینا چاہیے... جو ان چیزوں کی کمیت، مقدار، قیمت یا قوت کو بڑھائے وہ ترقی ہے۔ وہ علم صحیح علم ہے اور انصاف یہی ہے کہ انسان کو صحیح علم سے قریب رکھا جائے۔''

''اگر انصاف کو منفی اور مثبت کے ترازو میں تولا جائے؟''

''انصاف منفی سے مثبت کی طرف سفر ہے کیوں کہ جرائم کے خلاف قانون کے لاگو ہونے کی کہانی منفی سے شروع ہوتی ہے۔ قانون توڑا گیا، اب انصاف چاہیے... انصاف کو بھی مثبت کی طرف جانا چاہیے۔ اگر قانون توڑنے والے کو اس قابل نہیں بنا سکتا کہ آئندہ وہ کبھی قانون توڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے تو کم از کم اس قابل نہیں رکھتا کہ وہ دوبارہ قانون توڑ سکے۔ زیادہ تر قانونی ادارے اس صفر کے نکتے پر رک جاتے ہیں

Marfat.com

جب کہ ان کو مثبت کی طرف جانا چاہیے۔ کوئی کچھ کہنا چاہتا ہے؟"

"بات یہ ہے کہ بچوں کو شروع سے صحیح رہنمائی نہیں ملتی تو بگڑے آدمی کا یک لخت بدل جانا مشکل ہے... اگر صحیح رہنمائی ملے تو انصاف کا صفر سے مثبت کی طرف جانا مشکل نہ ہو۔ ایک اور بات بھی ہے کہ لوگوں کو انصاف کے اداروں پر بھروسا ہونا چاہیے... ورنہ لوگ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور انسانیت پر ظلم توڑتے ہیں..."

"کوئی مثال؟"

"مثلاً... گاڈ فادر... بہت سے لوگ ایسے انسانوں کی پناہ میں چلے جاتے ہیں مگر اس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوتا کیوں کہ انتقام انصاف کی بدترین شکل ہے جسے خود ان لوگوں نے انصاف کا نام دیا ہے۔ انتقام سراسر منفی ہے... گاڈ فادر جیسے آدمی کو کیا صحیح طاقت حاصل ہے، نہیں صرف طاقت اور قوت کا اِلوژن ہے۔ وہ سب سے چھپ کر اپنی ایک الگ دنیا میں رہتا ہے۔ دوسروں کو مرواتا ہے۔ دوسروں کو اپنے غلط کاموں کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں ہے۔ ہر شخص کو وہ کرنا پڑتا ہے جو دوسرا کہتا ہے۔ گاڈ فادر تک کو اپنی شخصیت بدلنی پڑتی ہے اور اس سب کے بدلے اسے کیا ملتا ہے؟ چند لوگوں کی اطاعت جن کی طرف سے بھی ہر وقت دھوکے کا خوف لگا رہتا ہے۔ آخر میں اچانک اور بھیانک موت... انصاف یا قانون ہاتھ میں لینے والوں کی زندگی کیا کسی طرح بھی قابلِ رشک ہے۔ کیا اس دنیا میں اس نسلِ انسانی کے لیے جو تاریخ میں اپنا نام درخشاں رکھنا چاہتی ہو کسی صورت بھی یہ بات قابلِ فخر یا قابلِ رشک نہیں ہے۔ اب ایک اور بات سامنے آتی ہے۔ وہ نسلی گروہ جو اپنے سے مختلف لوگوں کے قلع قمع کی فکر میں رہتے ہیں۔"

"کوئی ان کے کاموں کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے؟"

"وہ یقیناً منفی کام کر رہے ہیں۔ اختلاف کو منفی طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ نفرت پھیلا رہے ہیں جو بذاتِ خود منفی جذبہ ہے۔ وقت کا زیاں، قتل و غارت، یہ ساری منفی باتیں ہیں۔"

Marfat.com

''بالکل ٹھیک... تو گویا ان کو کسی بھی خوب صورت سلوگن کے پیچھے برداشت نہیں کیا جاسکتا، نہ نسل کی برتری، نہ مذہب کی برتری، کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''مذہب کا رول آج کی دنیا میں کیا ہے؟''

''سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ مذہب کا کام ہمیشہ سے کیا تھا؟ ہاں بتاؤ۔''

''جواب ڈھونڈنے کا، انسانی علم سے بالاتر سوالوں کے جواب۔''

''اور زندگی کی کرب ناکیوں کو قابلِ برداشت بنانا کہ یہ سب ایک اَن دیکھی ہستی کی طرف سے ہیں۔''

''لوگوں کو سیدھی راہ پر چلانا... مذہب کے لیے اچھی یا بری باتوں کی توضیح اتنی ضروری نہیں ہے، صرف یہ کرو یہ نہ کرو کہہ دینا بھی کافی ہے۔''

''اور دعا مانگنا... جو بات اپنے بس میں نہ ہو، اس کی درخواست کسی ایسی قادر ہستی سے کرنا جس کے بس میں سب کچھ ہو...''

''کیا ان میں سے کوئی بات ایسی ہے جو سارے مذہبوں کو آپس میں لڑوائے؟''

''نہیں بلکہ یہ باتیں سارے مذاہب میں مشترک ہیں۔''

''تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ سارے مذہبوں کا مقصد ایک ہے، منزل ایک ہے، صرف راستے مختلف ہیں۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ایک آدمی مشرق کی طرف روانہ ہوا، دوسرا مغرب کی طرف اور دنوں ایک ہی جگہ پہنچے۔''

''میرا خیال ہے مذہب کا رول بھی یہی ہونا چاہیے کہ انسان مل جل کر رہیں اور انسانیت کے لیے کام کریں۔''

''نیک خیال ہے مگر کیا یہ ہو رہا ہے؟''

''نہیں۔''

''تو مذاہب کس طرف جا رہے ہیں؟''

''منفی...''

''ٹھیک، اور کوئی بات؟'

Marfat.com

''مذہب کے جو کام ہم نے ڈھونڈے، ان میں سے پہلے دو کام تو سائنس کر رہی ہے۔ سوالوں کے جواب ڈھونڈنا اور زندگی کی مشکلات کو آسان بنانا۔''

''مگر سائنس کو جواب ڈھونڈنے کے بعد اس کو ثابت کرنا ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں وہ ثابت نہیں کرسکتی اور انسانوں کو ثبوت کے علاوہ تشفی بھی چاہیے۔ ہر مذہب کے لوگ روحانی پیشواؤں کی تلاش میں رہتے ہیں جیسے سادھو، جوگی، فقیر یا صوفی۔''

''اصل میں یہ کون لوگ ہوتے ہیں؟''

''ان کی ایک بہت اچھی تعریف یہ ہے کہ یہ اس حد پر پہنچے ہوئے لوگ ہیں کہ جہاں نہ کوئی چیز ان کی ملکیت ہوتی ہے، نہ وہ خود کسی کی ملکیت ہوتے ہیں۔ سوچو، اگر ہم میں سے ہر انسان آزادی کی اس منزل پر پہنچ جائے تو...''

''تو پھر ہم سب ان کی طرح قناعت پسند ہوجائیں اور کوئی ترقی نہ ہو۔''

''ضروری نہیں... جوگی... صوفی کام بھی کرتے ہیں، سوچتے بھی ہیں، انسانوں کی بے لوث خدمت کرتے ہیں۔ ان کا سب سے بڑا وصف بے لوثی ہے۔ ان کے لیے سارے انسان واقعی برابر ہیں۔ وہ مذہب و ملت، عمر اور جنس سے بے نیاز ہوکر سب کی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں۔ نہ وہ خود کسی انسان کے تابع ہوتے ہیں، نہ کسی انسان کو اپنا تابع بناتے ہیں۔''

''تو اچھا انسان صوفی ہوا؟''

''شاید ہر اچھا انسان صوفی نہ ہو لیکن ہر صوفی اچھا انسان ضرور ہوتا ہے۔ وہ انسان جو بے غرض، بے لوث محبت دے جیسے قدرت نے اپنی نعمتیں دی ہیں... زمین، ہوا اور پانی اور... یہ اتنے خوب صورت مناظر... ارے یہ سامنے سے کون چلا آ رہا ہے... منظر؟...''

☆

''میں بہت دن سے تمھارا انتظار کررہی تھی کہ تم میرے دستخطوں کے لیے آؤ گے، تم نے میری امید سے زیادہ دن لگائے...''

Marfat.com

''میں دستخط کروانے نہیں آیا ہوں۔ بٹھاؤ تو بات کروں۔''

''تم گھر میں جا کر بیٹھو، میں ابھی آتی ہوں۔''

ماہرہ نے کلاس کے لڑکوں لڑکیوں سے کہا، ''آدھ گھنٹے کے لیے چھٹی۔''

سارے لڑکے لڑکیاں خوشی سے اچھلتے کودتے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔

ماہرہ منظر کے ساتھ ہلکی سی چڑھائی پر چڑھتی گھر کی طرف آئی اور بیدِ مجنوں کے سائے میں رکھی ہوئی لنچ کی میز پر بیٹھ گئی۔

''آؤ بیٹھو...'' ماہرہ نے کہا۔

منظر میز کے سامنے رکھی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا...

''ہاں تو قصہ یہ ہے کہ درِ شہوار آپا نے... میں اب انھیں دُرِ شہوار آپا کہنے لگا ہوں... پہلے بھی کہتا تھا جب... ثریا سے میرا رومان چل رہا تھا۔ بعد میں جب یہ رشتہ نہ رہا تو میں انھیں دُرِ شہوار کہنے لگا کیوں کہ وہ مجھ سے عمر میں زیادہ بڑی نہیں ہیں۔''

''اچھا، تو وہ دوبارہ دُرِ شہوار آپا ہوگئیں، کیوں کہ اب پھر وہی رشتہ قائم ہو رہا ہے۔''

''نہیں یہ بات نہیں ہے... تم نے بچوں کو پڑھا پڑھا کر اپنے تخیل کو بہت بے لگام کردیا ہے۔ اب میں اس لیے دوبارہ انھیں دُرِ شہوار آپا کہنے لگا ہوں کہ میں نے ان کے بڑے پن کو تسلیم کرلیا ہے... سنو میں پوری بات سناتا ہوں... درِ شہوار آپا نے میرا دل تمھاری طرف سے پھیر دیا اور اس میں ایک طرح سے ثریا کی مورتی دوبارہ بٹھا دی۔ یہی کام انھوں نے ثریا کے ساتھ بھی کیا۔ وہ یہ کارنامے کس طرح انجام دیتی ہیں، یہ بہت لمبی کہانی ہے، بہرحال ابھی مختصر سناتا ہوں... ثریا لندن گئی کہ وہاں کے اپنے سارے کام، جائیداد وغیرہ کا جھگڑا نمٹا آئے۔ دُرِ شہوار نے مجھے تنہا تمھارے پاس نہ آنے دیا، نہ تمھارا پتا بتایا۔ ان کا خیال تھا کہ جب ثریا آئے گی تو ہم تینوں آئیں گے اور تم سے دستخط کروا کے لے جائیں گے۔ اس سے پہلے یقیناً سارے انتظامات مکمل ہوجائیں گے... لیکن وہاں جا کر ثریا پلٹ گئی۔ اس نے خط میں لکھا کہ دُرِ شہوار آپا بات کو کیا سے کیا کردیتی ہیں۔ میں اس

Marfat.com

سارے معاملے کو دوسری نظر سے دیکھتی ہوں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمھارے دل میں ماہرہ بسی ہوئی ہے اور اسے نکالنا بے حد مشکل ہے، اس لیے میں اس شادی کے حق میں نہیں ہوں اور مستقل طور پر وہاں آنا نہیں چاہتی۔ البتہ چند دن کے لیے اپنی چیزیں وغیرہ لینے آؤں گی... معلوم یہ ہوا کہ وہ بھی اب کسی اور کے چکر میں ہیں۔

پہلے تو دُرِ شہوار آپا بہت روئیں دھوئیں... ثریا کو ناعاقبت اندیش اور احسان فراموش وغیرہ کہا۔ پھر یکایک انھیں خیال آیا کہ جب میں ان کی ہر بات مانتا ہوں تو کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ان جیسی پاک باز، نیک اور خدا ترس خاتون سے ہی شادی کرلوں۔ بہت دن باتوں کے بیچ وہ مجھے کچھ بتانے کی کوشش کرتی رہیں۔ میں کچھ سمجھا، کچھ نہ سمجھا... پھر ایک دن جب ثریا واپس آئی تو دونوں میں معرکے کی لڑائی ہوئی... ان دونوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس دن میں دفتر نہیں گیا تھا... اس دن مجھ پر بڑے بڑے انکشافات ہوئے۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ میں جو تمھیں "تریا چرتر" کے طعنے دیتا تھا، چالاک اور بات بنانے والی کہتا تھا تو ان سب الفاظ کے کیا معنی ہیں۔ چالاکی اور مطلب پرستی کیا ہوتی ہے اور انسان اپنا مطلب حاصل کرنے کے لیے کہاں تک گر سکتا ہے۔ اس دن مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ تم جیسی عورت جو خیالوں کی دنیا میں رہتی ہے، دنیا کو بہتر بنانے کے چکر میں رہتی ہے، اسے ان چکروں کی ہوا بھی نہیں لگی جس میں یہ زمانہ ساز عورتیں لگی رہتی ہیں۔

اس دن میں نے ان سے بصد ادب معافی مانگ لی اور وہ دونوں میرے گھر سے رخصت ہوگئیں۔ باتوں میں وہ تمھارے بارے میں ایسے اشارے دے گئیں جن سے تمھارا پتا ملنا آسان ہوگیا مگر میں ایک دم تمھارے پاس نہیں آیا۔ میں سوچتا رہا کہ میلے دل کے ساتھ تمھارا ملنا بے کار ہوگا... میں نے تمھاری ہر ہر بات کا تجزیہ کیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ غلطی میری تھی... میں نفسیاتی کاؤنسلر کے پاس بھی گیا... وہاں جا کر سارے جالے صاف ہوگئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ رفتہ رفتہ ہم دونوں "ہم" نہیں رہے تھے بلکہ "میں" اور "تم" ہوگئے تھے۔ میں تمھاری شخصیت سے، تمھاری شہرت سے اور تمھاری ہر دل عزیزی سے جلنے لگا تھا۔ میں نے جب یہ بات جان لی تو تمھیں اور اپنے آپ کو معاف کردیا اور یہ

Marfat.com

سوچ لیا کہ اب ہم ان باتوں کو کبھی نہیں دہرائیں گے جو ہمارے درمیان ہوئیں یا کہی گئیں... اور یہ بھی بتادوں کہ ثریا کی بات صحیح ہے، میرے دل میں صرف ماہرہ ہے اور ماہرہ کے علاوہ کوئی نہیں۔"

"اس کا مطلب کہ تمھیں اب بھی مجھ سے محبت ہے؟"

"یقیناً۔"

"تو کیا تم نے یہ بھی جانا کہ محبت اور کنٹرول دو مختلف چیزیں ہیں۔ اگر تم کسی کی ذات کو، صفات کو اور اعمال کو اپنی مرضی کے تابع رکھنا چاہتے ہو تو اس شخص سے دور ہی رہو... یا وہ شخص دور ہی رہے تو بہتر ہے... میرے نزدیک محبت کسی کو اپنی مرضی کا تابع کرنے کا نام نہیں، کسی کا ہو جانے کا نام ہے۔ کسی کا ہوجانا، بلاشرط، بے کم و کاست اور شاید ہم دونوں ہی اب یہ نہیں کر سکتے۔"

"کوشش تو کر سکتے ہیں۔"

"دیکھو منظر! ہر شخص زندگی میں بھی ایک نہ ایک پل صراط سے گزرتا ہے۔ شاید دُرِشہوار اور ثریا بھی گزریں یا گزر رہی ہوں۔ شاید تم بھی گزرو یا گزر چکے ہو... میں بھی ایک پل صراط پر سے گزر رہی ہوں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ گزر جاؤں گی یا گر کر ختم ہو جاؤں گی، مجھے نہیں معلوم مگر مجھے اتنا معلوم ہے کہ اس پر سے ہر شخص کو تنہا گزرنا ہے۔ تم نے اپنے ذہن کے جالے چھڑا لیے مگر ہوسکتا ہے میرے ذہن میں جالے موجود ہوں۔ کتنے ہی دن تک میں اس ڈاکٹر کو کوستی رہی جس نے مجھے اپاہج بنا کر چھوڑ دیا۔ اگر میں مرجاتی تو نہ اپاہج ہوتی، نہ اپنوں سے دور ہوتی، نہ بدنامی ہوتی، نہ تنہائی کا عذاب سہتی... مگر اب اتنے دنوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ شاید میں نے اپنے حصے کا ٹکڑا ابھی نہیں لگایا تھا... بچوں کی اسپیشل کلاس جو مجھ سے پڑھنے آتی ہے اور ان کے چھوٹے موٹے... مسئلے جب وہ دنیا کے وسیع پیٹرن میں حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کھوج سے ان کی آنکھوں میں جو روشنی آتی ہے، وہ میرے سارے دکھ، درد، تنہائی اور کرب کا جواب ہے۔ زندگی کے ہر موڑ پر انسان کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔ سیکھنا بھی زندگی میں

Marfat.com

ایک بڑا فرض ہے۔ اگر آپ زندگی ختم کردیں تو کئی طرح کا نقصان کرتے ہیں۔ اپنے سیکھنے کا عمل، دوسروں کو سکھانے کا عمل اور وہ بات بھی ہے کہ جب زندگی کسی کی دین ہے تو آپ اسے ضائع نہیں کرسکتے، ہاں احتیاط سے اسے استعمال کرسکتے ہیں۔''

''تم پہلے بھی کام کرتی تھیں، اب بھی وہ کرسکتی ہو۔''

''مگر جو کام اب کررہی ہوں، میرے خیال میں وہ زیادہ اہم ہے...اور پھر اس چھوٹے سے گھر میں میرے اوپر بہت کم ذمہ داریاں ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے تم ذمہ داریوں سے نہیں گھبراتیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ جو کچھ تم نے کیا، میں نے کبھی اس کی داد نہیں دی اور تم نے کبھی فریاد نہیں کی۔ تم اپنی انا کو لیے بیٹھی رہیں، میں اپنی...''

''اور آئندہ کیا ہوگا؟''

''ہم اپنی اپنی انا کی بات محبت کے ہاتھ میں دے دیں گے اور سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

''بعض اوقات کہنے اور کرنے میں ازل اور ابد کا فاصلہ ہوجاتا ہے۔''

''اچھا تو میں ہار مانے لیتا ہوں، تمھاری جیت سہی۔''

''کیسے؟''

''میں چھٹی لے کر تین ماہ کے لیے یہاں آجاتا ہوں۔ دریا کے کنارے صبح شام ٹہلا کریں گے۔ تمھاری قربت رہے گی، تم اپنا کام کرتی رہنا۔''

''یہ بات تو بہت اچھی ہے مگر پہلی بات ٹھیک نہیں۔''

''کون سی؟''

''ہار جیت والی۔''

''کیوں؟''

''محبت میں ہار جیت کے الفاظ بہت استعمال ہوتے ہیں، شاعری اور گیتوں نے اسے بھی اچھالا ہے مگر سیدھی سی بات ہے کہ جیت کا مطلب کنٹرول کرنا نہیں ہے۔

Marfat.com

اتنی سی بات اگر سمجھ لی جائے تو زندگی آسان ہو جائے...''

''ٹھیک، میں سمجھ گیا۔ اب کوئی ایک مطالبہ جو تم کرنا چاہو...''

''جو تم نے ابھی کہی تھی... بڑی خوب صورت سی بات... کہ 'میں' اور 'تم' نہ رہیں 'ہم' بن جائیں۔''

''وعدہ رہا... ماہرہ...''

''آج مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے کائنات کا راز پا لیا ہو۔ شاید یہی ہوتا ہو کہ ہر شخص کا اپنا مسئلہ اس کے لیے کائنات کا مسئلہ بن جاتا ہو اور جب وہ حل ہو جائے تو اسے محسوس ہو جیسے اس نے ساری کائنات کا راز پالیا۔''

''شاید یہی وہ ٹکڑا ہو جس کی کھوج میں تم نکلی تھیں۔''

''شاید... یا شاید نہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

''یہی تو ابھی دیکھنا ہے، سیکھنا ہے... اگر آخری بات پتا چل جائے، حتمی فیصلہ ہو جائے تو اس کے آگے زندگی بے کار ہے۔ قدرت شاید چاہتی ہی نہیں کہ الجھن ختم ہو...''

''تمھارا مطلب ہے قادرِ مطلق جس نے کائنات کو تخلیق کیا...''

''یہی سمجھ لو... اس نے انسان کو اس کھوج پر لگا دیا... جب تک انسان ہیں یہ کھوج اور یہ الجھن باقی رہے گی۔''

''تمھارا مطلب ہے، وہ تصویر کبھی پوری نہیں ہوگی؟''

''اگر ہوگئی تو وہ بساط اٹھا کر رکھ دے گا۔ پھر کبھی کھیلنے کے لیے۔''

''تو کائنات کی یہ ساری گتھیاں ایک کھیل ہیں بس...''

''شاید... یا شاید نہیں...''

Marfat.com

WIRSA and other Stories By: Razia Fasih Ahmad

Razia Fasih Ahmad is a renowned fiction writer. She has been acknowledged among the high- esteemed story tellers in Urdu. She has produced seven novels, seven collections of short stories and two travelogues. She is a humour writer also, and writing a humorist column in a English paper, now a days.

ACADEMY BAZYAFT

رضیہ فصیح احمد

ورثہ اور دوسری کہانیاں

Marfat.com